فروری

۱۹۶۳ء

اورینٹل کالج میگزین

فروری ۱۹۶۳ء

جلد ۴۰ عدد ۲ عدد مسلسل ۱۵۲

ایڈیٹر :

ڈاکٹر سید عبداللہ

★

باہتمام مسٹر احسان الحق ، ہیڈ کلرک ، یونیورسٹی اورینٹل کالج ، لاہور
پرنٹر و پبلشر اورینٹل کالج ، میگزین ، جدید اردو ٹائپ پریس ، لاہور
میں طبع ہو کر اورینٹل کالج ، لاہور سے شائع ہوا ۔

سالانہ چندہ : چار روپے

ترتیب مضامین

آہ مولوی محمد شفیع

ع حس کی پیری میں تھا مانند سحر رنگ شباب

---

۳۸ سال گذرے کہ مولوی محمد شفیع صاحب نے اس جریدے کا اجراء کرکے علوم مشرقیہ کی شمع روشن کی تھی۔ آج کمال افسوس کے ساتھ قارئین کو ان کی وفات حسرت آیات کی اطلاع دی جاتی ہے۔ آپ نے ۱۳ اور ۱۴ مارچ ۱۹۶۳ء کی درمیانی شب میں رحلت کی۔ اناللہ و انا الیہ راجعون۔

موصوف کی موت سے پاکستان نہ صرف ایک فاضل اجل کے فیض سے محروم ہو گیا بلکہ اس حادثے سے علم و فضل کی وہ روایت بھی ختم ہوتی نظر آتی ہے جو محنت و کاوش کا زرّیں نمونہ بن کر علم و فن کے ہزاروں طالبوں کو سعی پیہم کا درس دیتی تھی۔

ڈاکٹر محمد شفیع صاحب کی ذات مشرق کے علاوہ مغرب میں بھی تبحرّ علمی کے لیے معروف تھی اور وہاں کے علماء اکثر مختلف فیہ مسائل میں موصوف سے رجوع کرتے تھے۔ اس اعتبار سے اُن کی ذات پاکستان کے لئے ہر لحاظ سے باعث افتخار تھی۔ اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمارے لئے تو وہ سب کچھ تھے۔

ادارہ مرحوم کے پسماندگان کے ساتھ شریک غم ہو کر اُن کی مغفرت کے لیے دست بدعا ہے۔

ادارہ

شاہ حاتم اور ان کا کلام

★

مرتبہ

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

[اشاعت : اورینٹل کالج میگزین]

شاہ حاتم اور ان کا کلام

حالاتِ زندگی

شیخ ظہور الدین نام ، حاتم تخلّص ، عرف شاہ حاتم ۔ والد کا نام شیخ فتح الدین تھا ۔ شاہ جہاں آباد (دھلی) میں پیدا ھوئے ۔ سال ولادت ۱۱۱۱ ھجری ھے جو اُن کے نام کے جزو "ظہور" سے نکلتا ھے ۔ مصحفی "عقد ثریا" میں لکھتے ھیں : "بقولش تاریخ تولدش حرف ظہور باشد" ۔ تذکرۂ ھندی میں مصحفی لکھتے ھیں : "تاریخ تولدش بقولے از حرف ظہور بر می آید" ۔ بعض تذکرہ نگاروں نے شیخ محمد حاتم نام لکھا ھے ۔ مثلاً میر تقی میر "شیخ محمد حاتم ، حاتم تخلّص" (نکات الشعرا ، ص ۹۷) ، خواجہ خان حمید اورنگ آبادی "حاتم ، محمد حاتم" (گلشن گفتار ، ص ۲۰) ، سیّد فتح علی گردیزی "اسرار معنی را ملہم محمد حاتم ، حاتم" (تذکرہ ریختہ گویاں ، ص ۴۹) ، قائم چاند پوری "محمد حاتم ، حاتم تخلّص" (مخزن نکات ، ص ۲۴) لچھمی نرائن شفیق "شیخ محمد حاتم ، حاتم تخلص" (چمنستان شعرا ، ص ۱۳۴) ، میرحسن "شیخ محمد حاتم ، المتخلص بہ حاتم (تذکرہ شعرائے اردو ، ص ۴۶) ، شیرنگر "حاتم ، محمد حاتم" (یادگار شعرا ، ترجمہ طفیل احمد ص ۶۸) لیکن شپرنگر نے لالہ مکند سنگھ فارغ کے ضمن میں لکھا ھے "شیخ ظہور الدین کے شاگرد ھیں" (یادگار شعرا ، ص ۱۵۱) - شپرنگر نے مصحفی کے حوالے سے یہ بھی لکھا ھے "مصحفی جو اُن کو جانتے تھے ان کو ظہور الدین عرف شاہ حاتم کہتے ھیں اور اُن کا بیان ھے کہ یہ دھلی میں ۱۱۱۱ھ میں

پیدا ہوئے تھے اور ان کا پیشہ سپہ‌گری تھا۔ مصحفی کا یہ بھی بیان ہے کہ اس زمانے میں ایک اور حاتم تھے اور اکثر دونوں میں دھوکا ہوگیا۔ اگر ظہورالدین کا نام محمد بھی رہا ہو، تب بھی یہ غیر ممکن نہیں کہ قائم وغیرہ نے دونوں میں دھوکا نہ کھایا ہو۔ محمد حاتم اور ظہورالدین حاتم میں فرق ہے۔ آخرالذکر زیادہ مشہور اور دیوان زادہ کے مصنّف تھے۔ مسٹر ہالؔ نے، جن کی رائے بہت زیادہ وقعت رکھتی ہے، دونوں میں فرق ظاہر کیا ہے" (یادگار شعرا، ص ۶۸)۔ مصحفی نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے۔ "از ہندی گویان قدیم این دیار یادگار است و نام نامیش از بس شہرت بشمار مذکور زبان صغار و کبار۔ طرز اوائلش در شعر بطور مضمون و ناجی و آبرو وغیرہ شعرائے ایہام بند است و طرز آخرش با انداز تازہ گویان حال۔ بعضے اشخاص نزدیک و دور شاہ مذکور را بسبب طوالت عمرش خود از رفتگان شمردہ حاتم ثانی قرار میدہند۔ لہذا دریں آخر عمر دیوانے کہ در زبان ریختہ گویان حال ترتیب دادہ بنامش دیوان زادہ گذاشتہ تا رفع اشتباہ آنہا گردد" (عقد ثریا، ص ۲۳) اس کے بعد مصحفی نے "تذکرۂ ہندی" میں بھی اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے لکھا:
"الحال کہ در دورۂ ما زبان ریختہ بسیار بہ پاکیزگی و عمدگی رسیدہ مشارٌالیہ ہم مرتبۂ سخن تازہ گویان فہمیدہ دیوان قدیم خود را از طاق دل افگندہ، دیوان جدید بزبان ریختہ‌گویان حال ترتیب دادہ و دیوان زادہ نامش گذاشتہ اما بہ سبب طوالت عمر بعض مردم دور دست را کہ اشتباہ حاتم دویم می افتادہ برطرف کرد"۔ (تذکرۂ ہندی، ص ۸۰)۔ مصحفی کے ان دونوں بیانات کی روشنی میں شپرنگر کی غلط فہمی پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے۔

مصحفی ، حکیم قدرت اللہ قاسم ، مصطفیٰ خاں شیفتہ ، گارسن دتاسی ، کریم الدین ، عبدالغفور نساخ نے اصل نام ظہور الدین ہی لکھا ہے ۔ مصحفی نے عقد ثریا میں " حاتم ، شیخ ظہورالدین عرف شاہ حاتم ولد شیخ فتح الدین" لکھا ہے ۔ تذکرۂ ہندی کی عبارت یہ ہے : " حاتم ، شیخ ظہور الدین حاتم کہ شاہ حاتم گفتہ می شد" ۔ قاسم لکھتے ہیں : "حاتم ، بزرگے است بہ شیخ ظہورالدین موسوم و بزرگیش بہر کس معلوم ، بہ شاعری مشہور عالم المعروف بہ شاہ حاتم " (مجموعہ نغز ، ص ۱۸۰) ۔ شیفتہ لکھتے ہیں " حاتم ، تخلص شیخ ظہور الدین نام المعروف بشاہ حاتم " (گلشن بے خار ص ۵۴)۔ کریم الدین نے قاسم کی عبارت کا ترجمہ کر دیا ہے ۔ نسّاخ نے " حاتم ، تخلص ، ظہور الدین مرحوم دہلوی عرف شاہ حاتم " لکھا ہے (سخن شعرا ، ص ۱۲۰) ۔ ان بیانات کی مزید تائید " دیوان زادہ " مخطوطہ ۱۱۹۸ ھ (مملوکہ پنجاب یونیورسٹی) سے ہوتی ہے جو شاہ حاتم کے شاگرد مکند سنگھ فارغ کا لکھا ہوا ہے ۔ مصحفی نے خود حاتم کے اقوال کو بنیاد بنایا ہے ۔ باقی تذکرہ نگاروں نے بالعموم عرف عام " شاہ حاتم " ہی کو نام بنا دیا ہے اور حاتم کے ساتھ محمد کا بھی اضافہ کر دیا ہے ۔

شاہ حاتم کے والد غالباً سپاہی پیشہ تھے ۔ سپہ گری اس زمانے میں سب سے معزز پیشہ اور ترقی و کامرانی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا ۔ دستور زمانہ کے مطابق شاہ حاتم نے بھی فن سپہ گری کی تکمیل کے بعد یہی پیشہ اختیار کیا ۔ مصحفی عقد ثُریّا میں لکھتے ہیں : " در ایّام جوانی سپاہی پیشہ بود و ہم شعر ریختہ را در روئے کار آوردہ" (ص ۲۳)۔ تذکرۂ ہندی میں لکھتے ہیں : " ہمیشہ عمدہ معاش و اوقات بخوبی گزرانیدہ ۔ مرد سپاہی پیشہ از ہندوستان زایان قدیم بود " (ص ۸۰) شعر و شاعری

کا چرچا ان دنوں عام تھا۔ شاعری اور سپہ گری میں ابھی ایسا بُعد پیدا نہیں ہوا تھا کہ مرزا غالب کی طرح کسی شاعر کو معذرت کی ضرورت پیش آئے۔ اس ماحول میں شاہ حاتم کو بھی شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہوا اور انھوں نے اس فن کو اپنے کمال کا ذریعہ بنا لیا ؎

اے قدرا[1] داں کمال حاتم دیکھ
عاشق و شاعر و سپاہی ہے

شاہ حاتم نے پہلے رمزی تخلُّص اختیار کیا۔ " دراں وقت چندے رمزی تخلُّص می کرد " (عمدۂ منتخبہ)۔ پھر حاتم تخلُّص اختیار کر لیا اور اسی سے شہرت پائی۔ شاہ حاتم کی شاعری کی ابتدا کب ہوئی؟ اس بارے میں کچھ اختلاف سا پایا جاتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں مصحفی کے حوالے سے سن ۳ محمد شاہی میں ولی کا دیوان دہلی پہنچنے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے: " شاہ حاتم کی طبیعت موزوں نے بھی جوش مارا، شعر کہنا شروع کیا " (آب حیات، ص ۱۱۴) مصحفی نے دیوان ولی کے دہلی پہنچنے کی روایت شاہ حاتم کی زبانی نقل کی ہے۔ " روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سن دویم فردوس آرامگاہ دیوان ولی در شاہجہان آباد آمدہ و اشعارش بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ" (تذکرۂ ہندی، ص ۸۰)۔ مصحفی نے اپنے تذکرے میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ حاتم نے ولی کے دیوان سے متاثر ہو کر شاعری شروع کی۔ صرف ولی کے دیوان کی شہرت و مقبولیت بیان کی ہے۔ آب حیات میں سن کا اختلاف بھی کھٹکتا ہے۔

شاہ حاتم کے آغاز سخن کے بارے میں خود اُن کے اپنے بیانات زیادہ قابل لحاظ ہیں۔ انھوں نے چند اشعار میں اپنے زمانۂ شاعری کا

(۱) یہاں قَدر کی بجائے قَدَرْ بندھا ہے۔

تعیّن یوں کیا ہے :

۱۱۶۱ھ کی ایک غزل کا مقطع ہے ؎

حاتم کا شور تس برس سے ہے ھند میں

صاحب قراں ہے ریختہ گوئی کے فن کے بیچ

اس شعر میں شاعری کی ابتداء کی بجائے شہرت و مقبولیت کا ذکر ہے۔ گویا اُن کی شاعری کا آغاز ۱۱۳۱ھ سے پہلے ہو چکا تھا۔

۱۱۶۴ھ کی ایک غزل کا مقطع یہ ہے ؎

چالیس برس ہوئے کہ حاتم

مشّاق قدیم و کہنہ گو ہے

ڈاکٹر محی الدین زور نے " سرگذشت حاتم " میں یہ شعر لندن کے مخطوطہ (۱۱۶۹ھ) سے یوں نقل کیا ہے[1]۔

اڑتیس برس ہوئے کہ حاتم

مشّاق قدیم و کہنہ گو ہے

پہلے شعر کے مطابق حاتم کی شاعری کا آغاز ۱۱۲۴ھ سے ہو جاتا ہے اور دوسرے شعر کے مطابق ۱۱۲۶ھ سے۔ گویا پہلی صورت میں انہوں نے چودہ سال کی عمر میں اور دوسری صورت میں سولہ سال کی عمر میں شاعری شروع کی۔

۱۱۸۹ھ کی ایک غزل کا مقطع ہے ؎

دو قرن گزرے آسے فکر سخن میں روز و شب

ریختے کے فن میں حاتم آج ذوالقرنین ہے

اگر ایک قرن تس برس مراد لیا جائے تو اس شعر کے لحاظ سے حاتم کی شاعری کا آغاز ۱۱۲۹ھ میں ہوا۔ اس طرح اشعار سے حاتم

۱۔ سرگزشت حاتم ' مؤلفہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ' ص ۲۲ — راقم کے پیش نظر دیوان زادہ (مخطوطہ ۱۱۹۵ھ) ہے۔

کی شاعری کے آغاز اور مدّت کا متعیّن کرنا ذرا دشوار سا ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں حاتم نے دیوان زادہ کے دیباچے میں اپنی شاعری کی ابتداء کا جو سن بتایا ہے وہ زیادہ قابل لحاظ معلوم ہوتا ہے۔ "از سن یک ہزار و یک صد و بیست و ہشت تا یک ہزار و یک صد و شصت و نہ کہ چہل سال باشد نقد عمر دریں فن صرف نمودہ" (مخطوطہ ۱۱۸۸ھ، رضا لائبریری، رام پور)۔ ڈاکٹر زور نے لندن کے مخطوطہ سے یہ عبارت یوں نقل کی ہے: "از سنہ یکہزار و بست و ہشت تا یکہزار و شست و ہشت کہ قریب چہل سال باشد نقد عمر دریں فن نمودہ" (سرگذشت حاتم، ص ۲۲)۔ ڈاکٹر زور کی عبارت میں یک ہزار کے بعد "یک صد" کے الفاظ دونوں جگہ غالباً سہو کتابت سے رہ گئے ہیں[1]۔ رام پور والے نسخے میں ۱۱۲۸ھ تا ۱۱۶۹ھ دونوں سن درست ہیں کیونکہ شاہ حاتم نے دیوان زادہ ۱۱۶۹ھ میں مرتّب کیا تھا اور دیباچہ بھی غالباً اسی سال لکھا گیا تھا۔

محمد حسین آزاد نے آب حیات میں دیوان زادہ کے دیباچے کا خلاصہ دیتے ہوئے یہ لکھا ہے: "از ۱۱۲۹ھ تا ۱۱۶۹ھ کہ چہل سال باشد عمر دریں فن صرف کردہ" (آب حیات ص ۱۱۲)۔ آزاد کا یہ بیان، جو غالباً حافظہ کی یاد داشت پر مبنی ہے، مذکورہ بالا حوالوں کی روشنی میں قابل قبول نہیں رہتا۔ اس لیے حاتم کی شاعری کی ابتداء کے سلسلے میں ۱۱۲۸ھ کا سن ہی مستند قرار دیا جا سکتا ہے۔

محمد شاہ کے دوسرے سن جلوس (۱۱۳۲ھ) میں ولی کا دیوان

---

(۱) فہرست مخطوطات انڈیا آفس مرتّبہ بلوم ہارٹ میں بھی "یک صد" غائب ہے۔ غالباً یہ سہو اصل نسخے میں کاتب سے ہوئی ہوگی لیکن بلوم ہارٹ اور ڈاکٹر زور نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

دھلی پہنچا۔ اور اس کے اشعار زباں زد خاص و عام ھوگئے۔ مصحفی نے یہ روایت خود شاہ حاتم کی زُبانی تذکرۂ ھندی میں نقل کی ھے۔ شاہ حاتم فارسی شاعری میں مرزا صائب سے اور ریختہ میں ولی سے متاثر تھے۔ دیوان زادہ کے دیباچے میں اس امر کا اعتراف یوں کیا ھے:

"در شعر فارسی پیرویٔ میرزا صائب است و در ریختہ ولی را اُستاد میداند"

(مخطوطہ رضا لائبریری، رام پور)

پیرویٔ سخن کے سلسلے میں حاتم نے ۱۱۷۰ھ کی ایک غزل کے مقطع میں یہ کہا ھے:

ریختے میں ھند کے طوطی کا حاتم ھے غلام
فارسی میں خوشہ چیں ھے بُلبُلِ تبریز کا

(دیوان زادہ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی)

اس شعر پر کاتب دیوان زادہ مکند سنگھ فارغ شاگرد حاتم نے حاشیہ لکھا ھے اور طوطیٔ ھند، کنایہ امیر خسروؒ اور بُلبُل تبریز، کنایہ مرزا صائبؒ قرار دیا ھے۔ لیکن دیوان زادہ کے دیباچے میں شاہ حاتم کے بیان کے بعد یہ حاشیہ آرائی قابل قبول نہیں رھتی۔

دیوان ولی کی آمد پر شاہ حاتم نے ولی سے متاثر ھو کر متعدد غزلیں اُن کی زمینوں میں لکھیں۔ ڈاکٹر زور نے ان کی تعداد ۱۳ بتائی ھے۔[1] لیکن ڈاکٹر زور کا یہ بیان محلِ نظر ھے کہ ولی جب محمد شاہ کے عہد میں دھلی آئے تو حاتم نے بھی اُن سے ملاقات کی[2]۔

---

(۱) سرگزشت حاتم، مرتّبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ص ۲۶۔
(۲) سرگزشت حاتم، مرتّبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ص ۲۵

نواب اصغر علی خاں کی فرمائش پر حاتم نے ولی کی زمین میں جو غزل ۱۱۳۸ھ میں کہی ہے اُس کا مقطع ہے:

اے ولی مجھ سے تُو آزردہ نہ ہونا کہ مجھے
یہہ غزل کہنے کو نواب نے فرمائی ہے

ڈاکٹر زور نے دیوان زادہ مخطوطۂ لندن کے حوالے سے اس غزل کو ۱۱۴۱ھ کی تخلیق بتایا ہے۔ (پہلے مصرعہ میں تُو کی بجائے "اب" لکھا ہے)۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ولی غالباً ۱۱۴۱ھ میں دہلی میں موجود تھے[1]۔ لیکن بات یہ ہے کہ حاتم کی یہ غدر خواہی غائبانہ بھی تو ہو سکتی ہے۔ اب جب کہ ولی کا سال وفات ۱۱۱۹ھ متعین ہو چکا ہے[2] اور مصحفی کے تذکرۂ ہندی سے بھی یہی ثبوت ملتا ہے کہ محمد شاہ کے عہد میں ولی خود شاہی ہند نہیں آئے بلکہ اُن کا دیوان آیا۔ تو ولی سے حاتم کی ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کلام ولی سے متاثر ہو کر ریختہ میں انہیں اپنا استاد ماننا ایسے ہی ہے جیسے فارسی میں مرزا صائب کو حاتم نے اپنا استاد مانا ہے۔

شاہ حاتم ایّام جوانی میں مرد سپاہی پیشہ تھے۔ تذکرہ نگاروں نے اُن کی اوائل زندگی کو فراغت و خوش حالی کی زندگی قرار دیا ہے۔ قائم چاند پوری لکھتے ہیں: "در روزگار سلطنت محمد شاہ بادشاہ منصب ندیمی و خدمت بکاولیٔ نواب عمدہ الملک معمور پا بہ امتیار داشت۔ بعد فوت او توکّل روزگار نمود با کمال آزادگی می گذارند"[3] مصحفی

(۱) سرگذشت حاتم، مرتّبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ص ۲۶۔
(۲) بحوالہ رسالہ "اردو" بابت جنوری ۱۹۳۴ع و اورینٹل کالج میگزین بابت اگست ۱۹۳۴ع۔
(۳) مخزن نکات، قائم چاند پوری، ص ۲۴۔

عقد ثریا میں لکھتے ھیں : ''از بسکہ ابن خرابہ از قدر دانان معمور بود امیر زادہ ھاے والا تبار و رؤساے ذوالاقتدار او را بیش از بیش بتواضع و تعظیم پیش آمدہ در مسند برابر خود جا میدادند و مناسب حال خود با ھر یکے زر وافر میگذرانید - مرد بزرگ و جہاں دیدہ و فرسودۂ روزگار است - عمرھا بعیش و طرب بودہ و سالہا بناز و نعمت پرورش یافتہ ' حالا چوں کسے نماند بسبب مصلحت وقت ھواے زمانہ را مخلف دیدہ متوکلی و خانہ نشینی اختیار کردہ''[1]- چند سال بعد '' تذکرۂ ھندی'' میں مصحفی نے یہ لکھا : '' ھمیشہ عمدہ معاش و اوقات بخوبی گزرانیدہ ' مردِ سپاھی پیشہ از ھندوستان زایان قدیم بود ''[2]

حکیم قدرت اللہ قاسم نے مجموعہ نغز میں شاہ حاتم کی زندگی کے نشیب و فراز پر روشنی ڈالتے ھوئے اُن کی رند مشربی کے عجیب و غریب واقعات بیان کیے ھیں - قاسم نے یہ باتیں غالباً اپنے اُستاد ھدایت اللہ خاں ھدایت کی زُبانی سُنی تھیں - کریم الدین نے طبقات الشعراے ھند میں مجموعہ نغز کے بیان کا ترجمہ پیش کر دیا ھے اور آب حیات میں آزاد نے بھی حاتم کے ذکر میں زیادہ تر انھی دو کو اپنا ماخذ بنایا ھے - اس لیے یہاں مجموعۂ نغز کی عبارت پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ھے :

در اوایل حال بہ سپاھگری ایّام بسرمی برد و در آخرھا بہدایت سعادہ ازلی و رہ نمونیٔ مسیت لم یزلی تعلقات دنیوی را خیر باد گفتہ سنت خاک خود بدامان اھلِ دل بربست و بریاضات

(۱) عقد ثریا ' غلام ھمدانی مصحفی ' ص ۲۳ -
(۲) تذکرۂ ھندی ' غلام ھمدانی مصحفی ' ص ۸۰ -

درویسانہ در پیوست ۔ در ایامے کہ بسرکار دولت مدار نواب معلیٰ القاب عمدہ الملک امیر خاں بہادر عفی اللہ عنہ ملازم بود و ارتکاب منہیات بدرجہ اعلیٰ می نمود ۔ گاہ گاہ بہ تکیۂ میر بادل علی مرحوم بجوار فایض الانوار نقش قدم رسول علیہ الصلواۃ مبداء المعوس و العمول معرفت ۓ میر معمور کہ فقیر آزاد متسرع و درویش خدا یاد متورع و از مُریدان خاص حضرت شاہ امین سُہروردی کہ عقب دیوار پائین قاضی حمید الدین ناگوری قدس اللہ تعالیٰ اسرار ہا مجردانہ خفتہ است بود ، در میخورد با رفتہ رفتہ ارادہ بدلبس جا گرفت و بعد اظہار مافی الضمیر عزّ قبول پذیرفت ۔ اما حسب ظاہر مامور معروفات و ممنوع از منہیات نگشت ۔ در عرصہ پنج شش ماہ بہ عطاے تسبیح و مصلّیٰ و کلام اللہ و خرقہ و مایحتاجہا ے آنکہ مکلف بعمل شرائع گردد بمرور و تدریج سرفراز گشت ۔ در آخر ہمہ ورقے کہ بران استغفارے کہ از اوراد خاصۂ حضرات سُہرورد بود روح اللہ تعالیٰ ارواحہم باو رسید و بخواندن آن مامور گردید ۔ بمجرد خواندن حالتے بوے دست داد کہ در حین میل مباشرۃ زنا حرکتے از قویٰ شہوانی در خود نمی یافت و ہنگام ارادہ شرب مدام بمجرد رسیدن بوے ام الخبائث بمسام تہوع و قے دست میداد ۔ تا بالمرہ حرف عمل منہیات از صفحۂ خاطر عاطرش حک گردید و بہ صلاح و فلاح دنیوی و اخروی وارسید ۔ بہرحال بسیار آزادانہ زندگی می نمود و خیلے خوش مزاج و خلیق بود ۔ در آخر ہاے روز مدام بہ تکیہ شاہ تسلیم کہ بر شاہ راہ راج گھاٹ ، زیر دیوار قلعہ مبارک واقع است ، تشریف شریف ارزانی میداشت ، و

برخلاف وضع آزادان نیمہ می پوشید و بسیار با لطافت و طہارہ می زیست و گرد مسکرات نمی گشت و بصوم و صلواہ و سائر سرعات سخت مقیّد بود ۔ اما دستار چہ آزادانہ بر کلاہ می بست و چوبک باریک و رومال کہ شعار آزادان است با خویش میداشت ۔ بالجملہ درویشے بود نیک دین ، صاحب یقین و شاعرے بود با تمکین[1] "۔

شاہ حاتم کے حالات زندگی تذکرہ نگاروں کے بیانات کے مطابق کم و بیش یہی ہیں ۔ ان میں سے بعض باتیں شاہ حاتم کی زندگی پر روشنی ڈالتی ہیں اور کچھ ایسی بھی ہیں جو ذرا محلّ نظر ہیں ۔ اگر کسی شاعر کا اپنا کلام اس کی زندگی کے حالات و کوائف پر روشنی ڈال سکتا ہے تو یقیناً شاہ حاتم کا کلام بھی اس بارے میں ہماری رہنمائی کر سکتا ہے ۔ دیوان زادہ میں ایسے بہت سے اشعار مل جاتے ہیں جو ہمیں شاہ حاتم کی زندگی کے حالات اور اُن کی شخصیت کے خط و خال معلوم کرنے میں ممد ثابت ہو سکتے ہیں اور اُن کی مدد سے ہم تذکرہ نگاروں کے بیانات کی صحت یا عدم صحت کا جائزہ بھی لے سکتے ہیں ۔

شاہ حاتم مرد سپاہی پیشہ بھی تھے اور ایک خوش نوا شاعر بھی ۔ اور اس لحاظ سے اُن کی زندگی کا ایک حصّہ ضرور ایسا ہے جو امرا و رؤسا کی مصاحبت و سرپرستی میں گزرا اور انہیں عیش و آرام بھی میسّر آیا ۔ لیکن مصحفی کا یہ بیان کہ "ہمیشہ عمدہ معاش و اوقات بخوبی گزرانیدہ" کلام حاتم کی روشنی میں مکمل طور پر قابل قبول نہیں ہو سکتا ۔ اسی طرح قائم چاند پوری کا یہ بیان کہ عمدۃ

---

(۱) مجموعہ نغز ، حصّہ اوّل ، حکیم قدرت اللہ قاسم ، مرتّبہ حافظ محمود شیرانی ، ص ۱۷۹ تا ۱۸۰ ۔

الملک نواب امیر خان کی وفات کے بعد توکّل کی راہ اختیار کی، کچھ درست معلوم نہیں ہوتا۔ مصحفی نے عیش و طرب اور ناز و نعمت میں زندگی گزارنے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن حکیم قدرت اللہ قاسم نے اس میں جو رنگ بھرا ہے وہ کچھ افسانوی سا معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ اُن کی اکثر معلومات بڑی قیمتی ہیں۔ بہر کیف ہم ان آراء و اقوال کو خود شاہ حاتم کے کلام کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شاہ حاتم نے جب آنکھ کھولی تو مغل سلطنت کے زوال و انحطاط کا دور شروع ہو چکا تھا۔ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات (۱۱۱۸ھ) کے بعد تخت و تاج کے حصول کی خاطر تیموری شہزادوں کی خون آشام جنگوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا جو روشن اختر محمد شاہ کی تخت نشینی (۱۱۳۱ھ) کے ایک دو سال بعد تک جاری رہا۔ اس عرصے میں بّرعظیم ہندوستان کی سطح پر جو خونیں ڈرامہ کھیلا گیا اُس نے مغلوں کے نظام سلطنت کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔ اورنگ زیب کے زمانے کے بیشتر امرا خانہ جنگیوں کی نذر ہو گئے، جو بچ رہے وہ اپنی عزّت و آبرو بچانے کے لیے خانہ نشیں ہو بیٹھے۔ مرد سپاہی پیشہ کی وہ قدر و قیمت جو مغلوں کے عروج کے زمانے میں تھی باقی نہ رہی۔ شاہی دربار یا تو عیش و طرب کا اڈّا بنا ہوا تھا اور یا مختلف درباری گروہوں اور اُن کے سربراہوں کی سازشوں کا اکھاڑہ۔ جہاں ایرانی، تورانی اور ہندوستانی گروہوں کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے گروہ شب و روز اپنے اپنے مفادات کی خاطر سیاسی داؤ پیچ کرتے رہتے تھے، جس سے سلطنت کا رہا سہا وقار بھی ختم ہو رہا تھا۔ تاریخ کا یہی وہ نازک دور ہے جب سر زمین ہند میں ایسے ایسے فتنوں نے سر اُٹھایا کہ جن کے نتیجے میں صدیوں کا بنا بنایا معاشرتی و سیاسی نظام درہم

درھم ھو کر رہ گیا ۔ مرھٹوں نے شمالی ھند پر یورشیں اسی زمانے میں کیں، مرکز سلطنت کے قرب و جوار میں جاٹوں، سکھوں اور روھیلوں کی فتنہ آرائیاں اور پھر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملے اور قتل عام بھی اسی زمانے میں ھوئے ۔ غرض یہ وہ فتنہ خیز عہد ھے جس میں نہ مغل سلطنت میں کوئی دم خم باقی رھا تھا اور نہ ملک کے معاشرتی و معاشی نظام میں کوئی سکون و ثبات کی صورت رھی تھی۔ ظاھر ھے کہ اس حالت میں افراد کی بھی زندگیوں میں عیش و طرب اور ناز و نعمت کی کیفیت کب تک باقی رہ سکتی تھی ۔ بادشاھوں اور امیروں کا اپنا اقتدار پا در ھوا تھا تو اُن کے متوسّلین کس طرح عمدہ معاش کر سکتے تھے ۔

شاہ حاتم کا سفینۂ حیات بھی اسی گرداب حوادث میں سے گزرا ـــ وہ مرد سپاھی پیشہ تو ضرور تھے لیکن ایک ایسے عہد میں پیدا ھوئے جب مرد سپاھی پیشہ کی کوئی قدر نہ رھی تھی ۔ مغلوں کا فوجی نظام درھم برھم ھو چکا تھا ۔ ایک کھوکھلا سا بھرم رہ گیا تھا جس کو پہلے مرھٹوں نے (۱۱۴۹ھ میں دلّی تک یلغار کرکے) اور پھر نادر شاہ نے (۱۱۵۱ھ میں) پوری طرح کھول کر رکھ دیا ـــ شاہ حاتم کی زندگی کے ابتدائی ایّام بھی تلاش معاش اور فاقہ مستی و احتیاج ھی میں گزرے معلوم ھوتے ھیں ۔ ۱۱۳۵ھ کی ایک غزل کا مقطع ھے[1] ؎

محتاجگی سے مجکو نہیں ایک دم فراغ
حق نے جہاں میں نام کو حاتم کیا تو کیا

---

(۱) ڈاکٹر زور نے سرگذشت حاتم میں یہ شعر ۱۱۴۰ھ کی غزل کا قرار دیا ھے لیکن اس کے ساتھ ھی شاہ حاتم کی عمر اس وقت چوبیس سال بتائی ھے ۔ حالانکہ اُن کی عمر ۱۱۳۵ھ میں چوبیس سال ھو چکی تھی ۔ اس لحاظ سے یہ شعر ۱۱۳۵ھ ھی کا درست ھے ۔

اسی سال (۱۱۳۸ھ) کی ایک دوسری غزل کا مقطع ہے ؎

رات دن جاری ہے عالم میں مرا فیض سخن
گو کہ ہوں محتاج پر حاتم ہوں ہندستان کے بیچ

۱۱۳۶ھ میں شاہ حاتم نے ایک نظم (مسدس) توکّل و قناعت پر لکھی ہے۔ اس کے دس بند ہیں اور یہ دیوان قدیم میں شامل تھی۔ آخری بند ہے:

چشم امید رکھ کے خدا کے کرم کے ساتھ
باندھا نہیں ہے دل کو میں دام و درم کے ساتھ
گزراں اب کروں ہوں جہاں میں بھرم کے ساتھ
گرزا ہوں قُوتِ بیش سے قانع ہوں کم کے ساتھ
قسمت اوپر خوشی ہوں نہیں کام غم کے ساتھ
روزی مری ہے رزق مرے دم قدم کے ساتھ

۱۱۴۰ھ کی ایک غزل کا یہ مقطع بھی شاہ حاتم کی زندگی کے اسی رنگ کی ترجمانی کرتا ہے ؎

آشنا حاتم غریبوں کا ہو اُمراؤں کو چھوڑ
نام کو ذرہ نہیں ہے ان بخاروں میں دماغ

شاہ حاتم نے ۱۱۴۱ھ میں ایک مخمّس شہر آشوب لکھا جس میں انھوں نے عہد محمد شاہی کی سیاسی بد انتظامی، معاشی بد حالی، معاشرتی افراتفری اور عام بے چینی کا خاکہ بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ اس شہر آشوب میں اُس وقت کے داخلی انتشار و اضطراب کی کیفیت پوری طرح منعکس ہے جب کہ دہلی نے ابھی مرہٹہ یلغاروں اور نادر و ابدالی کے حملوں کے تباہ کُن مناظر نہیں دیکھے تھے۔ تاہم ایک ہولناک طوفان کی آمد سے قبل کے آثار و قرائن پیدا ہو چکے تھے۔ شاہ حاتم

کا یہ شہر آشوب اس لحاظ سے ایک بڑی اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور اسے شاکر ناجی، رفیع سودا اور میر تقی کے شہر آشوبوں کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔ عام سیاسی و معاشرتی اختلال کے علاوہ اس شہر آشوب سے شاہ حاتم کی اپنی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہاں صرف تین بند پیش کیے جاتے ہیں:

شہوں کی بیچ عدالت کے کچھ نسانی نہیں
امیروں بیچ سپاہی کی قدر دانی نہیں
بزرگوں سج کہیں بُوئے مہربانی نہیں
تواضع کھانے کی چاہو کہیں تو پانی نہیں
گویا جہاں سے جاتا رہا سخاوت و پیار

امیر زادے ہیں حیران اپنے حال کے بیچ
تھے آفتاب پر اب آ گئے زوال کے بیچ
پھریں ہیں چرخے سے ہردن تلاش مال کے بیچ
وہی گھمنڈ امارت ہے پھر خیال کے بیچ
خُدا جو چاہے تو پھر ہو پر اب تو ہے دُشوار

کرے ہے چرخ اگر تجھ اوپر جفا حاتم
تو سفلے پاس نہ کر جا کے التجا حاتم
ترے ہے رزق کا ضامن سدا خدا حاتم
تُو انقلاب زمانہ سے غم نہ کھا حاتم
کہ تجھ کو رزق بہت اور روزگار ہزار

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شاہ حاتم بھی اس زمانے میں دوسرے

مردان سپاہی پیشہ کی طرح عام معاشی اختلال کی زد میں تھے۔
شاہ بادل کا تکیہ اس عزت اور افلاس میں ایک سہارے سے کم نہ تھا۔
حاتم نے درویشی کا وہ رنگ ابھی شاید اختیار نہیں کیا تھا جس میں
صبر و شکر، توکّل و قناعت اور تسلیم و رضا زندگی کی مثبت اقدار بن
جاتی ہیں۔ شہر آشوب میں حاتم کا لہجہ خاصا تلخ ہے جو ایک عام
دنیا دار کی محرومی و نارسائی کے ردّعمل سے پیدا ہوتا ہے۔ اس میں
درویشی اور فقر کا پہلو مفقود ہے۔ تاہم شاہ بادل سے عقیدت رفتہ رفتہ
حاتم کے دل و دماغ میں تغیّر پیدا کر رہی تھی۔
١١٤٣ھ کی ایک غزل کا یہ مقطع ہے

خودی کو چھوڑ، آ حاتم خدا دیکھ
کہ تیرا رہنما ہے شاہ بادل

اور ١١٤٧ھ کی ایک غزل کا یہ مقطع ہے

قدموں لگا ہوں میر محمد امیں کے میں
حاتم نہیں جہان میں کمی اور غمی مجھے

فقر و درویشی کی ابتدائی منزلوں کا پتا دیتے ہیں لیکن ان میں ترک
دنیا اور گوشہ نشینی کا نشان نہیں ملتا۔ اس زمانے میں شاہ حاتم نے بعض
امراء کی فرمائشوں پر کچھ غزلیں بھی کہی ہیں جن سے یہ واضح ہوتا
ہے کہ کبھی کبھی کوئی امیر ان کی سرپرستی بھی کر دیتا ہوگا۔
شاہ حاتم نے ١١٤٤ھ کے لگ بھگ اپنا دیوان قدیم مُرتّب کیا۔ اس
زمانے میں اُن کی شاعری کا خاصہ شہرہ ہو چکا تھا۔ ١١٤٨ھ میں عہد
محمد شاہی کے نامور امیر عمدہ الملک نواب امیر خان انجام نے اُن
کی سرپرستی کی۔ اس سال کی ایک غزل کا مقطع ہے

ممتاز کیوں نہ ہو وے وو اپنے ہم سروں میں
حاتم کا قدر داں اب نواب امیر خاں ہے

۱۱۴۸ھ ہی کی ایک دوسری غزل کے مقطع میں شاہ حاتم نے نور الدولہ فاخر خاں کے لطف و عنایت کا ذکر یوں کیا ہے ؎

ہوں تو حاتم لیک ہردم لطف سے
مول لیتا ہے گا فاخر خاں مجھے

ڈاکٹر زور نے سرگذشت حاتم میں " دیوان زادہ " مخطوطہ لندن کے حوالہ سے اس غزل کی سرخی یہ لکھی ہے " بنام نورالدولہ فاخر خاں بہادر خلف نواب شمس الدولہ مشہور جنگ در ۱۱۵۱ھ" - چند برس بعد ۱۱۵۴ھ کی ایک غزل کے اس مقطع ؎

کچھ اب سامان اپنے عاقبت خانے کا کر حاتم
نہ بھول اس پر کہ نورالدولہ کا میں خانساماں ہوں

سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ حاتم کی سرپرستی نواب امیر خاں کے علاوہ دوسرے امراء بھی کر رہے تھے - نواب امیر خاں ۱۱۵۲ھ کے اواخر یا ۱۱۵۳ھ کے اوائل میں الہ آباد کے صوبہ دار بن کر وہاں چلے گئے تھے اور تین سال بعد آخر ۱۱۵۶ھ میں واپس دھلی آئے تھے[۱] - غالباً اس دوران میں کچھ عرصہ کے لیے شاہ حاتم نورالدولہ فاخر خاں کے خان ساماں بن گئے ہوں گے[۲] - اسی زمانے میں شاہ حاتم کی شاعری ملک کے

---

(۱) بحوالہ " انجام' نواب عمدہ الملک" کلب علی خاں فائق' مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۶۰ء ص ۱۰۹ -

(۲) ڈاکٹر زور نے " سرگذشتِ حاتم " میں یہ شعر ۱۱۵۲ھ کا بتایا ہے اور پہلا مصرع یوں لکھا ہے ع

کچھ اب بھی فکر اپنے عاقبت خانے کی کر حاتم

" سرگذشت حاتم صفحہ ۴۸ " لیکن واقعات کے اعتبار سے ۱۱۵۴ھ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے -

خاص و عام میں مقبول ہو چکی تھی - ۱۱۴۸ھ کا یہ شعر ؎

تمام ہند میں دیوان کو ترے حاتم
رکھے ہے جان سے اپنی عزیز عام اور خاص

اسی شُہرت و مقبولیت کو ظاہر کرتا ہے - گویا یہ زمانہ شاہ حاتم کے دعوی عروج کا ہے - جس میں اُمرا و سلاطین اُن کی قدر کرنے لگے تھے - ڈاکٹر نور نے مخطوطۂ لندن کے حوالے سے جو "عرضی بہ جناب نواب عمدہ الملک در استعفاء خدمت در ۱۱۴۶ھ" (سرگذشت حاتم ص ۴۴) میں نقل کی ہے وہ اس زمانے کی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے کئی برس بعد کی چیز ہے - اگر اس مفروضے کو درست مان لیا جائے تو پھر جن وجوہ کی بنا پر حاتم نے استعفیٰ دیا اُن کے پیش نظر وہ نورالدولہ کے خانساماں کبھی نہ بنتے بلکہ درویشی اختیار کر لیتے - اس زمانے میں عمدہ الملک جیسے صاحب اقتدار امیر کی ملازمت چھوڑ کر کسی دوسرے امیر کی ملازمت اختیار کرنا بعید از قیاس ہے - اور پھر اس زمانے میں شاہ حاتم نے چند ایسی نظمیں بھی تخلیق کی ہیں جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت عمدہ الملک نواب امیر خان کے ملازم و مصاحب تھے اور اس صاحب اقتدار امیر کی سرکار میں اُن کی بڑی قدر و منزلت تھی - ۱۱۴۹ھ میں شاہ حاتم نے دو نظمیں لکھیں - ایک نظم "وصف قہوہ" حسب الارشاد نواب عمدۃ الملک در ۱۱۴۹ھ (دیوان زادہ مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی ورق ۱۵۱)، اور دوسری نظم "وصف تماکو و حُقّہ" حسب الحکم فردوس آرامگاہ محمد شاہ بادشاہ (دیوان زادہ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی، ورق ۱۵۰ب تا ۱۵۵)[1] علاوہ بریں

---

(۱) میر تقی میر "نکات الشعرا" میں جعفر علی خان ذکی کے بیان میں لکھتے ہیں:

"جعفر علی خان ذکی مرد عمدہ روزگاریست، متوطن دہلی، بادشاہ محمد شاہ

ایک مثنوی بہاریہ موسوم بہ بزم عشرت ۱۱۴۷ھ کی تخلیق ہے جس میں شاہجہاں آباد کی توصیف اور محمد شاہ کی مدح بھی شامل ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ شاہ حاتم نے اپنے زمانے کے دستور کے بر عکس کسی امیر کی مدح میں کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ زیادہ سے زیادہ ایک آدھ شعر میں کسی قدر دان امیر کی تعریف کر دی ہے ورنہ خاموش رہے ہیں۔ صرف اس مثنوی کے چند اشعار میں محمد شاہ کی مدح کی ہے جو درج ذیل ہیں:

کہوں ہوں وصف اور مدح شہنشاہ
محمد شاہ غازی آسماں جاہ

شہ عالی لقب دریائے ہمّت
مہِ روشن لقا خورشید طلعت

شجاع دہر و شاہِ ہفت کشور
کمینے جن کے ہیں خاقان و قیصر

لیا ہے سلطنت کو مار شمشیر
پھٹا ہے جس کے ڈر سے گردۂ شیر

جوان مرد و جوان طالع، جوان بخت
کہ دے ہے زیب جس کو تاج اور تخت

وہ بے شک آج شاہ بحر و برّ ہے
جلو میں جس کے نُصرت اور ظفر ہے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸)

بر او فرمائش مثنوی حقہ کردہ بود۔ دو سہ شعر موزوں کرد۔ دیگر سر انجام ارو نیافت اکنون شیخ محمد حاتم کہ نوشتہ آمد باتمام رسانید۔ و آں مثنوی خالی از مزہ نیست۔۔۔۔" (نکات الشعرا، صفحہ ۱۴۶)۔

مبارک اُس کو تاج و تخت و خوبی
سدا یہ سلطنت ہندوستاں کی

نہ رکھ حاتم طمع شاہ و گدا سے
جو کُچھ چاہے سو مانگا کر خدا سے

توقع غیر سے خطراب ہے گا
کہ سب کا رزق اُس کے ہاتھ ہے گا

شریک مصلحت ہو آؤ ساقی
شراب بے کدورت لاؤ ساقی

پیالا دے کہ ہے وقت مُلاقات
جمع یاراں کو کر کہتا (کذا) کچھ بات

شاہ حاتم عمدہ الملک نواب امیر خان انجام کی سرکار میں منصب ندیمی و خدمت تکاولی (میر مطبخ) پر فائز تھے[1]- شاہ حاتم کی زندگی میں یہ زمانہ خوش حالی و فارغ البالی سے معمور تھا - عقد ثُریا میں مصحفی کا یہ بیان " از بسکہ ایں خرابہ (شاہجہاں آباد) از قدر دانان معمور بود ' امیر زادہ ہائے والا تبار و رؤسائے ذوالاقتدار او را بیش از بیش بتواضع و تعظیم پیش آمدہ بر مسند برابر خود جامیدادند و مناسب حال خود باہریکے زر وافر میگذرانید "[2] غالباً اسی دور کی زندگی کے بارے میں ہے - لیکن تاریخ کا یہی وہ تاریک دور ہے جب سرزمین ہند خونیں حادثات سے دو چار ہوئی - ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ کا حملہ اور دھلی میں قتل عام ہوا - ادھر نادر شاہ ہندوستان کی دولت سمیٹ کر واپس ایران کو لوٹا

---

(۱) مخزن نکات ' قائم چاندپوری ' صفحہ ۲۳ -
(۲) عقد ثریا ' غلام ہمدانی مصحفی ' صفحہ ۲۳ -

اور ادھر دارالسلطنت میں امراء کی رسہ کشی پھر سے شروع ہوگئی۔ جس کے نتیجے میں عمدہ الملک کو الہ آباد کی صوبے داری پر جانا پڑا۔ ۱۱۵۶ھ میں اُسے واپس بُلایا گیا۔ تین سال بعد ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۵۹ھ کو اُسے دیوان خاص کے پاس قتل کر دیا گیا[1]۔

شاہ حاتم کی زندگی کے رُخ کو کلیۃً درویشی کی طرف موڑنے میں ان اہم انگیز واقعات کا بھی خاصہ دخل ہے۔ عمدہ الملک جب تک الہ آباد میں رہے غالباً شاہ حاتم کی سرپرستی دوسرے اُمرا کرتے رہے۔ شاہ حاتم نے اس زمانے کے بعض اشعار میں نورالدولہ فاخر خاں کا ذکر کیا ہے اور اُن کی فرمائش پر چند ایک غزلیں بھی کہی ہیں۔ آخری غزل ۱۱۵۶ھ کی ہے۔ اس کے بعد عمدہ الملک کی واپسی پر شاہ حاتم پھر اُن کے ندیم اور نکاؤل بن گئے ہوں گے۔ لیکن اب اُن کا دل دُنیوی جاہ و منصب سے اُچاٹ ہو چکا تھا۔ اس دور میں اُن کے کلام میں جابجا اس رجُحان کا اظہار ہوا ہے۔ مثلاً چند شعر ملاحظہ ہوں:

اس زمانے میں ہمارا دل نہ ہو کیوں کر اُداس
دیکھ کر احوال عالم اُڑتے جاتے ہیں حواس ۱۱۵۱ھ

کس کنے لے جائیں تیرے ظُلم کی فریاد ہم
تُجھ ہی سے تیرے ستم کی چاہتے ہیں داد ہم[2] ۱۱۵۱ھ

---

(۱) انجام، عمدہ الملک، مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۲۔

(۲) عمدہ الملک امیر خاں انجام نے بھی اس طرح میں یہ شعر کہا ہے؎

اب بھی احساں ہے تیرا جو نہ ہوں آزاد ہم
پھر چمن میں جائیں کیا منہ لے کے اے صیّاد ہم

بقول کلب علی فائق، انجام نے یہ مطلع ۱۱۵۶ھ میں محمد شاہ کے فرمان طلبی کے جواب میں موزوں کرکے عریضے میں درج کر دیا۔ (بحوالہ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۱۰)۔

جہاں کے باغ میں کرتا ہے سَیر اس واسطے حاتم
کہ شاید مہرو اَلفت کی کسو بھی گُل سے بُو آوے ۱۱۵۱ھ

دمِ غنیمت جان ٹک چل اور گُلوں کا دید کر
سیرِ گلشن کو تجھے حاتم بُلاتی ہے بہار ۱۱۵۲ھ

بُلبُل کے مُشت پَر کو مت جا ہے کُنجِ باغ
صیّاد سے بچے تو کرے آسماں وسیع ۱۱۵۲ھ

خدا نے سب طرح کی دی ہے نعمت، شُکر ہے لیکن
مجھے حاتم مری ہمّت سے ہے افلاس یا قسمت ۱۱۵۵ھ

حاتم جہاں کو جان کے فانی خُدا کو چاہ
اللہ بس ہے اور یہ باقی ہے سب ہوس ۱۱۵۵ھ

دینار اور درم کے نہ لا دل کو دام میں
قارون سے ہے خبر کہ خزانے نے کیا کیا ۱۱۵۶ھ

آخری شعر حسن غزل کا ہے وہ نورالدولہ کی فرمائش پر کہی گئی تھی۔ ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ اس دور کے الم انگیز حالات کا شاہ حاتم کی زندگی پر کتنا گہرا اثر پڑا تھا۔ وہ فقر و درویشی کی طرف تو شروع ہی سے میلان رکھتے تھے لیکن ترکِ دنیا کا خیال ان حالات میں پُختہ ہوا۔ چنانچہ ۱۱۵۸ھ میں انہوں نے عمدہ الملک کی خدمت میں ایک منظوم عرضی پیش کی اور منصب ندیمی و بکاولی سے استعفیٰ دے

کر درویشی اختیار کر لی[1] عرضداشت درج ذیل ہے :

تمہارا عمدہ الملک اس قَدَر سے خوان نعمت ہے
کہ جس پر رات دن شاہ و گدا مہمان نعمت ہے

جسے دیکھوں ہوں تیری بندگی میں میں نہ یک تنہا
تری دولت سے ہر یک صاحب الوان نعمت ہے

کہیں ہیں مہر و مہ جس کے تئیں روشن ہے عالم پر
سو دسترخوان کا تیرے وو قرص نان نعمت ہے

سحر سے شام تک اور شام سے تا صبح برسوں سے[2]
ہمارا کام تیری بزم میں سامان نعمت ہے

ہوا ہوں سیر ادما چاسی سے چشک کی تیرے
خدا شاہد ہے کس کافر کو پھر ارمان نعمت ہے

جیوں گا جب تلک حق نمک تیرا نہ بھولوں گا
رہے گا یاد سب جو کچھ ترا احسان نعمت ہے

ہوا ہوں جب سے داروغہ ترے باورچی خانے کا
اگر شکوہ کروں اس کا تو یہ کُفران نعمت ہے

ولے قیدی ہوا ہوں بس کہ رات اور دن کی محنت سے
ہے مطبخ کانِ نعمت پر مجھے زندانِ نعمت ہے

---

(۱) کلب علی خاں فائق نے اپنے مضمون " نواب عمدہ الملک انجام " میں اس عرضی کا سال تصنیف ۱۱۵۶ھ لکھا ہے - (اورینٹل کالج میگزین ' نومبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۵) - لیکن ہماری رائے میں ۱۱۵۸ھ درست ہے کیونکہ عمدہ الملک ۱۱۵۶ھ کے آخر میں دہلی واپس آئے - اس لیے اُن کے آتے ہی شاہ حاتم کے مستعفی ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا -

۲- " سرگذشت حاتم " مؤلفہ ڈاکٹر زور میں " برسوں سے " کی بجائے " مدت تک " ہے صفحہ ۴۴ -

یہی ہے عرض خدمت میں تری حاتم نکاؤں کی
یہ خدمت بخش اُس کو جو کوئی خواہان نعمت ہے

قائم چاند پوری کا یہ بیان کہ "بعد فوت او (نواب عمدہ الملک) توکل روزگار نمود۔ باکمال آزادگی می گزارند"[1] اس استعفیٰ کی روشنی میں غلط ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ حاتم کے استعفیٰ اور نواب عمدہ الملک کے واقعۂ قتل میں صرف ایک سال کا فرق ہے۔ اس لیے قائم کے بیان سے کم از کم اس بات کا ثبوت ضرور مل جاتا ہے۔ کہ شاہ حاتم نواب عمدۃ الملک کی زندگی کے آخری زمانے میں اُن کے ہاں ملازم تھے۔

قائم نے اپنا تذکرہ ۱۱۶۸ھ میں مکمل کیا۔ اس لیے یہ ایک قریبی شہادت پیش کرتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اسے تسلیم نہ کیا جائے۔ اس سے شاہ حاتم کے ۱۱۴۵ھ میں مستعفی ہونے کا مسئلہ خارج از امکان ہو جاتا ہے۔

درویشی اختیار کرنے کے بعد بھی اگرچہ امرا و سلاطین شاہ حاتم کی قدر دانی کرتے رہے لیکن اب انھوں نے منصب و جاگیر کے خیال ہی کو دل سے نکال دیا تھا۔ اب وہ عرفان حقیقت کی ایسی منزلوں تک پہنچ چکے تھے جہاں فقر و استغنا وسیلۂ ظفر سمجھے جاتے ہیں اور دنیاوی مال و مناصب کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دی جاتی۔ اس دور کے کلام میں بعض قدر دان امرا کی حاتم نے تعریف بھی کی ہے۔ مثلاً ۱۱۶۳ھ کی ایک غزل کے مقطع میں ہدایت علی خاں ضمیر کے لُطف و احسان کا ذکر کیا ہے۔

---

(۱) مخزن نکات، قائم چاند پوری، صفحہ ۲۴۔

ہدایت علی خاں بہادر نے حاتم
مجھے لطف و احساں سے مرہوں کیا ہے

۱۱۶۹ھ کی ایک غزل کا عنوان یہ ہے "تضمین مصرع بادشاہ عالمگیر ثانی بموجبِ حکم" اور مقطع میں لکھتے ہیں :

شاہ عالمگیر کا مصرع ہے حاتم رمزِ عشق
دل میں آتا ہے کہ شاہی میں گدائی کیجیے

۱۱۸۷ھ کی ایک غزل میں روہیلہ سردار ضابطہ خاں کی تعریف کی ہے :

حاتم اس دور کے امیروں میں حاتم وقت ضابطہ خاں ہے

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ حاتم کے لیے دُنیوی خوش حالی کے راستے اب بھی کُشادہ تھے ۔ وہ چاہتے تو عیش و نشاط کی زندگی اب بھی بسر کر سکتے تھے ۔ لیکن کچھ طبیعت کے رنگ نے اور کچھ زمانے کے حالات نے اُن کا مطمح نظر ہی بدل دیا تھا ۔ فقر و فاقہ کی حالت میں اُن پر نازک وقت بھی آئے ، مفلسی اور تنگ دستی نے انھیں تنگ بھی کیا لیکن جس راہ طریقت کو انھوں نے اختیار کیا تھا اُس پر اُن کے پاؤں نہیں ڈگمگائے ۔ صبر و شکر ، توکّل و قناعت اور تسلیم و رضا اب ان کی زندگی میں مثبت اقدار بن گئی تھیں ۔ اس لیے اب اُن کے کلام میں لہجہ کی وہ تلخی بھی نہیں رہی تھی جو شروع زمانے کے کلام میں نظر آتی ہے ۔ اس دور کے کلام سے چند اشعار کے آئینہ میں شاہ حاتم کی زندگی کے خط و خال دیکھیے :

تنگ دستی سے نہ ہو دل تنگ و حاتم چشم تنگ
دل توّنگر چاہیے تیرا تُو گو مُفلس ہوا ۱۱۵۸ھ

دام سے منصب و جاگیر کے نار آ حاتم
یہ دمِ نقد نہ کھو فکرِ محالات کے بیچ ۱۱۶۱ھ

بجاوے حق عذاب جوع ہے اس دور میں حاتم
جدھر دیکھا ہوں اب سب کی زباں پر روٹی روٹی ہے ۱۱۶۸ھ

مفلسی اور دماغ اے حاتم
کیا قیامت کرے جو دولت ہو ۱۱۶۸ھ

فیض سے ہمت کے حاتم دل تونگر چاہیے
مفلسی سے ان دنوں گو دست میرا تنگ ہے ۱۱۶۹ھ

پھر کہا ہے ہم نے حاتم در سر دار فنا
بھاڑ میں ڈالیں گے لے کر منصب و املاک ہم ۱۱۶۹

جہاں کو جان کر فانی اُٹھایا دل کو حاتم نے
وگرنہ کی ہوس میں شوق سب جاگیر و منصب کا ۱۱۷۱ھ

نہ پہنچا ہاتھ دولت کا کبھو میرے گریباں تک
لگا ہے جب سے دل کے دست میں دامن قناعت کا ۱۱۷۱ھ

شاہ حاتم بڑا قلندر ہے گھر میں تکیا نہیں حلال کرے
۱۱۹۱ھ

مستعفی ہوئے اور ترک علائق کے بعد شاہ حاتم اپنے پیر و مرشد شاہ عادل علی کے قدموں سے آ لگے۔ پہلے وہ گاہ گاہ آستانۂ مرشد پر حاضری دیا کرتے تھے۔ اب وہ مستقل طور پر اُن کے حلقۂ بگوش ہو گئے۔ مرشد کی نگاہ نے مُرید کی قلب ماہیت کرکے ظاہر و باطن کے فاصلوں کو ملا دیا اور شاہ حاتم عرفان حقیقت کی منزلوں کی طرف گامزن ہوگئے۔ غالباً یہی وہ موقعہ ہے جب بقول صاحب مجموعۂ نغز پانچ چھ ماہ کی کاہش و ریاضت کے بعد مُرشد نے اُنہیں تسبیح و مصلّیٰ و کلام اللہ و

خرقہ وغیرہ عطا کیے اور وہ سلسلۂ سہروردیہ کے طریق پر درود و وظائف میں لگ گئے ۔ اس قلب ماہیّت اور فیض روحانی کے بارے میں شاہ حاتم نے بعض اشعار میں بھی ذکر کیا ہے ۔ مثلاً :

حاتم کیا ہے حق نے دو عالم میں سر بلند
بادل علی کے حب سے لگے ہیں قدم سے ہم ۱۱۶۱ھ

اٹھا کر خاک سے حاتم چڑھایا آسماں اوپر
میرے اللہ نے ، بندہ نوازی اس کو کہتے ہیں ۱۱۶۱ھ

حساب حضرت حق سے نہ ہو کیوں فیض حاتم کو
ہوا ہے تربیت وہ بادل عادل کی صحبت میں ۱۱۶۴ھ

اس آخری شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ بادل علی ۱۱۶۴ھ سے قبل وفات پا چکے تھے اور اب مُرید اُن کے فیضِ صحبت اور تعلیم و تربیت کا ذکر بڑے فخریہ انداز میں کر رہا ہے ۔ ۱۱۶۹ھ کی ایک غزل کا مقطع بھی اسی انداز کا ہے :

شاہ بادل کا ہر سخن حاتم
اپنے حق میں کتاب جانے ہے

شاہ بادل علی کی وفات کے بعد شاہ حاتم اُن کے آستانہ کی بجائے اس عہد کے ایک دوسرے مشہور درویش شاہ تسلیم کے تکیہ میں وقت گزارنے لگے ۔ صاحب مجموعۂ نغز لکھتے ہیں کہ '' در آخرہائے روز مدام بہ تکیہ شاہ تسلیم کہ بر شاہ راہ راج گھاٹ زیر دیوار قلعہ مبارک واقع است ، تشریف شریف ارزانی میداشت ''[۱] ۔ '' سرگذشتِ حاتم '' میں

(۱) مجموعہ نغز ، حکیم قدرت اللہ قاسم ، صفحہ ۱۸۰ ۔

ڈاکٹر زور نے ۱۱۶۰ھ کا ایک شعر بھی درج کیا ہے[1]۔

اب ہندستاں کے درویشوں میں حاتم
ہے تسلیم و رضا میں شاہ تسلیم

مولوی محمد حسین آزاد "آب حیات" میں لکھتے ہیں: "شاہ تسلیم ایک نیک مرد فقیر تھے اور خود شاعر تھے۔ چونکہ اُن کا تکیہ بھی ایک دلکشا اور با فضا مقام تھا اس لیے اکثر شعر و سخن کے شائق بھی صبح شام وہاں جا بیٹھا کرتے تھے۔"[2] سعادت یار خاں رنگین "مجالس رنگین" کی چوتھی مجلس میں لکھتے ہیں "از پنجاہ سال معمول حضرت شاہ حاتم شاہ بود کہ ہمیشہ چہار گھڑی روز باقی ماندہ در تکیہ شاہ تسلیم شاہ کہ بیرون قلعہ شاہجہان آباد است تا شام نشستہ میماندند۔ اکثر شاگردان و مردم دیگر کہ در خدمت اوشان بندگی داشتند آنوقت آنجا رفتہ حاضر می شدند۔ چنانچہ بندہ ہم شاگرد اوشان بود۔ روزے در ایام نو مشقی بہمان تکیہ درخدمت شاہ صاحب موصوف بندہ و محمد امان خان نثار و لالہ مکند رائے فارغ و اکبر علی اکبر امروہی وغیرہ چند شاگردان دیگر حاضر بودیم۔ حضرت شاہ صاحب فرمودند کہ شب مطلعے گفتہ ام:
مطلع۔

سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کُوٹا ہے
رات ہم ہجر کی دولت سے مزا لُوٹا ہے

چونکہ در مزاج چالاکی بسیار بود و شعور کم، بے تکلف از راہ نادانی

(۱) "سرگذشت حاتم" صفحہ ۱۵۔ مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی میں یہ شعر ۱۱۹۳ھ کا ہے جو درست نہیں۔ سرگذشت حاتم کا شعر کہ سے شروع ہوتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے مخطوطہ میں کہ کی بجائے اب ہے اور یہی موزوں معلوم ہوتا ہے۔

(۲) آب حیات صفحہ ۱۱۳

گستاخانہ عرض کردم کہ اگر مصرعۂ ثانی این قسم ارشاد شود بہتر است ؎

سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کُوٹا ہے
ہم نے شب ہجر کی دولت سے مزا لُوٹا ہے

بمجرد شنیدن این دست بندہ را قریب خود کشیدہ، دست بر سر گردانیدہ فرمودند کہ آفرین صد آفرین، انشاء اللہ تعالیٰ بعد چندے مشق ایشان بسیار ترقی خواہد کرد این مثل از زبان ارشاد فرمودند، مثل: ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات - شخصے از حاضران مجلس اظہار کرد کہ این قدر گستاخی لازم نبود - فرمودند کہ واللہ در دیوان ہمیں قسم خواہم نوشت و این قطعہ بر زبان آوردند قطعہ :

من و آن سادہ دل کہ عیب مرا ہم چو آئینہ رو برو گویند
نہ چو شانہ بصد زبان و دو رُو پس سر رفتہ مُو بمُو گویند"[1]

یہ واقعہ مختصراً آزاد نے آب حیات میں نقل کیا ہے لیکن حوالہ نہیں دیا - ڈاکٹر زور نے سرگذشت حاتم میں "مجالس رنگیں" مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری سے نقل کیا ہے - محولہ بالا عبارت اور سرگذشت حاتم کی عبارت میں تھوڑا سا فرق ہے - شاگردوں میں میاں غلام علی شاہ غلامی اور مرزا عظیم بیگ عظیم کے نام زائد ہیں - شعر کے بارے میں حاتم کے الفاظ یہ ہیں "کہ شب در خواب این شعر گفتہ بودم، چون بیدار شدم یاد ماند - - -"[2]

یہ واقعہ لکھنے کے بعد ڈاکٹر زور اس پر تبصرہ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ حاتم کی وفات کے کچھ ہی عرصہ پہلے کا ہے - لیکن اس میں

---

(۱) مجالس رنگیں، سعادت یار خاں، مطبوعہ ۱۸۶۴ع -
(۲) سرگذشت حاتم، صفحہ ۵۱ -

ایک بات صحیح نہیں معلوم ہوتی اور وہ یہ کہ حاتم شاہ تسلیم کے تکیہ میں صرف شام کے وقت جاتے تھے۔ کیونکہ مجموعہ نغز میں لکھا ہے "کہ در اخر ہائے روز مدام بہ تکیہ شاہ تسلیم ۔۔۔ تشریف شریف ارزانی میداشت"[1]

اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ محولہ بالا شعر جس غزل کا مطلع ہے وہ غزل ۱۱۶۱ھ کی ہے۔ اس لیے پہلے تو یہی بات محل نظر ہے کہ شاہ حاتم نے اس مطلع کے بارے میں یہ کہا ہو کہ رات خواب میں یا بدرای میں یہ مطلع کہا ہے۔ رنگین ۱۱۷۰ھ میں پیدا ہوئے اور پندرہ سولہ سال کی عمر میں انہوں نے مشق سخن جاری کی اور شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ گویا یہ واقعہ ۱۱۸۶ھ کے لگ بھگ زمانے کا ہے۔ اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ حاتم ۱۱۶۱ھ کے مطلع کے بارے میں پچیس سال بعد یہ کہیں کہ رات ہی یہ مطلع کہا ہے! اور پھر رنگین نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب حاضرین نے اس گستاخی پر ٹوکا تو شاہ صاحب فوراً بولے کہ میں صاحب میں اپنے دیوان میں اس مطلع کو اسی طرح قلم بند کروں گا! حالانکہ دیوان زادہ میں یہ شعر اسی طرح ہے جس طرح حاتم نے کہا ہے۔ ممکن ہے کہ حاتم نے یہ شعر اس مجلس میں پڑھا ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کے بارے میں یہ بھی کہا ہو کہ رات ہی اس کا نزول بھی ہوا ہے۔

مجالس رنگین ۱۲۱۶ھ کی تصنیف ہے۔ رنگین نے اسے بعض دوستوں کے کہنے پر ترتیب دیا۔ اس لیے ممکن ہے کہ اٹھائیس برس بعد یاد داشت نے اُن کا پورا ساتھ نہ دیا ہو۔ مجالس رنگین میں پچاس سال کی مدت کا تعین بھی قیاسی ہی ہے اسے من و عن درست تسلیم کر لینا

(۱) سرگذشتِ حاتم، صفحہ ۵۲۔

مناسب نہیں۔ شام کے وقت تکیہ شاہ تسلیم میں جانے کی روایت قرین صحت ہے۔ مجموعہ نغز میں ''در آخر ہائے روز مدام'' سے یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ وفات سے تین چار سال پیشتر وہ ہمہ وقت شاہ تسلیم کے تکیہ میں اقامت گزیں ہوگئے ہوں گے۔ شاہ حاتم تکیہ شاہ تسلیم کے علاوہ دوسری شاعرانہ مجالس میں بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ مصحفی تذکرۂ ہندی میں لکھتے ہیں کہ ''در ایامیکہ فقیر در شاہجہان آباد طرح مشاعرہ انداختہ اکثر بعد مغرب در مشاعرہ قدم رنجہ می فرمود و در مجلس نشستہ زمانۂ سابق خود راہ می ستود''[۱]

شاہ حاتم کے آخر عمر کے کلام سے اُن کے اس زمانے کے فکر و احساس کا اندازہ ہوتا ہے۔ شباب کی منزلوں سے گزر کر جب انسان شیب کی وادیوں میں قدم رکھتا ہے تو جاتی جوانی کا احساس دل میں چٹکیاں لینے لگتا ہے۔ پھر جوں جوں آفتاب عمر ڈھلنے لگتا ہے اور انسان کی زندگی میں سائے دوڑتے اور پھیلتے چلے جاتے ہیں، آنے عاقبت کا احساس ایک اور ہی عالم میں پہنچا دیتا ہے۔ زندگی کی اس دھوپ چھاؤں کی کیفیت کو ذرا حاتم ہی کے چند اشعار کی روشنی میں دیکھیے:

نوجوانوں کو دیکھ کر حاتم
یاد عہد شباب آوے ہے ۱۱۶۱ھ

پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر
سُوکھے درخت پھر کے ہوئے ہیں کہیں ہرے ۱۱۶۹ھ

عمر یوں جلد چلی جائے ہے جُوں وقت غروب
دوڑتا سایۂ دیوار چلا جاتا ہے ۱۱۹۰ھ

(۱) تذکرۂ ہندی، مصحفی صفحہ ۸۰۔

مرا دنیا کا اپنی زندگانی تنگ ہے اے حاتم
جو ہم گزرے جہان سے ہم نے نہ جانا جہاں گزرا ۱۱۹۲ھ

جو مقدر تھا ہو چکا حاتم
وہ کر میں دم نہ کھو، ہوا سو ہوا ۱۱۹ھ

مرگ سے ہم دو چار بیٹھے ہیں
گور کے ہم کنار بیٹھے ہیں (غالباً ۱۱۹۶ھ)

کچھ دور نہیں منزل آٹھ باندھ کمر حاتم
تجھ کو بھی تو چلنا ہے کیا پوچھے ہے راہی سے ۱۱۹۶ھ

اور ذیل کی غزل، جو ۱۱۹۰ھ کی تخلیق ہے، شاہ حاتم کی کتاب زندگی کے آخری ورق کو پیش کرتی ہے۔ انسان موت کے دروازے پر پہنچ کر کیا کچھ سوچ سکتا ہے یا کیا سوچتا ہے اس کی جھلک اس کے چند اشعار میں نظر آ جائے گی:

جو کوئی کہ یار و آشنا ہے رخصت کی مری اسے دعا ہے
کیا بیٹھا ہے راہ میں مسافر چلنا ہی یہاں سے پس پا ہے
امروز جو ہو سکے (سو) کرلے فردا کی خبر نہیں کہ کیا ہے
معشوق تو بے وفا ہیں، پر عمر ان سے بھی زیادہ بے وفا ہے

دنیا میں تو خوب گزری حاتم
عقبیٰ میں بھی دیکھیں (اب) خدا ہے

اور اسی برس یعنی ماہ رمضان المبارک ۱۱۹۷ھ میں شاہ حاتم کا انتقال ہوا۔ مصحفی "عقد ثریا" میں لکھتے ہیں "در یک ہزار یک صد و نود و ہفت در ماہِ مبارکِ رمضان رحلت کردہ۔ فقیر تاریخِ رحلتش

چیں یافتہ ۔

حاتم آں پیسوائے اہلِ سخن　　که قدم در مقامِ فقر فشرد
حرفِ عمرش قضا بکزلکِ حک　　چون که از صفحۂ زمانہ سترد
سالِ تاریخ از خرد جُستم　　تاکہ ایں مصرعۂ بگوشم خورد
کہ بگو مصحفی چو پرسدت
آہ صد حیف شاہ حاتم مُرد

"عقد ثرّیا" کے بعد مصحفی نے "تذکرۂ ہندی" میں شاہ حاتم کی رحلت کے بارے میں یہ لکھا ہے " پیشتر ازیں در تذکرۂ فارسی احوال او معہ تاریخ رحلتش صورت تحریر یافتہ ۔ عمرش قریب بہ صد رسیدہ بود و سہ سال است کہ در شاہجہان آباد ودیعت حیات سپردہ بخدایش بیا مرزاد "[1] مصحفی کے یہ بیانات بڑے واضح ہیں ۔ ان میں ابہام یا پیچیدگی کی کوئی بات نہیں لیکن بعض مغالطوں کی وجہ سے کچھ دوسرے تذکرہ نگاروں کے علاوہ "سرگذشت حاتم" کے مؤلف ڈاکٹر محی الدین زور نے بھی جو نتیجہ اخذ کیا ہے ۔ اس سے یہ واضح بات بھی ایک مسئلہ بن گئی ہے ۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں "حاتم کی تاریخ وفات کے متعلق اُردو تذکرہ نویسوں کے بیانات میں اختلاف ہے ۔ آزاد اور حسرت موہانی نے دونوں حال پیش کر دیئے ہیں لیکن تحقیق و تفتیش نہیں کی اور نہ اپنے اوپر کوئی ذمّہ داری لی ہے ۔ بعض تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ حاتم نے ۱۱۹۶ھ میں انتقال کیا اور بعض کہتے ہیں کہ ۱۲۰۷ھ میں ۔ سب سے زیادہ تعجب اس واقعہ پر ہوتا ہے کہ مصحفی نے اپنے فارسی تذکرہ میں ایک تاریخ لکھی ہے اور اُردو میں دوسری ۔ "عقد

(۱) تذکرۂ ہندی ، مصحفی ، صفحہ ۸۱ ۔

کریا'' ۱۱۹۹ھ کا مرتبہ ہے اُس میں حاتم کی وفات کا حسب ذیل الفاظ میں ذکر کیا ہے . . . (بحوالہ بالا عبارت و قطعۂ تاریخ ' عقد ثریا' . . . مصحفی کا ''تذکرہ ہندی'' فارسی تذکرے سے دس سال بعد یعنی ۱۲۰۹ھ میں لکھا گیا تھا' اس میں حاتم کی وفات کا ذکران الفاظ میں کیا ہے --- (بحوالہ بالا عبارت ' تذکرہ ہندی) --- حیرت ہے کہ مصحفی ''تذکرۂ ہندی'' میں اپنے قدیم تذکرہ کی تاریخ کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن دونوں کے بیانات سے جو اختلاف پیدا ہوگیا ہے اس کی طرف توجہ نہیں کی! صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ حاتم ۱۲۰۷ھ میں فوت ہوئے۔ ' تذکرہ ہندی'' بعد کا لکھا ہوا ہے اس لیے اس کی تاریخ زیادہ مستند ہو سکتی ہے۔ تذکرہ فارسی کے قطعۂ تاریخ کی نسبت یہی کہا جا سکتا ہے کہ شاید اُس وقت مصحفی کو حاتم کی وفات کی غلط اطلاع مل گئی ہو۔ چونکہ وہ خود اس وقت دھلی میں نہیں تھے اور حاتم بہت ضعیف العمر ہوگئے تھے اس لیے ان کی نسبت ایسی خبر سن کر اُس پر یقین کر لینا اور قطعۂ تاریخ لکھنا بعید از قیاس نہیں۔ چونکہ آخری تذکرے وفات کے وقت حاتم کی عمر قریب سو سال کی بتاتے ہیں اس لیے بھی ہمیں ۱۲۰۷ھ کو صحیح ماننا پڑتا ہے ''(سرگذشت حاتم ' ص ۴۲-۴۳)

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ مصحفی نے دونوں تذکروں میں جو تاریخیں لکھی ہیں' وہ درست ہیں اور نہ مختلف نہیں ہیں بلکہ ایک ہی تاریخ ہے۔ اس لیے مصحفی کے بیانات میں اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مصحفی کو حاتم کی وفات کی اطلاع درست ملی تھی اور وہ اُس وقت غالباً دھلی میں ہی تھے۔ (ملاحظہ ہو ''عقد ثریا'' مرحمۂ نے کتاب کی یہ عبارت ''در ایامے کہ فقیر همراہ سلام علی خان ولد بھکاری خان کہ مشارالیہ

از پیشگاہ خلافت جہاں بانی خلعت نوازش شاہانہ برائے بندگان عالی وزیرالممالک نواب آصف الدولہ بہادر و سرھسٹن گورنر بہادر آوردہ بود درسنہ یک ھزار و یک صد و نود و ھشت صعوبت سفر کشیدہ از شاہجہاں آباد در لکھنؤ رسیدہ۔"[۱]) گویا لکھنو آنا ۱۱۹۸ھ میں ہوا۔ تیسری بات یہ کہ وفات کے وقت شاہ حاتم کی عمر ۸۶ سال سے اوپر بھی اور تذکرہ نگاروں کا اس کو قریب بہ صد کہہ دینا دُور از وہم ہیں۔ مصحفی نے بھی تذکرۂ ھندی میں اسی انداز میں "عمرش قریب بہ صد رسیدہ بود" کہا ہے۔

در اصل مغالطے کی بُنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی ہے کہ مصحفی نے اپنا تذکرۂ فارسی "عقد ثریا" ۱۱۹۹ھ میں مرّتب کیا اور تذکرۂ ھندی اس کے دس سال بعد یعنی ۱۲۰۹ھ میں مرّتب ہوا۔ اب اگر بنیاد ھی درست نہ ہو تو نتیجہ جو بھی نکلے گا اس میں غلط فہمی کا شکار ہو ہونا ھی پڑے گا۔ "عقد ثریا" کے دیباچے میں مصحفی نے اس تذکرے کا سال تالیف ۱۱۹۹ھ لکھا ہے لیکن اس تذکرے کی داخلی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل کم از کم اس سال نہیں ہوئی بلکہ چند سال بعد جا کر ہوئی ہے۔ مثلاً "عقد ثریا" میں خواجہ میر درد (متوفی ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ) کی وفات کے بارے میں لکھا ہے "چند سال است کہ جائے خود را برادر خورد محمد میر اثر تخلّص گزاشتہ رفتہ" (صفحہ ۲۷)۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ تذکرہ ۱۱۹۹ھ میں مکمل ہوگیا ہوتا تو ۱۱۹۹ھ میں وفات پانے والے شخص کے بارے میں "چند سال است" نہ لکھا جاتا۔ اب ۱۲۰۹ھ کی تالیف "تذکرۂ ھندی" میں اسی خواجہ میر درد کی وفات کے بارے میں یہ

(۱) عقد ثریا، صفحہ ۱۳، ۱۴۔

عبارت دیکھیے ''یک سال است کہ درد مہجوریس شما یافتہ و بہ نشانی علی الاطلاق واصل گشتہ'' (صفحہ ۹۳) - گویا یہ عبارت خواجہ میر درد کی وفات کے ایک سال بعد یعنی ۱۲۰۰ھ میں لکھی گئی - اس صورت میں ''عقد ثریا'' میں درد کا ذکر تذکرۂ ہندی کے بعد لکھا گیا - اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ''تذکرۂ ہندی'' کی تالیف کا سلسلہ ۱۲۰۰ھ سے شروع ہو گیا تھا اور اسے ۱۲۰۹ھ میں تکمیل تک پہنچایا گیا - اسی طرح فارسی تذکرے کی تالیف کا آغاز اگرچہ ہندی تذکرے سے پہلے (۱۱۹۹ھ) ہوا لیکن اس کی تالیف کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری رہا۔ ''عقد ثریا'' کے چند دیگر تراجم سے بھی یہی بات ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۱۹۹ھ میں مکمل نہیں ہوگیا تھا - مثلاً فصیح کے حال میں لکھا ہے ''... عمرش بست و سہ سال است اسمش حسب الاسمش دریک ہزار و دو صد و دو ازدہ ہجری داخل تذکرہ کردہ شد'' (صفحہ ۴) یعنی یہ ترجمہ ۱۲۱۲ھ میں تحریر کیا گیا - مضطر کے بارے میں (حاشیہ میں) یہ لکھا گیا ہے ''... امسال کہ سن یک ہزار و دو صد و سیزدہ ہجری عمرش بست و پنج سالہ ...'' (صفحہ ۷۲) -

اس سے یہ مفروضہ بالکل غلط ہو جاتا ہے کہ ''عقد ثریا'' اور ''تذکرۂ ہندی'' علی الترتیب ۱۱۹۹ھ اور ۱۲۰۹ھ میں تصنیف ہوئے۔ دراصل ''عقد ثریا'' کا آغاز ۱۱۹۹ھ میں ہوا اور اس کی تکمیل کچھ سال بعد ہوئی - اسی طرح ''تذکرۂ ہندی'' کی ابتدا تقریباً ۱۲۰۰ھ میں ہوئی اور اس کا اختتام ۱۲۰۹ھ میں ہو - اس کے بعد شاہ حاتم کے بارے میں مصحفی کے بیانات کو دیکھیے تو ان میں کوئی اختلاف نظر نہیں آئے گا - ''تذکرۂ ہندی'' کی عبارت یہ بتاتی ہے کہ اس میں شاہ حاتم کا ترجمہ

بھی خواجہ میر درد کے ترجمے کے ساتھ ساتھ ۱۲۰۰ھ میں ضبط تحریر میں لایا گیا۔ اور ''عقد ثریا'' کا ترجمۂ شاہ حاتم اس سے ایک سال قبل یعنی ۱۱۹۹ھ میں سپرد قلم کیا جا چکا تھا۔ اس لیے مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں تذکرہ فارسی کا حوالہ دیتے ہوئے یہ لکھا کہ ''لہذا پیشتر ازیں در تذکرۂ فارسی احوال او معہ تاریخ رحلتش صورت تحریر یافتہ۔ عمرش قریب بہ صد رسیدہ بود و سہ سال است کہ در شاہجہان آباد ودیعت حیات سپردہ خدایش بیامرزاد''۔

قاضی عبدالودود بھی شاہ حاتم کے سال وفات کے تعین کے سلسلے میں اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مصحفی کے دونوں بیانات درست ہیں۔ ان کی رائے میں ''تذکرۂ ہندی'' کا آغاز تذکرۂ فارسی کے بعد ہی ہوا ہے۔ یہ مصحفی نے لکھا ہے اور کتاب کے مندرجات سے بھی ثابت ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ تذکرۂ ہندی اور تذکرۂ فارسی کے بیانات میں اختلاف ہے، صحیح نہیں[1]۔

قاضی عبدالودود نے اپنے محولہ بالا مضمون میں شاہ حاتم کے سال وفات ۱۱۹۷ھ کی تصدیق کے سلسلے میں مکند سنگھ فارغ دہلوی شاگرد حاتم کا ایک قطعۂ تاریخ خیراتی لعل بے جگر کے تذکرے (مخطوطۂ لندن) سے نقل کیا ہے:

فارغ چو بہ جستجوئے تاریخ   گشتم بہ تلاش و فکر ہم دم
با نالہ و آہ ہاتف از غیب   گفتا ز جہاں برفت حاتم

صاحب ''سرگذشت حاتم'' کی طرح دیگر تذکرہ نگاروں نے بھی اسی غلط مفروضے کی بنا پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ڈاکٹر اشپرنگر نے فہرست کتب خانہ شاہان اودھ میں لکھا ہے ''تذکرۂ مصحفی کی

---

(۱) معاصر، جنوری ۱۹۵۲ع۔

تصنیف سے دو یا تین سال پیشتر انہوں نے انتقال کیا"[1]
گارسن دی تاسی نے ۱۲۹۱ و ۱۲۹۲ء سال وفات لکھا ہے[2] اور اسی کو
مولوی کریم الدین نے تذکرہ شعرائے ہند میں نقل کر دیا ہے (ص ۱۳۳)۔
آزاد کا ماخذ بھی یہی ہے لیکن انہوں نے ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا
ہے "مگر مصحفی نے تذکرہ فارسی میں لکھا ہے کہ ۱۱۹۶ھ میں
فوت ہوئے اور ۸۳ برس کی عمر پائی" (آب حیات ص ۱۱۹)۔ یہ سال
اور عمر بالکل غلط ہے۔ مصحفی نے صاف طور پر قطعوں میں ۱۱۹۷ھ
لکھا ہے اور ساتھ قطعہ تاریخ رحلت بھی لکھا ہے۔ عمر نہیں لکھی۔
نسّاخ نے "سخن شعرا" میں لکھا ہے کہ "سو برس سے زائد کی عمر
پائی تھی"۔ معلوم نہیں اس تحقیق کی بنیاد کیا ہے۔

شخصیت

شاہ حاتم کی شخصیت کو پہلے تو انہی کے دو شعروں کی روشنی میں
دیکھیے۔ اس کے بعد تذکرہ نگاروں کی آراء میں تلاش کرنے کی کوشش
کریں گے۔ حاتم نے ذیل کے دو اشعار میں اپنی شخصیت کی جو مختلف
تصاویر پیش کی ہیں ان میں سے ایک تصویر تو ایام شباب کی ہے جب
وہ زندگی کے ہنگاموں میں شریک تھے اور دوسری تصویر آخر عمر کی
ہے جب وہ ترک علائق کے بعد درویشی اختیار کر چکے تھے۔

(۱) اے قدر داں! کمال حاتم دیکھ
عاشق و شاعر و سپاہی ہے ۔۔۔ ۱۱۴۴ھ

(۲) شعر استادانہ و حاتم ہے بے اکانہ وضع
طبع آزادانہ و اوقات درویشانہ ہے ۔۔۔ ۱۱۰۳ھ

(۱) یادگار شعرا ترجمہ طفیل احمد مطبوعہ ہندوستانی اکیڈمی ۹۹۔
(2) Garcin de Tassy, Histoire de litterature Hindoui et Hindoustani Vol I, 1839, p 223

سپہ گری ، عاشقی مزاحی اور شاعری ، یہ گویا ایام جوانی کے وہ اوصاف ہیں جو محمد شاہی عہد کے ایک عام دنیا دار انسان ، رنگین مزاج نوجوان اور شعر و سخن کے دلدادہ فنکار میں عام طور پر پائے جاتے تھے ۔ حاتم بھی کم و بیش انہی اوصاف سے متصف تھے ۔ متذکرہ بالا پہلے شعر میں اسی قسم کی شخصیت جلوہ گر نظر آتی ہے ۔

اس کے بعد زندگی کا وہ دَور آتا ہے جب حاتم کا دل زندگی کے ہنگاموں اور دلفریبیوں سے سیر ہو چکا تھا اور درویشی اور قناعت پسندی نے اُن کی زندگی کا رُخ ہی بدل دیا تھا ۔ آزادگی اور فقر مستی کے ساتھ ساتھ یہ دَور حاتم کی شاعرانہ عظمت اور اُن کے مرتبۂ استادی کے اعتراف کا دَور بھی تھا ۔ دوسرا شعر اسی منفرد اور یگانۂ روزگار ہستی کی تصویر پیش کرتا ہے ۔ صاحب مجموعہ نغز اور صاحب طبقات الشعرائے ہند نے اسی دَور کی زندگی کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ ” بہت آزادانہ زندگی کرتا تھا ۔ اور بہت خوش مزاج اور خلیق تھا اور شام کے وقت ہمیشہ تکیہ شاہ تسلیم میں جو کہ اوپر شاہراہ راج گھاٹ کے زیر دیوار قلعہ مبارک کے واقع ہے تشریف لے جاتا تھا اور خلاف وضع آزادوں کے جامہ پہنتا تھا اور بہت پاک صاف رہتا تھا اور مسکرات کے گرد نہ پھرتا تھا اور نماز اور روزہ اور تمام شرعیات میں سخت مقیّد تھا لیکن دوپٹہ آزادانہ ٹوپی پر باندھتا تھا اور ایک لکڑی باریک اور ایک رومال کہ لباس فقیروں کا ہے اپنے ساتھ رکھتا تھا ۔ المختصر درویش تھا ، نیک دین ، صاحب یقین اور شاعر تھا باتمکین“ [1]

شاہ حاتم کی شخصیت ، اُن کے مزاج ، افعال ، اطوار اور کردار پر اکثر تذکرہ نگاروں نے روشنی ڈالی ہے اور اُن کی دل کھول کر تعریف

---

(۱) طبقات الشعرائے ہند ، مولوی کریم الدین ، صفحہ ۱۳۲ ۔

کی ہے لیکن پیشتر اس کے کہ ہم ان آراء پر نظر ڈالیں سرتاج شعرائے اردو میر تقی میرکی اس رائے کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے جو باقی سب سے الگ اور منفرد و یگانہ ہے۔ میر اپنے تذکرہ ''نکات الشعرا'' (تالیف ۱۱۶۵ھ) میں فرماتے ہیں:

''شیخ محمد حاتم، حاتم تخلص، از شاہجہاں آباد است۔ میگویند کہ من با میاں آبرو ہم طرح بودم۔ مرد ست جاہل و متمکن و متقطع وضع، دور آشنا، عما ندارد۔ دریافتہ نمیشود کہ این رنگ لہن سبب شاعری است کہ ہمچو من دیگرے نیست یا وضع او ہمین است۔ خوب است۔ ما را باینہاچہ کار۔ شعر بسیار دارد۔ دیوانش تا ردیف میم بدست آمدہ بود و پارۂ اشعار آن نگاشتہ میشود۔ نامش سم آشنائے یگانہ است''[۱]

میر نے شاہ حاتم کے بارے میں جو درشت لہجہ اختیار کیا ہے وہ ایک عام قاری کے لیے حیران کُن ہے۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو نکات الشعرا میں تنہا حاتم ہی میر کے خنجر بے داد کا نشانہ نہیں ہے، بلکہ اس مقتل میں کئی اور بے گناہ بھی کُشتۂ ستم نظر آتے ہیں جنہیں میر نے طرح طرح کے حربوں سے گھائل کیا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی ''نکات الشعرا'' کے مقدمے میں فرماتے ہیں ''نکات الشعرا کو غور سے پڑھنے کے بعد پورا یقین ہو جاتا ہے کہ میر صاحب نہایت پاک مشرب، مؤدب، مہذب، زندہ دل، یار باش، انصاف پسند اور منکسر المزاج انسان تھے۔ بے تحقیق کسی بات کا لکھنا پسند نہیں کرتے۔'' ایک طرف یہ بیان کردہ اوصاف حسنہ ہیں اور دوسری طرف میر کی شاعرانہ عظمت کا جادو ہے، جو قاری کو کسی دوسری طرف

(۱) نکات الشعرا میر تقی میر، مطبوعہ نظامی، صفحہ ۷۹۔

متوجہ ہونے کی مہلت ہی نہیں دے سکتا۔ لیکن انصاف کا تقاضا ہے
کہ حقیقت کے دوسرے رُخ کو بھی دیکھا جائے۔ شاید اس صورت
میں ان مجروحین اور مقتولین کی بے گناہی کے ثبوت میں بھی بہت کچھ
کہا جا سکے اور میر صاحب کی نام نہاد انصاف پسندی اور منکسر
المزاجی کا پردہ بھی (کم از کم ''نکات الشعرا'' کی حد تک) بخوبی فاش
کیا جا سکے۔ لیکن ہم اس موقعے پر ادبی گروہ بندیوں اور معاصرانہ
چشمکوں کے اس سلسلے کو چھیڑنا نہیں چاہتے جس کی ایک کڑی
''نکات الشعرا'' بھی ہے۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ ایک طویل مقالے کا
موضوع بن سکتا ہے[1]۔ قصّہ مختصر یہ ہے کہ میر کا تذکرہ اُن کی
زندگی کے اُس دور کی تصنیف ہے جب وہ بقول خود ؎

یہ میؔر ستم کُشتہ کسو وقت جواں تھا

اور یہ وہ زمانہ تھا جب میر کی شاعرانہ عظمت ابھی کسی گوشۂ عزلت
میں چھپی ہوئی تھی اور اُن کی شاعری پر دوسرے ستارے جگمگا رہے تھے۔
میر میں انا کا شدید احساس تو بے دماغی کی حد تک پہنچا ہوا تھا،
جو کبھی کبھی بد دماغی کی صورت بھی اختیار کر لیتا تھا، لیکن اس
زمانے میں ابھی یہ اَنا کسی کے سہارے ہی میدان عمل میں نکل سکتی
تھی۔ ''نکات الشعرا'' میں خان آرزو کی مبالغہ آمیز توصیف، اور پھر
بعد میں ''ذکر میر'' میں انھی خان آرزو کے بارے میں تلخ نوائی، میر
کے اس طرز عمل کی واضح مثال ہے۔ ''نکات الشعرا'' میں شاہ حاتم
کے علاوہ محمد یار خاکسار اور انعام اللہ خاں یقین اور بعض دوسرے

(۱) اس مسئلے پر بعض حضرات نے کچھ لکھا بھی ہے۔ ''میر و گردیزی'' مجتبیٰ هاشم نوگانوین کا مضمون مطبوعہ ''اورینٹل کالج میگزین'' بابت مئی و اگست ۱۹۴۴ع اور ''معارضۂ مظہر و آرزو'' خلیق انجم کا مضمون مطبوعہ ''نقوش'' مئی ۱۹۶۱ع اس سلسلے کے دو اہم مضمون ہیں۔

شعرا کے بارے میں جو جو گُہر افشانیاں کی گئی ہیں انہیں دیکھ کر میر کی ''انصاف پسندی'' اور ''منکسر المزاجی'' کی داد نہ دینا شاید اوروں کے مترادف سمجھا جائے گا - سچ یہ ہے کہ میر ''ستم کُشتہ'' تو بعد میں ہوئے لیکن پہلے وہ ''ستم پیشہ'' بھی رہ چکے تھے!

صاحب ''سرگذشت حاتم'' نے میر کے اس طرز عمل میں میر و سودا کی معاصرانہ چشمک کی کار فرمائی کا خیال بھی ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ وہ صاحب گُلِ رعنا کی اس رائے سے کہ ''چونکہ مرزا رفیع حاتم کے شاگرد تھے اور وہ میر صاحب کے حریف تھے کیا عجب کہ شاہ حاتم میر صاحب کو خاطر میں نہ لاتے ہوں''[1] اتفاق کرتے ہوئے میر کی میر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''وہ پہلے پہلے دلّی کے دوسرے نوجوان شعرا کی طرح حاتم کے معتقد تھے اور بعد کو محض سودا سے رشک کی بنا پر اس بوڑھے استاد سے برگشتہ ہوگئے تھے''[2]۔ ڈاکٹر زور نے خیال میں یہ شبہہ اس لیے محل نہ میں ہو جاتا ہے کہ حاتم نے ''نکات الشعرا'' کی تالیف کے ایک سال بعد ہی (۱۱۶۶ھ) ایک غزل کے دو ایک اشعار میں میر کی بے ادبی کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

تھا ابھی ہم پاس ابھی جاتا رہا اوروں کے پاس
آسمانی میں وہ لڑکا کچھ نہ کا میر ہے

مُرشد کامل سے یہ ارشاد ہے حاتم کے تئیں
بے ادب ہو جو کہ پیر استاد سے، بے پیر ہے

لیکن صاحب گُلِ رعنا اور صاحب سرگذشت حاتم کا یہ خیال اور

(۱) گُلِ رعنا، مولوی عبدالحی، صفحہ ۱۱۵ -
(۲) سرگذشتِ حاتم، ڈاکٹر زور، صفحہ ۸۱ -

شبہہ زیادہ تر قیاسات پر مبنی ہے۔ اس کی کوئی ٹھوس شہادت موجود نہیں!

شاہ حاتم کی شخصیت کے بارے میں اب ذرا دوسرے تذکرہ نگاروں کی آراء ملاحظہ ہوں۔ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی "گلشن گفتار" (تالیف ۱۱۶۵ھ) میں لکھتے ہیں: "حاتم، محمد حاتم، باشندۂ حضرت دہلی، مرد صاحب ہمّت و طبیعت عالی دارد، و بخل در دادن سخن ہرگز نہ کردہ، و دراین امر کہ فی الحقیقت سخن درست نہ مثابہ درست گوئی از حاتم بردہ صرفہ نہ دارد"[1]۔

سیّد فتح علی گردیزی تذکرہ "ریختہ گویان" (تالیف ۱۱۶۵-۱۱۶۶ھ) میں لکھتے ہیں: "اسرار معنی را ملہم محمد حاتم، حاتم۔ پر بخود می حیدو سیہ مستانہ راہ می رود، زاد بوسش شاہجہان آباد است و طبع صیر فشش نقد و قلب سخن را نقاد"[2]۔

قائم چاند پوری صاحب "مخزن نکات" (تالیف ۱۱۶۸ھ) لکھتے ہیں: "۔۔۔ بعد فوت او (نواب عمدۃ الملک) توکل روزگار نمود، با کمال آزادگی می گزارد"[3]

لچھمی نرائن شفیق "چمنستان شعرا" (تالیف ۱۱۷۵ھ) میں لکھتے ہیں: "شیخ محمد حاتم، حاتم تخلّص، عمدۂ نکتہ پردازان و علّامۂ سخن طرازان است۔ نکات رنگینش تازگی بخش دلہاے محزون و خیالات دل نشینش از ادراک معانی مشحون۔ اشعار دل آویزش گلدستہ انجمن و بہار طبعش رشک افزاے چمن است"[4]۔

---

(۱) گلشن گفتار، صفحہ ۲۵۔
(۲) ریختہ گویان، صفحہ ۴۹۔
(۳) مخزنِ نکات، صفحہ ۲۴۔
(۴) چمنستان شعرا، صفحہ ۱۳۴۔

شفیق نے اپنے تذکرے میں اپنا انتخاب کردہ کلام حاتم دینے کے بعد میر اور گردیزی کا انتخاب بھی دے دیا ہے۔ میر نے "نکات الشعرا" میں حاتم کے مندرجہ ذیل شعر کی تحریف کی ہے:

"ہائے رے درد سے ملا کیوں تھا آگے آیا مرے کیا میرا
اگر شعر من مسود۔ این چنین می گفتم:
مثلاً آنسوں میں ہوں اب میں آگے آیا مرے کیا میرا
پس گرمی این مصرع و حسن این شعر روشن است"[1]۔

شفیق اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اگرچہ مضمونش اصلی است، لیکن کلمۂ بد را بخود نسبت دادن آئین عقل بعید می نماید و طرفہ بر این کہ شیخ علی خان در تذکرۂ خود مصرع میر تقی میر را بنام حاتم نوشتہ و اصلاً اشارہ بطرف میر ننمودہ"[2]۔

تذکرۂ قدرت اللہ شوق قلمی تالیف ۱۱۸۱ھ مکتوبہ ۱۲۰۱ "حاتم متوطن دہلی معاصر میاں آبرو تا الی یومنا ہذا بقید حیات است، مرد نیست سعادہ، فہمیدہ، جہاں دیدہ ۔ ۔ ۔ ۔"[3]۔

میر حسن "تذکرۂ شعرائے اردو" (تالیف ۱۱۸۱—۱۱۹۲ھ) میں لکھتے ہیں: "شاعرے ست صاحب کمال و پسندیدہ افعال، عالی فطرت و بلند ہمت"[4]۔

مصحفی "عقد ثریا" میں لکھتے ہیں: "مرد بزرگ و جہان دیدہ و فرسودۂ روزگار است۔ عمرہا بعیش و طرب بودہ و سالہا بناز و نعمت پرورش یافتہ، حالا چون کسے نماند بسبب مصلحت وقت ہوائے زمانہ را مختلف دیدہ متوکلی و جادۂ بستی اختیار کردہ۔ از ہندی گویان قدیم

(۱) نکات الشعرا، صفحہ ۸۰۔ (۲) چمنستان شعرا صفحہ ۱۴۴۔
(۳) مجلہ اورینٹل کالج میگزین بابت مئی ۱۹۳۳ء صفحہ ۴۰۔
(۴) تذکرہ شعرائے اردو، صفحہ ۶۴۔

اس دیار یادگار است و نام نامیش از بس شہرت بسیار مذکور زبانِ صغار و کبار''[1] ۔

صاحب مجموعہ نغز اور صاحب طبقات الشعرائے ہند کی آراء پہلے پیش کی جا چکی ہیں۔ محولہ بالا آراء شاہ حاتم کے معاصرین کی ہیں۔ حمید اورنگ آبادی، گردیزی، قائم، مصحفی، شوق، میر حسن، مصحفی اور قاسم کے بیانات کی روشنی میں شاہ حاتم کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو اُن کی ذات میں یہ پہلو نمایاں ہوتے ہیں: ''مرد صاحب ہمت، عالی طبیعت، صبر بی طمع، متوکل، با کمال آزاد، عمدۂ نکتہ پردازان، علامۂ سخن طرازان، مرد سنجیدہ، فہمیدہ، جہاندیدہ، صاحب کمال، پسندیدہ افعال، عالی فطرت، بلند ہمت، مرد بزرگ، درویش، خوش مزاج، خلیق، نیک دین، صاحب یقین'' ـــــ یہ سب آراء ایک طرف اور جناب میر صاحب کی رائے دوسری طرف ! سچ ہے :

صحبت کسو سے رکھنے کا اُس کو نہ تھا دماغ
تھا میرؔ بے دماغ کو بھی کیا ملا دماغ

اور ۔ ۔ ۔

اتنی بھی بد مزاجی ہر لحظہ میرؔ تم کو
اُلجھاؤ ہے زمیں سے، جھگڑا ہے آسماں سے

یہ در اصل میر کی اُس زخم خوردہ انا کی صدائے پر درد ہے جسے میر کے نجی حالات کی مجبوریوں اور تلخیوں اور کچھ زمانے کی ستم ظریفیوں نے پھلنے پھولنے کا مناسب موقعہ نہ دیا ـــــ جس کے نتیجے میں میر ضبط و حوصلہ اور رواداری اور نیاز مندی کا وہ انداز اپنی زندگی میں پیدا نہ کر سکے جسے ایک خلوت پسند صوفی بھی عام انسانی سطح پر آ کر اختیار کر لیتا ہے ۔

(۱) عقد ثریا صفحہ ۲۳ ۔

اس کے برعکس شاہ حاتم نے بھرپور زندگی بسر کرنے اور تجربات زندگی میں سے گزرنے کے بعد درویشی اور مرد خدا کا مسلک اختیار کیا تھا اور اس رنگ کو اپنی زندگی میں جذب کر لیا تھا۔ یہ کہنا شاید بے محل نہ ہوگا کہ اس زمانے میں دہلی کے مشہور اردو شعرا میں خواجہ میر درد کے بعد شاہ حاتم ہی ایک ایسے درویش منش انسان تھے جنھوں نے دہلی کی تباہی و بربادی کے اہم اکثر مناظر بھی دیکھے، خود ان کی ذات پر نازک سے نازک تر لمحات بھی گزرے، لیکن انھوں نے در بدر کی خاک نہیں چھانی اور انتہائی ضبط و حوصلے اور صبر و سکون سے دہلی میں رہ کر حادثات روزگار کا تجربہ و مشاہدہ کیا اور درویشانہ انداز میں زندگی گزار دی۔ یہ ان دونوں بزرگوں کی روحانی و صوفیانہ تربیت اور ریاضت کا نتیجہ تھا۔ خواجہ میر درد اس معاملے میں خوش قسمت تھے کہ انھیں گھر میں ہی وہ فضا مل گئی۔ شاہ حاتم کو تلاش حق میں نکلنا پڑا اور بالآخر شاہ عادل کا سہارا انھیں بھی صوفیانہ زندگی کے ساحل مراد پر لے آیا۔ یہ حسن اتفاق بھی دلچسپ ہے کہ دونوں حضرات پہلے مرد سپاہی پیشہ تھے اور پھر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ درویشی اختیار کر لینے کے بعد انھوں نے خلوت نشینی کا مسلک اختیار نہیں کیا، بلکہ ان کی محفلوں میں دوستوں اور شاگردوں کا جھمگٹا لگا رہتا تھا۔ شاہ تسلیم کے تکیئے کی پرکیف فضا میں شاہ حاتم کی بزم آرائی کی کیفیت مجالس رنگین کی پہلی مجلس میں ہم دیکھ آئے۔ مصحفی نے دہلی کے زمانۂ قیام میں اپنے ہاں جو شاعرانہ محافل آراستہ کیں، حاتم کبھی کبھی ان میں بھی چلے جایا کرتے تھے اور وہاں نئے دنوں کی باتیں مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ مصحفی ''تذکرۂ ہندی'' میں لکھتے ہیں: '' در ایامیکہ فقیر در شاہجہان آباد طرح مشاعرہ انداختہ

اکثر بعد مغرب در مُشاعرہ قدم رنجہ می فرمود و در مجلس نشستہ زمانہ سازی خود را می ستود"[1] - اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ شاہ حاتم کی شخصیت میں کتنی کشش و جاذبیت تھی اور وہ کیسے مجلس پسند اور احباب نواز انسان تھے -!

شاہ حاتم کی وسیع المشربی اور عالی ظرفی کا ثبوت معاصرین ' احباب اور شاگردوں سے اُن کے حُسن سلوک کی صورت میں بھی ملتا ہے - انہوں نے اپنے پیش رو اساتذۂ سخن کی زمینوں میں بھی غزلیں کہی ہیں ' اپنے ہم عصروں کی زمینوں میں بھی ' حتیٰ کہ اپنے شاگردوں اور اُن شاعروں کی زمینوں میں بھی جنھوں نے اُن کے سامنے آنکھ کھولی اور گھٹنوں گھٹنوں چلنا سیکھا - یہ ظرف اساتذۂ سخن میں سے بہت ہی کم لوگوں کو ملا ہوگا - معاصر شعراء سے چشمک کا رُجحان بھی ایک عام حقیقت ہے اور حاتم بھی اس صورت حال سے دوچار ہوئے - لیکن انہوں نے جس تحمل ' بردباری اور ملائمت سے اس کا مقابلہ کیا ہے اس کی مثالیں بھی ذرا کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں - شاہ حاتم کے معاصروں میں شاکر ناجی کو ہجو گوئی میں یدّ طولیٰ حاصل تھا - بقول صاحبِ طبقات الشعرائے ہند "بہت شوخ مزاج تھا ' ہر کسی کی ہجو کرتا ' راہ چلتے سے لڑتا تھا ' ہر ایک سے بھڑتا تھا - اُس سے ہر ایک کو نجات پانی مشکل تھی - بجائے ناجی کے اگر ہاجی تخلُّص اختیار کرتا تو میرے نزدیک بہت بہتر تھا"[2] اتفاق سے یہ بھی نواب عمدۃ الملک کے نعمت خانے کے داروغہ تھے - شاہ حاتم نے ناجی کے ہجویہ انداز کے بارے میں جو اُسلوب بیان اختیار کیا ہے وہ اُن کی شخصیت کا آئینہ دار

(۱) "تذکرۂ ہندی" مصحفی ' صفحہ ۸۰ -

(۲) طبقات شعرائے ہند ' کریم الدین ' صفحہ ۱۲۰ -

ہے ۔ سلامت روی اور صلح پسندی کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے :

نہ تنہا ناصحی کو لازم طعن کرنا ہر سخن گو پر
جواب اس غزل کا حاتم نہیں کچھ کم تو کہہ لا (۱۱۳۷ھ)

— — —

سخن میں سحر ایسا سن کیے رہتا نہیں ناصحی
اُسے سمجھائے حاتم کس طرح اشعار کہہ کہہ کے (۱۱۴۲ھ)

شاہ حاتم کے شاگردوں کی تعداد بھی خاصی تھی ۔ مصحفی " تذکرۂ ہندی " میں لکھتے ہیں کہ "بعمہ سخنان بال وضع و ترتیب او را استاد مسلّم الثبوت میدانند بلکہ او خود اسامی کسانیکہ از اوّل تا آخر استفادۂ شعر ازو گرفتہ اند ، در دوسہ ورق بطریق فہرست بر پشت سر لوح دیوان خود نوشتہ ، چسپانیدہ ، تا معلوم کسان گردد کہ حاتم این قدر شاگرد داشت و درآنجملہ اسم مرزا رفیع سودا ہم کہ باتفاق ہمہ یکے از سر آمد شعرائے ہندی گویان این دیار گذشتہ ، مسطور است ۔ و الحق کہ دروغ نیست ۔ قیاس استادیش ازینجا باید کرد نیز بنا بران میر محمد تقی میر ، کہ شاعرے است جادو کار ، اکثر او را در مشاعرہ بطریق ظرافت 'واہ الشعرا' می گفت"[1] ۔

میر کا یہ طریق ظرافت معلوم نہیں ظرافت کی کون سی قسم کا حامل ہوگا ۔ بظاہر حالات تو میر اور ظرافت کا جوڑ کچھ عجیب سا ہی معلوم ہوتا ہے ۔

قاسم " مجموعہ نغز " میں کہتے ہیں : " تلامذہ بسیار داشت ۔ در دیباچۂ دیوان نام چہل و ہیچ کس از شاگردان خود رسیدۂ تحریر

(۱) " تذکرۂ ہندی " صفحہ ۸۰ ۔

ء ۔ سر آمد شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا هم دراں سلک
ک است ۔ از انصاف گستریش چه بر طرازم استاد سراپا درائت هدایت
ساں هدایت عفی الله عنهٗ می فرمودند که بارها از زبان نصفت بیان
تاد دوراں شنیدہام که این مصرعه میخواند ؎

رتبه ساگردی من نیست استاد مرا

گفت که این در حق استادئ من و ساگردئ مراست ۔''۱ ۔

مرزا رفیع سودا کے علاوہ شاہ حاتم کے شاگردوں میں عبدالحی تاباں،
سلطان شکوہ، بقا الله بقا، سعادت یار خاں رنگیں، شیخ محمد
سار، مکند سنگھ فارغ، میر محمدی بیدار، مرزا عظیم بیگ،
لله خاں یقین وغیرہ کے اسماء قابل ذکر ہیں ۔ تاباں کے بارے میں
۱۱۶۷ ھ کی ایک غزل میں کہتے ہیں :

ریختے کے فن میں ہیں ساگرد حاتم کے بہت
پر توجہ دل کی ہے ہر آن تاباں کی طرف

اباں کا یہ شعر غالباً اسی کے جواب یا اعتراف میں ہے :

اور ہی رتبہ ہوا ہے تب سے اس کے شعر کا
جب سے حاتم نے توجہ کی ہے تاباں کی طرف

الله خاں یقین اپنے استاد کے اصلاح سخن کا اعتراف یوں کرتے ہیں[۲]

نہ اصلاح کرتا اگر اپنا حاتم
یقیں اس لطافت په دیوان نہوتا

الغرض شاہ حاتم کا برتاؤ اپنے ہم عصروں اور شاگردوں کے ساتھ
روادارانہ اور خوشگوار تھا ۔ بقول ڈاکٹر زور ''ان کی طبیعت اور

(۱) '' مجموعه نغز '' صفحه ۱۸۰ ۔
(۲) قلمی نسخه، مملوکه ڈاکٹر رانا احسان الٰہی ۔

رت ذ اقتضا ھی یہ تھا کہ وہ ھر کس و نا کس کے ساتھ حمدہ پیشانی
مروت و اخلاق کے ساتھ پیش آتے۔ وہ نہ صرف میر درد کی طرح
بزرگی اور صوفیانہ روش کی وجہ سے اپنے ہم عصروں میں ممتاز
بلکہ مرزا مظہر کی طرح حسن ذرانہ دوق اور خوش طبعی کے
ث نوجوان طبقے میں بھی مقبول تھے۔ ایک طرف نواب عمدہ الملک
ر خاں اور اشرف علی خاں فغاں جیسی ظریف اور بذلہ سنج ہستیوں کا
تھا، تو دوسری طرف فادل علی شاہ اور شاہ تسلیم جیسے بے ریا
وسیوں کے فیض صحبت سے بھی بہرہ مند ہوئے تھے[1]۔

حاتم کا کلام

شاہ حاتم نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کی۔ فارسی
ں وہ مرزا صائب تبریزی کے طرز سخن سے متاثر تھے اور اردو میں
ہیں ولی دکنی نے متاثر کیا، جس کا اعتراف انھوں نے دیوان زادہ کے
دیباچے میں بھی کیا ھے۔ حاتم کی شاعری کے آغاز کا ذکر پہلے کیا
ا چکا ھے۔ یہاں مختصراً ان کے اردو و فارسی دواوین کی ترتیب کے
لسلے میں چند معروضات پیش کی جاتی ھیں۔

ڈاکٹر زور "سرگذشت حاتم" میں فرماتے ھیں کہ حاتم کا پہلا
یوان ۱۱۴۰ھ میں مرتب ھو چکا تھا[2] اس سلسلے میں انھوں نے
۱۱۴۰ھ کی ایک غزل کا یہ شعر بھی نقل کیا ھے:

تمام ھند میں دیوان کو ترے حاتم
رکھے ھے جان سے اپنی عزیز عام اور خاص

ہ شعر "دیوان زادہ مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی" میں ۱۱۴۸ھ کا ھے

---

(۱) سرگذشت حاتم، صفحہ ۴۷، ۵۰۔

(۲) سرگذشت حاتم، صفحہ ۱۰۴۔

اور یہ درست معلوم ہوتا ہے۔ البتہ اس میں شبہہ نہیں کہ ۱۱۴۰ھ تک حاتم کے کلام کا اچھا خاصا ذخیرہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ ۱۱۴۱ھ کی ایک غزل میں وہ فرماتے ہیں :

کئی دیوان کہہ چُکا حاتم
اب تلک پر زباں نہیں ہے درست

یہاں ''کہہ چکا'' سے مراد مرتبہ دیوان نہیں بلکہ غیر مرتبہ کلام ہو سکتا ہے۔ اس کے دو تین سال بعد انھوں نے اپنا دیوان مرتّب بھی کر ڈالا جس کے بارے میں دیوان زادہ کے دیباچے میں فرماتے ہیں کہ ''سیر دیوان قدیم از بست و پنج سال در بلاد ہند مشہور دارد۔'' دیباچۂ دیوان زادہ ۱۱۶۹ھ میں لکھا گیا۔ گویا ''دیوان قدیم'' ۱۱۴۴ھ میں مرتب ہو کر بلاد ہند میں مشہور ہوا۔ چنانچہ اسی زمانے (یعنی ۱۱۴۲ھ) کا یہ قطعہ دیوان حاتم کی ترتیب کا ثبوت پیش کرتا ہے :

کوئی سخن کو مرے لاتا ہی نہیں خاطر میں
واسطہ یہ ہے کہ سب ہیں مرے اشعار غلط
سر دیوان پہ حاتم کے بجا ہے کہ لکھو
نسخۂ معتبر و خوش خط و بسیار غلط

شاہ حاتم بھی اپنے ابتدائی دور شاعری میں ایہام گوئی کے رجحان سے بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ اُن کے قدیم دیوان میں ایہام گوئی کا اثر نمایاں تھا۔ پھر وہ ایک ترقی پسند شاعر کی طرح زمانے کی ہوا کا رخ دیکھ کر ایہام گوئی سے تائب ہوگئے۔ مصحفی لکھتے ہیں : ''طرزِ اوّلش در شعر بطور مضمون و ناجی و آبرو وغیرہ شعرائے ایہام بند است و طرزِ آخرش با اندازِ تازہ گویانِ حال۔''[1] قدیم دیوان کی ترتیب کے بعد تخلیق

(۱) ''عقد ثریا'' مصحفی' صفحہ ۲۳۔

شعر کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ جب میرزا مظہر جان جاناں نے ترک ایہام کی مہم چلائی اور ان کے شاگردوں، خصوصاً انعام اللہ خاں یقین نے، ہند اور معنی میں ارتباط پیدا کرکے اردو شاعری کو ایہام گوئی کی لفظی شعبدہ بازی سے نجات دلائی، تو حاتم بھی اس مہم کے ساتھ ہوگئے۔ ۱۱۶۲ھ تک حاتم کا دیوان زادہ ضخیم ہو چکا تھا:

حاتم کا آج دیوان دریا سے کم نہیں ہے
سب بحر ہیں کے اس میں ایسا ہے یہ سفینہ (۱۱۶۲ھ)

۱۱۶۵ھ میں میر نے بھی "نکات الشعرا" مرتب کیا تو انہیں ردیف میم تک دیوان حاتم ہاتھ لگا۔ ۱۱۶۸ھ میں قائم نے "مخزن نکات" مکمل کیا اور دیوان حاتم کے اشعار کی تعداد تقریباً چار ہزار بتائی۔ "کلامش صحیح است و ابیات دیوانش قریب چہار ہزار بیت از نظر گذشتہ"[2]۔ اس وقت (۶۸-۱۱۶۹ھ) شاہ حاتم نے اپنے دیوان کو از سر نو ترتیب دیا اور نئے مرتبہ دیوان کا نام "دیوان زادہ" رکھا۔ "دیوان زادہ" کی ترتیب سے بہت پہلے وہ ایہام گوئی ترک کر چکے تھے:

کہنا ہے صاف و شستہ سخن بسکہ بے تلاش
حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پر نگہ (۱۱۶۹ھ)

اور "دیوان زادہ" کی ترتیب کے دو سال بعد تک بقول شاہ حاتم ایہام گوئی کا نام و نشان نہ رہا تھا:

ان دنوں سب کو ہوا ہے صاف گوئی کا تلاش
نام کو چرچا نہیں حاتم کہیں ایہام کا (۱۱۷۱ھ)

ڈاکٹر محی الدین زور نے "سرگذشت حاتم" میں انڈیا آفس لائبریری

---

(۱) "نکات الشعرا" میر تقی میر، صفحہ ۷۹۔
(۲) "مخزن نکات" قائم چاند پوری، صفحہ ۲۳۔

کے جس نُسخے کا حوالہ دیا ہے ' وہ بقول اُن کے ۱۱۶۹ھ کا مکتوبہ ہے اور اس کو خود حاتم ہی نے نقل کیا ہے[1]۔ ''دیوان فارسی'' کے بارے میں آزاد لکھتے ہیں کہ شاہ حاتم کا ایک دیوان فارسی میں بھی ہے۔ مگر بہت مختصر۔ میں نے دیکھا وہ ۱۱۶۹ھ کا خود اُن کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ غزل ۹۰ صفحے' رباعی و فرد وغیرہ ۶ صفحے[2]۔ ''دیوان فارسی'' کے بارے میں سب سے پہلے مصحفی نے یہ لکھا ہے: ''در فارسی هم دیوان مختصرے بقدر چہار جز بطور متاخرین بیاض فرمودہ''[3] حسرت موہانی کو بھی یہ نسخہ نہیں ملا اور ڈاکٹر زور نے بھی اسے لاپتہ بتایا ہے۔

'' دیوان زادہ '' مخطوطہ رام پور کا سنہ کتابت ۱۱۸۸ھ ہے اور اس پر ۱۱۸۹ھ کے حواشی درج ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کا مخطوطہ '' دیوان زادہ '' ۱۱۹۵ھ کا مکتوبہ ہے اور اس پر ۱۱۹۷ھ تک کے حواشی دئیے گئے ہیں۔ یعنی حاتم کے سال وفات تک کا کلام اس میں شامل ہے۔ اس کی کتابت شاہ حاتم کے شاگرد مکند سنگھ فارغ دریلوی نے کی ہے۔ خاتمۂ دیوان کی عبارت یہ ہے:

'' تمام شد اختصار دیوان مخاطب دیوان زادہ من تصنیف ظہورالدین حاتم مداللہ ظلہ ' بتاریخ بیست و یکم جمادی الاخریٰ سن ۲۳ جلوس شاہ عالم بہادر مطابق ۱۱۹۵ ہجری کاتبہ کمترین شاگردان این جناب مکند سنگھ فارغ غفراللہ ذنوبہ وستّر عیوبہ''[4]۔

---

(۱) ''سرگذشت حاتم'' ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور' ص ۱۰۳ لیکن ۱۱۶۹ھ غالباً درست نہیں۔ یہ مخطوطہ در اصل ۱۱۶۹ھ کا مکتوبہ ہے اور اس میں ۱۱۷۰ھ تک کے حواشی کا اندراج ہے۔ فہرست مخطوطات انڈیا آفس لائبریری' مرتبہ بلوم ہارٹ ۱۹۲۶ع' صفحہ ۸۲ ۸۳۔

(۲) ''آب حیات'' محمد حسین آزاد' صفحہ ۱۱۸ ' ۱۱۹۔

(۳) ''عقد ثریا'' مصحفی' صفحہ ۲۳۔

(۴) دیوان زادہ' مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی' ورق ۱۵۶۔

غالباً "دیوان زادہ" کی کتابت کے فوراً بعد مکند سنگھ فارغ نے شاہ حاتم کے "دیوان فارسی" کے مختصر سے نسخے کی کتابت شروع کر دی تھی۔ یہ نسخہ علی گڑھ یونیورسٹی میں موجود ہے۔ اس نسخے کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو نے اس کے خاتمے کی جو عبارت نقل کی ہے، وہ یہ ہے :

"بہ تاریخ بست و نہم رجب المرجب سن ۲۳ جلوس شاہ عالم بہادر، موافق ۱۱۹۷ ہجری ۔ ۔ ۔ دیوان تصنیف ظہورالدین حاتم المخاطب بہ دیوان زادہ کاتبہ مکند سنگھ فارغ کمترین شاگردان آں جناب غفراللہ ذنوبہ وستر عیوبہ والسلام والا کرام"[1]۔

فارسی دیوان کے خاتمے کی تحریر میں "دیوان زادہ" کے الفاظ سے کچھ مغالطہ سا پیدا ہو جاتا ہے لیکن اگر اردو اور فارسی دونوں دواوین کے اختتامیوں کو بغور دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ اصل دیوان زادہ ۲۱ جمادی الآخر ۱۱۹۵ھ کو اختتام پذیر ہوا اور اس کے بعد فارسی دیوان کی کتابت شروع کی گئی جو ۲۹ رجب المرجب ۱۱۹۵ھ کو مکمل ہوئی۔ غالباً کاتب نے سہواً فارسی دیوان کی اختتامی عبارت میں بھی دیوان زادہ لکھ دیا۔ چونکہ دونوں نسخوں کا کاتب ایک ہی شخص ہے لہذا یہ غلطی ممکن تھی۔

شاہ حاتم نے کم و بیش ستر (۷۰) سال تک اردو شعر و ادب کی آبیاری میں حصہ لیا۔ اردو زبان اور شاعری کی تاریخ میں وہ کئی اعتبار سے منفرد و یگانہ ہیں :

(۱) حیثیت محقق لسانیات شاہ حاتم نے ۱۱۶۹ھ میں "دیوان زادہ" مرتب کیا تو اس کے ساتھ ایک مختصر سا دیباچہ بھی لکھا جس میں

(۱) بحوالہ "معاصر" جنوری ۱۹۵۲ع صفحہ ۳۷۔

غالباً پہلی بار اُردو کے لسانی مسائل کو چھیڑا گیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اُردو زبان ابھی سیال حالت میں تھی لیکن فارسی کی جگہ رفتہ رفتہ اپنا مقام بنا رہی تھی - حاتم کا یہ اقدام بہت اہم اور بر محل تھا -

(۲) بحیثیت شاعر — شاہ حاتم نے اُردو شاعری کے دو اہم ادوار میں دو مختلف شعری میلانات کا ساتھ دیا۔ اول ایہام گوئی کا اور پھر سادہ گوئی یا تازہ گوئی کا۔ اس طرح اُنھوں نے اپنے جدّت پسند یا ترقی پسند ہونے کا پورا ثبوت دیا۔ اُنھوں نے ایہام گوئی کو نہ صرف خود خیرباد کہا بلکہ دوسروں کو بھی ترک ایہام پر آمادہ کیا۔ دوسرے دور میں اُن کے کلام میں لفظ و معنی کے ارتباط سے وہی حسن اظہار و بیان نمایاں ہے جو سودا، درد اور میر کے دور کی خصوصیت ہے -

(۳) شاہ حاتم نے اپنے کلام کی ترتیب میں سنین کا التزام کرکے اُردو شاعری کا تاریخی لحاظ سے مطالعہ کرنے والوں کے لیے بڑی آسانی پیدا کر دی ہے - چونکہ اُن کی اکثر غزلیات طرحی، فرمائشی یا دوسرے شعراء (ہم عصروں و شاگردوں) کی زمینوں میں ہیں، جیسے ہر غزل کی سرخی میں واضح کر دیا گیا ہے، اس لیے ان غزلیات سے دوسرے شعراء کے کلام کا زمانہ بھی معین کیا جا سکتا ہے - اگرچہ "دیوان زادہ" کے مختلف قلمی نسخوں میں بعض سنین کا معمولی سا اختلاف بھی پایا جاتا ہے، تاہم اس سے " دیوان زادہ " کی اہمیت پر کچھ زیادہ زد نہیں پڑتی۔ اس تاریخی ترتیب سے محققین زبان کو اُردو زبان کے عہد بہ عہد ارتقا کا مطالعہ کرنے میں خاطر خواہ مدد مل سکتی ہے - شاہ حاتم آخر عمر تک اپنے کلام میں ردّ و بدل کرتے رہے - اس طرح دیوان زادہ کے مختلف نسخوں، نیز تذکروں میں شائع شدہ کلام کے تقابلی مطالعے سے زبان کی تبدیلیوں کا پتا چل سکتا ہے -

(۴) بحیثیت شاعر حاتم کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کی نمائندہ صنف سخن یعنی غزل کے علاوہ نظم میں بھی طبع آزمائی کی اور منظومات کا خاصہ سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ ڈاکٹر نور نے " سرگذشت حاتم " میں آٹھ نظموں کا ذکر کیا ہے:

(۱) حمد و نعت۔ (۲) حقہ۔ (۳) قہوہ۔ (۴) بیرنگیٔ زمانہ۔ (۵) عرضی استعفا۔ (۶) تمام واجر خاں۔ (۷) بارھویں صدی۔ (۸) حال دل۔

ان میں سے "بیرنگیٔ زمانہ" "عرضی استعفا" اور " تمام واجر خاں " تو قطعات ہیں۔ "حمد و نعت" (مثنوی) کا ٹکڑا " گلشن گفتار " مؤلفہ خان حمید اورنگ آبادی میں محفوظ رہ گیا ہے۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے مخطوطہ "دیوان زادہ" میں غزلیات اور رباعیات و قطعات کے علاوہ مندرجہ ذیل نظمیں شامل ہیں:

(۱) مخمس (۱۱۳۲ھ) ۱۱ بند، از " دیوان قدیم "۔

(۲) مخمس (۱۱۳۹ھ) ۱۱ بند، از "دیوان قدیم"۔

(۳) مخمس شہر آشوب (۱۱۴۱ھ) ۲۰ بند۔ از "دیوان قدیم"۔ " سرگذشت حاتم " میں اس نظم کا عنوان بارھویں صدی تجویز کیا گیا ہے۔

(۴) مخمس (۱۱۶۶ھ) ۷ بند، از " دیوان جدید "۔

(۵) مخمس (۱۱۸۰ھ) ۷ بند، از " دیوان جدید "۔

(۶) مسدس در توکل و قناعت (۱۱۳۶ھ) ۱۰ بند، از"دیوان قدیم"۔

(۷) سوز و گداز (۱۱۳۹ھ) ۱۰ بند (چار اشعار فی بند)، از " دیوان قدیم "۔ "سرگذشت حاتم" میں اس کا عنوان "حال دل " لکھا گیا ہے، (واسوخت کا مرادف)۔

(۸) ترجیع بند در جواب ولی، (۱۱۳۵ھ) از "دیوان قدیم"
۱۰ بند، فی بند ۱۱ و ۱۲ اشعار۔

(۹) وصف سراپا (۱۱۳۶ھ)، ۶۶ اشعار۔

(۱۰) ساقی نامہ (۱۱۶۱ھ) مثنوی، ۶۰ اشعار۔

(۱۱) وصف قہوہ (۱۱۳۹ھ) مثنوی، ۱۹ اشعار، از "دیوان قدیم"۔

(۱۲) وصف تماکو و حقہ (۱۱۳۹ھ) مثنوی، ۹۸ اشعار، از
"دیوان قدیم"۔

(۱۳) مثنوی بہاریہ (۱۱۴۷ھ) ۳۸۸ اشعار وصف روشنی تک، آگے
(ناممکل) آخری عنوان "وصف رقص"۔

مآخذ

(۱) نکات الشعراء، میر تقی میر، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں۔

(۲) گلشن گفتار، خواجہ خان حمید اورنگ آبادی، مطبوعہ ۱۳۲۹ھ۔

(۳) تذکرہ ریختہ گویاں، سید فتح علی حسینی گردیزی، مطبوعہ ۱۹۳۳ء

(۴) مخزن نکات، شیخ محمد قیام الدین قائم چاند پوری، مطبوعہ ۱۹۲۹ء۔

(۵) چمنستان شعراء، لچھمی نرائن شفیق، مطبوعہ ۱۹۲۸ء۔

(۶) تذکرہ شعرائے اُردو، میر حسن، مطبوعہ ۱۹۴۰ء۔

(۷) گلزار ابراہیم، خان خلیل علی ابراہیم، مطبوعہ ۱۹۳۴ء۔

(۸) عقد ثریا، غلام ہمدانی مصحفی، مطبوعہ ۱۹۳۴ء۔

(۹) تذکرۂ ہندی، غلام ہمدانی مصحفی، مطبوعہ ۱۹۳۳ء۔

(۱۰) گلشن ہند، مرزا علی لطف، مطبوعہ ۱۹۰۶ء۔

(۱۱) مجموعہ نغز، میر قدرت اللہ قاسم، مطبوعہ ۱۹۳۳ء۔

(۱۲) گلشن بے خار، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، مطبوعہ ۱۹۱۰ء۔

(۱۳) یادگار شعرا، سپرنگر (ترجمہ) طفیل احمد، مطبوعہ ۱۹۴۳ء -

(۱۴) طبقات شعرائے ہند، مولوی کریم الدین، مطبوعہ ۱۸۴۸ء -

(۱۵) سخن شعراء، عبدالغفور نساخ، مطبوعہ ۱۲۹۱ھ -

(۱۶) تذکرہ جلوۂ خضر، صفیر بلگرامی، مطبوعہ ۱۸۸۴ء -

(۱۷) آب حیات، محمد حسین آزاد،

(۱۸) گل رعنا، مولوی عبدالحی، مطبوعہ ۱۳۴۲ھ -

(۱۹) شعر الہند، عبدالسلام ندوی، مطبع معارف اعظم گڑھ -

(۲۰) تاریخ ادب اُردو، سکسینہ، (ترجمہ) عسکری -

(۲۱) مجالس رنگین، سعادت یار خان رنگین، مطبوعہ ۱۸۶۴ء -

(۲۲) سعادت یار خان رنگین، ڈاکٹر صابر علی خان، مطبوعہ ۱۹۵۶ء -

(۲۳) سرگذشت حاتم، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، مطبوعہ ۱۹۴۴ء -

(۲۴) دیوان زادہ، شاہ حاتم، (مخطوطہ ۱۱۹۶ھ مخزونہ پنجاب یونیورسٹی)

(۲۵) دیوان نعیم، نعیم اللہ خان (قلمی، مملوکہ ڈاکٹر راجا احسان الٰہی)-

(۲۶) انتخاب سخن، حسرت موہانی، احمد المطابع کانپور -

(۲۷) Histoire de la Litterature Hindoui et Hindoustani, M Garcin De Tassy, Paris, 1839.

(۲۸) History of Urdu Literature, Ram Babu Saksena, 1927

(۲۹) Catalogue of the Hindustani Manuscripts in the Library of the India Office, J F Blumhardt, 1926

"رسائل":

(۳۰) اورینٹل کالج میگزین -

(۳۱) ہندوستانی -

(۳۲) اُردو -

(۳۳) معاصر -

(۳۴) نقوش -

انتخاب کلام

دیوان زادہ

شاہ حاتم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ[1]

بعد حمد الٰہی و نعت رسالت پناہی معروض می دارد فقیر خاکسار[2] درویشان و خوشہ چین خرمن سخنوران، ہیچ مدان عالم، بصورت محتاج معنی، حاتم کہ از سنہ یک ہزار و یکصد و بیست و ہشت تا یک ہزار و یکصد و شصت و نہ کہ چہل سال باشد[3] بعد عمر دریں فن صرف نمودہ،

(۱) راقم نے دیباچہ "دیوان زادہ" شاہ حاتم کی تدوین کے سلسلے میں تین نسخوں کو پیش نظر رکھا ہے۔

۱۔ دیباچہ "دیوان زادہ" (مخطوطہ ۱۱۶۹ھ۔ لندن) جسے ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے مرتب کر کے "سرگذشت حاتم" مطبوعہ ۱۹۴۴ء (صفحہ ۱۲۵-۱۲۸) میں شامل کیا ہے۔

۲۔ دیباچہ "دیوان زادہ" (مخطوطہ ۱۱۸۸ھ۔ رضا لائبریری، رام پور)۔

۳۔ دیباچہ "دیوان زادہ" (مخطوطہ ۱۱۹۵ھ پنجاب یونیورسٹی لائبریری)۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے اسی نسخے کا پہلا ورق غائب ہے۔ اس لیے اس نسخے میں دیباچے کی عبارت دوسرے ورق پر یہاں سے شروع ہوتی ہے "و لفظ روبرو و رو برو کہ فعل و حرف باشد ------" راقم نے رام پور والے نسخے کے دیباچے کو بنیاد بنایا ہے اور جہاں کہیں بھی دوسرے نسخے سے اس کی عبارت میں اختلاف پیدا ہوا ہے اسے خط کشیدہ کر کے حاشیے میں ظاہر کر دیا ہے۔ اس مقصد کے لیے حاشیے میں "سرگذشت حاتم" والے دیباچے کے لیے نشان "ا" اور پنجاب یونیورسٹی والے دیباچے کے لیے نشان "ب" کا اندراج کیا گیا ہے۔

نسخہ رام پور کے دیباچے اور دیگر متعلقہ معلومات کے لیے میں اپنے دوست حامد خان حامد لیکچرار گورنمنٹ کالج لائل پور کا ممنون ہوں جو بغرض تحقیق رام پور گئے تھے اور میری فرمائش پر یہ تحفہ میرے لیے لائے۔

(۲) نسخہ ا: "خاکپائے"۔

(۳) نسخہ ا: "از سنہ یکہزار و بیست و ہشت تا یکہزار و شصت و ہشت کہ قریب چہل سال باشد" غالباً یہاں دو جگہ کاتب سے یکہزار کے بعد "یکصد" سہواً کتابت میں رہ گیا ہے۔ "سرگذشت حاتم" کے مؤلف ڈاکٹر زور اور فہرست مخطوطات انڈیا آفس کے مؤلف بلوم ہارٹ نے اسی طرح نقل کر دیا ہے۔

همور تربیت طلب و جاے استاد خالی دارد - در شعر فارسی پیرو میرزا صائب است و در ریختہ ولی را استاد میداند - اول کسے کہ دریں فن دیوان ترتیب نمود او بود فقیر[1] دیوان قدیم از بست و پنج سال در بلاد هند مشهور دارد و بعد ترتیب آن تا امروز، کہ سنہ احد عزیز الدین عالمگیر ثانی باشد، بقول فقیر[2] کہ - بیت ؎

ما را بفراغت اجل دیر رساند این عمر دراز سخت کوتاهی کرد

هر رطب و یابس، کہ از زبان این بے زبان برآمدہ، داخل دیوان قدیم نمودہ کلیات مرتب ساختہ - چنانچہ نقل آن بشمار بهرکس دشوار بود - بنا بر خاطر داشت یاران نازک طبعان[3]، از فکر قدیم و جدید کہ از مذاق[4] ماضی و حال ازو[5] خبر دهد، از هر ردیف دو سہ غزلے و از هر غزل دو سہ بیتے ورائے مناقب و مرثیہ و مخمس و مثنوی وغیرہ موقوف داشتہ[6] - منتخبے نمودہ از هزار در آوردہ، بطریق اختصار سواد بیاض نمودہ بہ دیوان زادہ مخاطب ساختہ، تا خوانندگان و نقل نویسان[7] را ملالے نیفزاید ؎[8] و اوزان و بحور نیز داخل کرد، تامبتدیان از و فایدہ بردارند - و بسرخی غزلیات مع سنہ بسنہ قسم بقید قلم آورد[9] : یکے

(۱) نسخہ ا : "و در شعر فارسی بطرز مرزا صائب و در ریختہ بطور ولی رحمهم اللہ اوقات خود بسر می برد - و هر دو را استاد می داند - و دیوان قدیم - - -"

(۲) نسخہ ا : "عالمگیر بادشاہ باشد بقول بزرگے کہ - - - بیت"

(۳) نسخہ ر : "طالبان این فن و نازک طبعان مشتاق سخن از فکر - - -"

(۴) نسخہ ا : "فراق" -

(۵) نسخہ ا : "را" -

(۶) نسخہ ا : "سوائے مرثیہ و مناقب و مخمس ساقی نامہ و مثنوی - - -"

(۷) نسخہ ا : "نقل کنندگان" -

(۸) نسخہ ا : "نیفزاید" کے بعد یہ عبارت "خیرالکلام ماقل و دل" -

(۹) نسخہ ا : "و اوزان بحور بسرخی نوشتہ تامبتدیان ازان فایدہ بردارند - و سرخی غزل مع سنہ بسنہ قسم تقسیم نمودہ" -

طرحی، دوم فرماسی، سیوم حوالی، تا تفریق آن معلوم گردد۔ و فقیر
از معاصران شاہ مبارک آبرو[1] و شرف الدین مضمون و مرزا جان جانان
مظہر و شیخ احسن اللہ و میر شاہ در ناجی و غلام مصطفی یکرنگ است[2]
و لفظ "در" و "بر" و "از" و "او"، کہ فعل و حرف باشد[3]،
بقول شاہ مبارک آبرو:

وقت جن کا ریختے کی شاعری میں صرف ہے
ان سی کہتا ہوں بوجھو حرف میرا ژرف ہے
جو کہ لاوے ریختے میں فارسی کے فعل و حرف
لغو ہیں گے فعل اس کے، ریختے میں حرف ہے

بندہ در دیوان قدیم خود تقید دارد و دریں ولا از دہ دوازدہ
سال[4] اکثر الفاظ را از نظر انداختہ۔ لسان عربی و زبان فارسی کہ
قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد و روز مرۂ دھلی کہ میرزایان ھند و
فصیحان[5] رند در محاورہ دارند منظور داشتہ[6]، زبان ہر دیار تا بہ

(۱) نسخہ ا۔ "و لفظ در و بر و از و او کہ فعل و حرف باشد پیش از قول شاہ مبارک آبرو بندہ در "دیوان قدیم" خود نداشت۔۔ و معاصران دیگر مثل شرف الدین مضمون"۔

(۲) نسخہ ا کے ناموں کی ترتیب میں ذرا سا فرق ہے۔ شاہ مبارک آبرو کا ذکر پیشتر آجانے کی وجہ سے دوبارہ نہیں لکھا گیا۔ مرزا جان جانان مظہر کا نام یکرنگ کے بعد یعنی آخر میں ہے۔

(۳) نسخہ "ا" میں یہ عبارت اسماء معاصرین سے پہلے ہے اور نسخہ "ب" میں مذکورہ بالا ترتیب کے مطابق۔

(۴) نسخہ ا۔ "و دریں ولا ایں ترتیب طلب از دہ و دوازدہ سال سوائے آن۔۔۔"

(۵) نسخہ ا: "و فصیح گویان رند"۔

(۶) نسخہ ا: میں "منظور داشتہ" کے بعد "سوائے آن زبان۔۔۔" نسخہ ب میں "داشتہ" کے بجائے "شد"۔

ہندوی کہ آں را بھاکھا گویند موقوف کردہ، محض[1] روز مرۂ کہ عام فہم و خاص پسند بود اختیار نمودہ[2]، شمۂ ازاں الفاظ کہ تقیّد دارد بہ بیان می آرد :—

چنانچہ عربی و فارسی مثلاً تسمیح را تسمی و صحیح را صحی و بیگانہ را بگانہ و دیوانہ را دوانہ و مانند آں بطور عامہ، یا متحرک را ساکن و ساکن را متحرک : چنانچہ مَرَض را مَرْض و غَرَض را غَرْض و مانند آں، یا الفاظ ہندی[3] کہ نیں و جگ و نت و نسر وغیرہ آنچہ باشد، یا لفظ ''مار'' و ''مؤا'' و ازیں قبیل کہ در وجود قباحتے لازم لازم[4] آید، یا بجائے سے ستی[5] یا آدھر را اودھر و کدھر را کیدھر کہ در آں زیادتی حرف باشد، یا بجائے پر پہ[6] یا یہاں را یاں و وہاں را واں[7] کہ در مخرج تنگ بود، یا کسر[8] و فتح و ضم در قافیہ، یا قافیہ راء فارسی با راء ہندی۔ چنانچہ گھوڑا و بورا و دھڑ و سر و مانند آں۔ مگر ہائے ہوز را بدل کردن بہ الف، کہ از عام تا خاص در محاورہ دارند۔ بندہ دریں امر بمتابعت جمہور مجبور است۔ چنانچہ بندہ را بندا و پردہ را پردا[9] و آنچہ ازیں

(۱) نسخہ ا : '' موقوف نمودہ۔ فقط روز مرہ۔۔۔ ''۔
(۲) نسخہ ر : '' اختیار کردہ و شمۂ۔۔۔ ''۔
(۳) نسخہ ا : ہندوی۔
(۴) نسخہ ا : قباحتے کی بجائے قباحت۔ '' لازم '' ایک بار نسخہ ب میں بھی '' لازم '' ایک بار۔
(۵) نسخہ ا : ستی کے بعد '' یا سیتی ''۔
(۶) نسخہ ا : '' بجائے پر پہ '' کے بعد یہ عبارت '' و تیری را تجھ (حاشیہ پر : و لفظ تجھ بعضے جا مناسب و بعضے جا غیر مناسب۔ چنانچہ تجھے و تجکو بہتر است، و تجھ چشم سے و تجھ نگاہ سے محاورہ نیست۔ بجائے ایں تیری چشم سے و تیری نگاہ سے می تواں گفت) کہ باختصار آید ''۔
(۷) نسخہ ا : '' واں '' کے بعد حاشیہ پر : '' و ہر ایک را ہر یک ''۔
(۸) نسخہ ا اور ب دونوں میں '' کسر '' کی بجائے '' کثر '' ہے۔
(۹) نسخہ ا : '' شرمندہ را شرمندا ''۔

قبیل باشد ـ و این قاعده را تا کجا شرح دهد ـ غرض که خلاف محاوره و غیر مصطلح و غلطی (کذا) روزمره و نقصان فصاحت را دخل نباشد ـ العاقل تکفی الاشاره و درین مختصر الفاظ مذکور انشاء الله تعالیٰ نخواهد بود، مگر در مثنوی قهوه و حقه وغیره اشعار دیوان قدیم ـ و اگر اتفاقاً درین مختصر باشد بر خذ ما صفا و دع ما کدر[1] نظر نموده از خطا درگذرند و انصاف را از دست ندهند، که الانسان مرکب من الخطاء و النسیان[2] واقع است ـ علیٰ نبینا الصلواة و السلام و علیٰ آله الکرام[3] ـ

(۱) نسخہ الف میں خط کشیدہ عبارت "دخل نباشد" سے "تا گفتگوے قدیم نیز" تک حاشیے میں ہے اور "در مثنوی قهوه و حقه" سے آگے یہ عبارت ہے "۔۔۔ که عمداً مرقوم نموده تا گفتگوے قدیم نیز منظر خوش‌گویان این فن و دُور نشان معانی سخن درآید ـ و اتفاقاً اگر در غزلیات باشد بر "خذ ما صفا و دع ما کدر" ملاحظه نموده ۔۔۔"

نسخہ ب میں "انشاء الله تعالیٰ نخواهد بود" کے بعد یہ عبارت ہے "مگر در اشعار دیوان قدیم که از نسخه معدوم خواهد شد و گر اتفاقاً در اشعار دیوان جدید باشد بر "خذ ما صفا و دع ما کدر" ـ

(۲) نسخہ الف: "السهو و النسیان" ـ

(۳) نسخہ الف: "والله علی التوفیق" ـ

بیٹھے سوار براق کے اوپر اور اکاس گئے اک رات
سیر کرے ست[1] کھنڈ سرگ کے اور رب سے کر آئے بات
حبر قرآن میں ان باتنکی رب نے سگری دئی بکھان[2]
چاھو دیکھ لیو تم اوسمیں اور سب بات کرو پر مان
بولے پادری پھر اور پوچھے آگے کہب کتاب ھمار
وہ ھی نبی اور آمت واکی ھوئی ھیں روزے راکھن[3] ھار
ایک ماس[4] کے روزے راکھیں ناؤں کہیں آس کا رمضان
سوجھ بات ہے دین میں تمھری عربی اسکا کرو بکھان[2]
بولے حضرت میر ربیعہ سانچے کہت کتاب تمھار
جہ ھی حکم ہے ھم لوگن کو دیکھو تم قرآن ھار
روزے ھم رمضان کے راکھت اور راکھت تھے نبی ھار
سال بھرے میں ھمرے اوپر روزے ایک مہینے کمار[5]
بولے پادری پھر اور پوچھے اور کتاب میں ہے جہ بات
آمت سے وا پیغمبر کے سب بہت راکھے کرتار
اک بھلائی کے کرنے پر دس گنا نیک[6] دئے ٹھیرائے
نیکی ایک جو کوئی کرے نیک سو دس نیکی کا پائے
بولے پادری پھر اور پوچھے اور کتاب میں ہے جہ بات
پڑھے درود وسلام نت اونپر آمت آنکی دن اور رات

---

(۱) سات آسمان ۔
(۲) بیان ۔
(۳) رکھنے والے ۔
(۴) ماہ ۔
(۵) کے ۔
(۶) ثواب ۔

ھوئیں جو لوگ انکی امت میں حکم تسہیں سودیٔ جدائے
پڑھو درود و سلام سی ہر اپنے مکھ[1] سے ادب سمائے
جواب دئیں سن میر ربیعہ ھوا ہے ھمکو حکم جدائے
بھیجیں درود و سلام نت اوپر سانچے من سے ادب سمائے
آپ درود اپر بھیجت ہے دھرتی اکاس کا سرجن ھار
اور فرشتے سگر وا کے کرت درود اوپر بیوچھار[2]
بھیجیں درود و سلام ھم اوس ناؤں پہ اونکے دئیں پران
سوچے پادری سن جھ باتیں اور روس سے کہے بجھائے[3]
باتیں سانچی ھیں عربی کی دیں انکا جھوٹا ہے بائے
دو لو یاروا ت دریاں سو جرجس سے کہے سمائے
جا ھے عربی بے مارا ھے کل جگ میں تیرا بھائے
ابی سکے جرگا جرجس آنکھیں رھی لالری[7] چھائے
لودا اوٹھ اپنی بیٹھک سے لیوں میں اب بھیا کی دائے[5]
سمجھ گئے سردار ربیعہ جرجس کر اچہت ھے وار
تڑپے ترتی جیسے علی اور جھٹ کاڑھ[6] لئے تلوار
جھپٹے جیسے سنگھ جھپٹے اور تڑپ مارا اب ھاتھ
گرا[4] مرچھ جرجس دھرتی پر موڑ گیا تلوار کے ساتھ
پھاند سوار بھئے تب ترتی میر ربیعہ بانکے سوار

---

(۱) منہ -
(۲) بوچھار -
(۳) سمجھا کر -
(۴) مرچھی -
(۵) بدلہ -
(۶) نکال لی -
(۷) بے ھوش -

سوچیں من میں نکسیں[1] باھر دل سے نکس کریں تلوار
مرحس جو حہت[2] پرلے ھونگیئے اوٹھا فوح میں دند پکار
کھل مل پڑ گئی سب رومن میں اور دوڑے لے لے ھتھیار
جھک آئے کافر دل سگرے پیدل اور اسوار
گھیرا ربیعہ کو سب نے مل چئوں اور سے[3] دند پکار
لاگ چلیں برچھن پر برچھے اور تلواروں پر تلوار
دل کے بیچ میں میر ربیعہ اکلے[4] سیر کریں تلوار
مہرہ روکیں سگرے دلکا کریں تڑپ چوں اور کووار
حسپر جھپٹیں مار گراویں جس کو ڈپٹیں بھرے پھجار
ھلہ دے دے رومی کافر چاروں اور سے جھک جھک آئیں
دھر کے ڈپٹیں جدھر ربیعہ اودھر کو کائی سے پھٹ جائیں
گھوڑا کام کرے بجلی کا تڑپ تڑپ کوندا[5] سا جائے
پل میں آوے ادھر تڑپ کے پل میں آدھر کو چمکے جائے
گرد اوڑائی آسماں کو رہیں رھی اندھریا چھائے
چمکیں برچھے اور تلواریں تارے ٹوٹت[6] پڑیں دکھائے
اکلے ربیعہ رومی دل میں ایسی کڑ تڑ دئی مچائے
سچا کھڑا ھے لسکر عربی تسکا[7] حال اب دیوں سنائے
میر یزید نے جسکھن دیکھا رومی دل میں اوٹھت غبار

---

(۱) نکلیں۔
(۲) مارے جانے۔
(۳) شور۔
(۴) اکیلے۔
(۵) چمک۔
(۶) تارے ٹوٹتے دکھائی دئے۔
(۷) جس کا۔

چمک دیکھیں اور تلواریں تب لشکر سے کہیں پکار
دوڑو او اسلام کے شیرو اور جلدی کھینچو تلوار
سی کے سنگی[1] سے سچ مانو دسری بات کری کمار
ابی سمت[2] مسلمان نے دئی گھوڑنکی باگ اوٹھائے
دڑ پڑ دڑ پڑا ت سرپٹ میں سو روس پر دھمکے آئے
جیسے چڑیں کے جھوریہر ٹوٹیں باز بھربرہ کھائے
دیسے فوج مسلمانکی رومی فوج پہ ٹوٹی آئے
اڑھے اودھر سے رومی کافر جھکے اڑائیکوا کب بار
در حملے ساری شیرن دئی رنکھیتیں[3] دھور[4] اوڑائے
برچھا پھر کیا رومن میں اور تلوار دئی پیرائی
گرد اوڑانی آسماں کو سورج رہا دھمد میں چھائے
منڈل[5] باندھ رہی گرد اوپر مانو بادر آمدے آئے
لڑ ایں شیر اور جوان بہادر سو بادر[6] گرجے للکار
برچھے چمک رہے بجلی سے کوندا چال چلے تلوار
در کھا[7] لاگ رہی لوہو کی لال برف سوجھیں اسوار
ساون بھادوں پانی برسے رہیں لہو موسلا دھار
برس بھگی ہیں لوہو کی موڑ کنول[8] سے ہیں آترات
لاشیں بچھگئیں ہیں دھرتی پر گھائل لوٹ پوٹ رہجات

(۱) ساتھی۔
(۲) سے ہی۔
(۳) میدان جنگ۔
(۴) دھول اڑانی۔
(۵) اوپر گرد بادلوں کی طرح جمع ہوگئی۔
(۶) بادل۔
(۷) لہو کا مینہ برس رہا تھا۔
(۸) پھول۔

گھوڑے نہائے گئے لوھو میں لوھو بوڑا[1] گئی تلوار
لالی پھیل رھی ھے سب رنمیں مانو پھول رھی پھلوار
کٹھن لڑائی لڑ رھے عازی سگرے گول بڑیں اررائے
حملہ روکیں بیری دل کا حملہ آپ کریں دررائے
پائیں اڑائے رنکھتین میں چوٹیں بڑھ بڑھ کریں اگار
برچھے چلیں سو کھٹ کھٹ باجیں کھچ کھچ بول رھی تلوار
مارا مار سو پڑ رھی دل میں رنمیں بیت رھا گھسام
کٹکٹ موڑ گریں دھرتی پر جیسے ڈار[2] ھلاوت آم
نگر مدینہ سے جا ھی میں لشکر آوت پڑے دکھائے
گھمرت[3] آوے محمدی جھنڈا نعرہ ھوت گول میں آئے
کمک جو بھیجی تھی گدی[4] پے جوان لڑیا چار ھزار
وحی لکھیا ھمرے نبی کے شرحابیل[5] سو تھے سردار
دیکھ لڑائی کو سوجھپٹے باگیں چھوڑ اور ایڑھ لگائے
ملگئے آئے مسلمان سے اور رومن پر پڑے اگھائے
حملہ کٹھن کرا پھر نعرے اور چشوندس لیا گھرائے
ماریں تلواریں موڑن پر اور برچھن پر لیا اٹھائے
ڈار دئیں لاشیں پر لاشین موڑن کاٹ کرا کھریان
ندی دئی بہائے رکت کی رنمیں بیت گیا گھمسان
نیچے اوپر دل کر ڈارا رگد بگد سگرا میدان

---

(۱) آگلنا -
(۲) جیسے آم گرتے ھیں -
(۳) گھومتا -
(۴) ابوبکر صدیق -
(۵) شرجیل -

اوکھڑے رومی اس حملے سے اڑے نہ پھر میدانیں پائیں[1]
بھری[2] پڑ گئی لشکر میں سگرے تری ھوئیجائیں
کوئی بھاجت ہے کھالے میں کوئی چھپے اودور میں جائے
کوئی چلا جائے سیدھا بھاجت پاچھے[3] پھر کر دیکھ نا ئے
عربی مرد مسلماں نے سب اورں گھوڑے دوڑائے
ڈھونڈ کھنڈ مارا رومن کو جیتا ایک کو چھوڑا نائے
بھاجے[4] بچاڈنہ کوئی رومی ساٹھی ماہو نات ھار - - -
مارے گئے اسر سب پانچوں اور لسکر سب آٹھ ہزار
ھونیکئی فتح مسلمان کی جیت کرے آنکی کرتار
جتنا کھیت عربی جوان نے ڈھیت رھا سب دل کمار
گھوڑے ٹمرے جو رومن کے تنکی لوٹ لیے کروائے
کوئی گھوڑا کھندے[6] لاوے اور ٹموا کوئی لاوے اوٹھائے
کوئی چلیپا رتن جڑاؤ لاوے ہٹورے[7] بھر بھر ھاتھ
چھری کٹاری کوئی لاوے کوئی برچھی لاوے ساتھ
زرھیں بکتھر لاوے کوئی اور کوئی تلواریں لائے
جتی لوٹ ملی رومن کی سو اکٹھی سب لیے کرائے
کریں صلاح تب مل آپس میں لشکر کے تینوں[8] امرائے

---

(۱) پاؤں -
(۲) فرار -
(۳) پیچھے -
(۴) بھاگ کر بچا -
(۵) مر گیا -
(۶) ھ کاٹے -
(۷) لٹکائے -
(۸) ربیعہ ، یزید ، شرجیل -

لوٹ ھے جتنی چھٹ[1] ھتھارن دیو مدینہ کو بھجوائے
دیا بھرائے سو سب اونٹں میں مال لوٹ کا جھہ ھتھیار
ساتھ کرے شداد بہادر اور پانسو دئے سوار
چل بھئے سو اُس مال کو لیکر اور اونٹں کو دیا ھنکائے
کیتے[2] دنا کی منزل کرکے دگر مدینہ پہونچے جائے
دیکھی لوٹ آوت اونٹں میں اور فتح کی سنی ھنکار
خوشی بھئے اصحاب سبی کے گھر گھر خوشی مدینہ کیار
اُٹھے پکار اللہ اکبر لاگے پڑھن درود پکار
بھیج درود نبی پر اپنے رب جن کارن بھئی[3] جیت ھمار
داخل بھئی شداد نگر میں اور گدی پر پہونچے آئے
لگی کچہری اصحابکی بیٹھے بڑے بڑے امرائے
ادب بجایا گدی پت کا سکل[4] سبھا کو کریں سلام
ندر گدارا مال لوٹ کا بیٹھ سبھا میں کریں کلام
حال حقیقت جنگ کی سگری گدی پت سے کہیں سنائے
ایسے ایسے بھئی لڑائی ایسے دئی[5] رب جیت کرائے
سنکے فتح مسلمانکی سگری سبھا خوشی ھوئیجائے
خوشی بھئی حضرت گدی پت اور شکرانہ لائے بجائے
ماتھا ٹیک دیا دھرتی پر رھگیے رب کو سیس[6] نوائے

---

(۱) سوائے۔
(۲) کئی دن۔
(۳) ھوئی ھماری جیت۔
(۴) سب۔
(۵) رب نے فتح کرا دی۔
(۶) سجدہ۔

پاک بڑا سب سے رب میرا جن جہد جیت دئی کروائے
پہلی لڑائی شام ملک کی سو یاروہیں دئی[1] سنائے
دسری لڑائی فلسطین کی سو آگے اب لکھوں دمائے
تیسری لڑائی فلسطین میں تسکا[2] آگے کروں بکھان

---

(۱) سنا دی۔
(۲) جس کا آگے بیان کروں۔

فلسطین کی لڑائی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سمرنی

مکہ نگر سہانا یارو رات دنا جہاں برسے نور
ایک تو اسمیں مندر رب کا دوجے[1] نبی کا رچا ظہور
چہوں اور سے خلقت دھاوے مکہ حج مناوس جائے
لئیں[2] بلیاں رب کے گھر کی پاپ ہرین کائی دھوئیجائے
چاند نکسن چمکا مکہ سے دن سے دن جائے بڑھت او جبار
پھیلی چاندنی سگرے جگمیں بھا[3] اوجیارا سب سنسار
دھورا[4] اوڑائے کافر لوگن اپنے مونہن پھونک لگائے
دھور جو اوچھے چاند کے اوپر لوٹ کے آنکھن میں پڑ جائے
آلو جانے کا سورج کو دیکھ اوجیارے کو گھبرائے
دھوپ نہ سوجھے چمگادر کو آنکھ ہوت[5] اندھا ہوئیجائے
دن جو نہ سوجھے آلو کو دن کو رات کہا نا جائے
دھوپ نہ دیکھے جو چمگادر سورج دوس[6] رکھا نا جائے
اندھے ہوئیگئے بیری کافر آنکھن گئی اندھریا چھائے

(۱) دوسرے۔
(۲) بلائیں لیں مراد طواف ہے۔
(۳) روشن ہوگیا۔
(۴) دھول۔
(۵) آنکھیں ہوتے ہوئے۔
(۶) قصور۔

رب کا نور حکت میں چمکا اور انکو نا پڑا دکھائے
آگ ڈاہ[1] کی مل بھڑ کاٹی پھونس بیر[2] کا ڈارا لائے
آپ جرے[3] سو آگ میں اپنی ڈاہ گئی اپنا کو کھائے
نور خدا کا سمپورن تھا کافر پڑے جریں دن رات
چاند اوجاگر ہے مکہ کا اندھے کو پر نہیں دکھات
دیں کا جھنڈا اوٹھ مکہ سے چلکر گڑھا مدینہ آئے
ملکں ملکں جائے نرا جا سب کے جھنڈے دئے گرائے
نول ہے پیغمبر کا بالا دین کا اونچا سدا نشان
پاتی لکھیں مکہ والں کو گدھی خلافت کے سردار
دیی بھیو مکہ والو پہونچے تمہیں سلام ہمار
سمروں[4] پہلے رب اپنے کو پوجن لائق جس بن نائے
نی محمد کو پھر سمروں سانچے جس سے ادب منائے
حکم دیا ہے جو اس رب نے سو اب تمہیں لکھوں سمجھائے
مانو حکم سو رب اپنے کا اور خوشی سے لاؤ بجائے
حکم دیا ہے حج کوائے[5] راہ میں آسکی لڑو اگھائے
نی محمد تھے مکہ میں جاؤں حکم جو اوترا آئے
جو لڑنا تا سے تم پر ہے سو تم مسلماں[6] کرو بچار
جع پڑے جب دین کے کارن پہلے تم باندھو تلوار

---

(۱) حسد۔
(۲) دشمنی۔
(۳) جلے۔
(۴) تعریف۔
(۵) اس نے۔
(۶) من میں۔

فوج چڑھائی ہے اب میں نے شام ملک پر حملہ ٹھان
پھونچے جائے سو شام دھورہ[1] پر اور ایک جیت لیا میدان
پکڑو اب تم هو تلواریں هوؤ لڑائی کو تیار
ساج[2] لڑائی کا سب لیکر آؤ چلے پیدل اسوار
درجے جنت کے جو چاهو رنکھیتیں میں پھونچو جائے
بیٹھے رہ هو تو پچھتے[3] هو ایسا سماں ہے پھر نائے
اوٹھو کمک پر دین اپنے کے اور کفار سے ٹھانو رار
پھونچے تمھیں سلام اب میرا سکھی تمھیں راکھے کرتار
اتنی لکھ کر بند کرا اور مہر نبی کی دئی لگائے
پتر حذافه کے عبدالله هاتھ میں تھکے دیا اگھائے[4]
لے پاتی[5] حضرت عبدالله چلھیئے ترتی قدم اٹھائے
بارہ دنا کی منزل کر کے سو مکه میں پھونچے جائے
بلوائے تب لوگ نگر کے اور سردار لئے بلوائے
پڑھا پکار کے پرمانه[6] کو سگرے لوگن دیا سنائے
عکرمه حارث سہل قریشی مکه کے تینوں امرائے
حکم سنت کھن گدی پت کا ترتی اوٹھے بھریرہ کھائے
مانا هم نے حکم خدا کا مانا ساچا نبی رسول
حکم خلیفه گدھی پت کا سر آنکھن[7] سے همیں قبول

---

(۱) قریب -
(۲) ساز -
(۳) پچھتاؤ گے -
(۴) پکڑا دیا -
(۵) چٹھی -
(۶) پروانه -
(۷) آنکھوں -

کیسا بھاگ ہے ہم لوگن کا ہم گھر میں بیٹھے رھجات
پھونچت لوگ اپے آسا کو اور ہم رھحاوت[1] پچھتاب
کارج[2] دین کا حب کوئی آوت اور رب سے ملے[3] کی داب
پہلی[4] کرت ھیں بھاگ ہے حکا اور ہم پاچھے ھیں رھحاب
اب تو ہم نا بیٹھے رہ ھیں ملیں اگلے لوگن جائے
آس رکھت ھیں رب اپے سے لکھدے انکے پاس ملائے
اتی کہہ کے سحکنی ترتی اور گھوڑں پر بھئے سوار
پانسو حوان سحا مکہ سے اور چلنے کو بھئے تیار
سجے قریشی لوگ بہادر اور سجے مخزومی حوان
کوح کرائندیا مکہ سے اور چلنے کو ہئے تیار
پھونچا حج کا اور پرمانہ[5] نگری طائف کے درمیاں
چار سو حوان تہاں سے آئے ملکر ھوئیگئے نو سو حوان
چلے مدینہ کو سب ملکر اور کہے اک ایک جوان
لڑوں اکیلا میں نو سو سے کردوں رگدنگد میدان
منزل کرکے بارہ دنکی لگر مدینہ پہوچے آئے
کمریں کھولیں تب حوانں نے گھوڑں[6] زمیں دئے اوترائے
گدھی پہ جناب حلیمہ ساتھ لیے میر اور امرائے
آئے ملی نگر سے باھر اور لسکر تر[7] پہوچے آئے

---

(۱) پچھتاتے رہ جاتے ھیں۔
(۲) کام۔
(۳) سمت لے جاتے ھیں۔
(۴) آگے والوں سے مل کر رھیں گے۔
(۵) پروانہ۔
(۶) گھوڑوں۔
(۷) نزدیک۔

آوت جسکھن گدھی پت کو لشکر نے دیکھا چتلائے
اٹھے پکار اللہ اکبر دھئے[1] سلامی ادب منائے
خوشی بھئے حضرت گدھی پت اور لشکر سے کہین سنائے
حکم دیا ہے رب نے تمکو راہ میں اسکی لڑوا گھائے
مارے جاؤ تو جنت پہوچو درجہ ملے شہادت کیار
جیت جاؤ تو مال لوٹ کا سدھ[2] کرا تمکو کرتار
کرو مقام ابہیں تم جب تو اور جڑے[3] دل غازن کیار
بیس دنا[4] تب مکہ والن رکھا مقام مدینہ دوار
پاتی لکھیں اور گدھی پت نے لکھی لڑائی راہ خدائے
نگر نگر سو ملک عرب میں هاتھن هاتھ دئیں بھجوائے
چار سو عربی جوان لڑیا پہوچے حضرموت سے آئے
اور آئے ضحاک کلابی اپنے دل کو ساتھ لوائے
حکم جنہیں پہوچا گدھی کا آئے ترت کوچ کرائے
دیس دیس لشکر آئے نگر مدینہ پہونچے آئے
جو نصلے کہئے آن لوگن کے انکے کہئے دین ایمان
راکھا دین دھرم جن اپنا جان اور مال کرا کربان[5]
پاتی پہوچت دوڑت آئے سبکا میاموہ[6] بسرائے
هیت خدا اور نبی سے راکھا هیت[7] مین جاہیں دئیں گوائے

---

(۱) سلامی دی۔
(۲) حلال کیا۔
(۳) جمع ہوئے۔
(۴) دن۔
(۵) قربان۔
(۶) سب چھوڑ کر۔
(۷) محبت۔

لڑے عمر بھر راہ خدا میں بت اوٹھ راکھا حج سے کار
لوہ چمات رہے رن چڑھ کے ھاری جگ اسے تلوار
ساکھے گئے ان مردنکے جلگ[1] ھے دھرتی آسمان
بیس دنا کے جب عرصہ میں اکھٹی ھوئیگئی فوج جوجھار[2]
آئے لشکر دیس دیس کے پہونچے نگر مدینہ دوار
تہار بھئے اوٹھ تب گدھی ہت اور لشکر کو بھئے تیار
کوچ کرا دیں اب فوجنکا سو اپنے من کرا بچار
چل بھئے ترتی فوجن ماھیں[3] دائیں بائیں چلے امرائے
نکس باھر جسے چندر اور فوجن میں پہونچے آئے
دھوم خوشی کی فوج میں پڑ گئی اللہ اکبر اٹھے پکار
آگے بڑھ بڑھ ادب نمایا اور سلامن کرے بچار
عکرمہ حارث سہل قریشی مکہ کے تسوں امرائے
اوٹھے پکار اپنے دلمیں سے سگرے لوگن کہے سنائے
لوٹ کے اب ہم گھر نا آیہیں[4] بھئیوں سنلو بچن ھمار
راہ خدا میں جانیں اپنی سو ھمنے کر دیں نیو[5] چھار
خوشی بھئے سنکے گدھی پت اور اسیس دئی سلائے
آسا ھوئے جو انکے منکی سوائے رب پوری ھوجائے
دیکھ بھال پھر فوجیں سگری اور بس اپنے سوچ بچار
حضرت عاص ابوعبیدہ تسہیں نمایا سپہ سالار

---

(۱) جب تک۔
(۲) لڑنے والے۔
(۳) میں۔
(۴) آئیں گے۔
(۵) نچھاور

سپہ سالار کے نیچے افسر عمر عاص کو دیا بنائے
نو ھزار کے دل کے اوپر جھنڈا آنکو دیا اگھائے
بول نصیحت کے پھر بولے سیکھ کی باتیں کہیں سنائے
ھو تم مکہ کے مکھیں میں سنلیو عمر عاص چتلائے[۱]
رھیو ڈرت سدا اس رب سے حسکا دوؤ حکمیں راج
لوبھ میں نہ تھی کے نا ایو[۲] سرحن ھار سے رکھیو لاج
تگ[۳] دور کھیو سنگ والن پر رھیں حبت دنرات قرآن
پڑھیں نمازیں پانچوں کھن کی اور لشکر میں دئیں اذان
اونچے اوچے مسلمانن پر دنا تمھیں سردار بنائے
تا سے ممیں گرب[۴] نجیو بڑا آپ کو گنیو نائے
جیسے اور ھیں لسکر والے تیسا آپ کو لیجیو جان
بڑا مجیو کہوں[۵] اہما کو گھٹ میں آئے گھسے شیطان
جیسے باپ دیا راکھت[۶] ھے بیٹی بیٹا پرائے بھائے
تیسے تم اپنے لشکر پر دیا کرت رھیو منلائے
تمھرے لسکر میں شامل ھیں لوگ مہاجر اور انصار
سدھ[۷] رکھیو اونکے درجہ کی دیا ھے جو اُن کو کرتار
سنگ[۸] والن سے سب کا من میں لیجیو پہلے صلاح کرائے

---

(۱) خیال سے۔
(۲) لالچ میں نہ آنا۔
(۳) تاکید۔
(۴) غرور نہ کرنا۔
(۵) کبھی۔
(۶) رکھتا ھے۔
(۷) خیال۔
(۸) ساتھ والوں سے۔

سا صلاح کوئی کام نہ کریو سو میں تمھیں کہوں سمجھائے
عکرم اور سعیدہ مجادر حارث اور سہل اسوار
تنکو رکھیو آگے دل کے بیری سے رہیو ھشیار
شام ملک ہے تمہری چڑھائی سو تم سمجھ لیو چتلائے
جائیکے پہونچو فلسطین پر اور رومن سے لڑوا گھائے
جونی داٹ برید ربیعہ وحی لکھیا گئے اگار
سو اوس داٹ[1] سے تم ناجمو جیو رستہ اللہ کیار
سپہ سالار جو حضرت عامر تنکی سدھ[2] رہیو منگوات
چاہ کمک کی جب وے راکھیں کمک اونہیں رھیو بھجوات
بڑے مقابلہ جب بیریسی لڑیو رنمیں پائیں اڑائے
قدم نا پاچھے پھر کر دھریو جب[3] لوگھٹ میں سانس سمائے
جمکر لڑیورن کہتیں[4] میں اور کٹھن کریو تلوار
ملے بھلائی دوو جگمیں راضی ھوئے وہ سرجن ھار
دیکھو دل بھاری بیریکا توسمیں نا کھیو[5] بھائے
ایسے بھاری دل سے ھمکو گدھی پت نے دیا بھڑائے
جج رسول اللہ کی پہلے دیکھی ہے تم جتیں ٹہار
تھوڑے لوگ تھے ھم ساتھ اوبکے اور بیریکا نہیں شمار
کسی مدد کری رب ھمری سو تم آنکھ سے دیکھی بھائے

---

(۱) راہ ۔
(۲) خبر رکھنا ۔
(۳) جب تک سانس رہے ۔
(۴) میدان جنگ ۔
(۵) بھائی دل میں نہ کہنا ۔

میلوں ، ٹھیلوں ، سیر تماشوں ، تکیوں ، خانقاہوں ، رقص سرود کے ہنگاموں ، موسیقی و سماع کی محفلوں اور ادب و شعر کی مجلسوں کے علاوہ کسل پورہ ربی مہارت خاں اور سرائے خواجہ بسنت سے متصل ناگل کے علاقے کی فضا بھی راگ رنگ میں بسی ہوئی ہوتی ۔ امردوں میں اللہ بندی ، رحی ، میاں ہنگا ، سلطانہ ، سرس سروپ اور رقاصاؤں اور ڈومنیوں میں نور بائی ڈومنی ، بہمانئے فیل سوار ، رقاصہ چمنی ، ادینگم ، رقاصہ دردانہ ، رام رحی ، چک مک دمانی ، کمال بائی ، اوما بائی ، پنو ، تنو اور موتی طوائف پائل کی کھنک اور طبلے کی تھاپ کے ساتھ اپنے اپنے جوہر دکھاتیں ۔ تقی بھگت باز ، شاہ داستان لطیفہ گو ، کریلا بھانڈ اور انوٹھا راگی ، اپنے اپنے اکھاڑے الگ جماتے ۔ چوک سعد اللہ کے افسانہ گو ، قصہ خواں ، حکمت پیشگاں ، اہل تنجیم و رمل اور راویان معتبر کے مجمعے جدا لگتے[1] ۔ بعض شہادتوں سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ سب فن کار اور پیشہ ور ریختہ کی غزلوں اور اشعار کو اپنے اپنے فن میں ضرور کام میں لاتے ہوں گے ۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں ایک مقام پر خواجہ میر درد کی کسی محفل میں کسبیوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے[2] ۔ لکھتے ہیں کہ مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کا گھرانا اور یہ یعنی خواجہ میر درد کا خاندان ایک محلے میں رہتے تھے ۔ ان کے والد مرحوم کے زمانے میں شاہ صاحب عالم طفولیت میں تھے ۔ ایک دن اس جلسہ میں چلے گئے اور خواجہ صاحب کے پاس جا بیٹھے ۔ ان کی مرید بہت سی کسبیاں بھی تھیں اور چونکہ اس وقت رخصت ہوا چاہتی تھیں اس لیے سب سامنے

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے مرقع دہلی از نواب درگاہ قلی خان ۔
(۲) آب حیات ، ص ۱۸۷ ۔

حاضر تھیں ۔ باوجودیکہ مولوی صاحب اس وقت بچہ تھے مگر ان کا تبسم اور طرز نظر دیکھ کر خواجہ صاحب اعتراض کو پا گئے اور کہا کہ فقیر کے نزدیک تو یہ سب مال نہیں ہیں ۔ مولوی صاحب نے کہا کہ مال نہوں کو عوام الناس میں لے کر بٹھانا کیا مناسب ہے ۔ خواجہ صاحب خاموش ہو رہے ۔ اس واقعہ میں کمسنوں کی پر درد سے جس نسبت کا پتہ چلتا ہے وہ اہل نشاط کے اس طبقہ میں ریختہ کی ترویج اور ان کے ذریعے سے سامعین نشاط کے دل و ذہن میں ہر دلعزیزی کے سمت کا پتہ دیتی ہے ۔

خواجہ میر درد کے ہاں ہر مہینے کی دوسری اور چوبیس تاریخ کو شہر کے بڑے بڑے کلاونت ، ڈوم ، گویے اور صاحب کمال اہل ذوق جمع ہوتے تھے اور معروف کی چیزیں گاتے تھے[1] ۔ اس طرح مصحفی تذکرہ ہندی گویاں میں لکھتے ہیں کہ ہر مہینے کی دوسری تاریخ کو خواجہ میر درد کے والد کے مزار پر مجلس غنا ترتیب دی جاتی تھی ۔ اُستادان فن موسیقی جو بوسیلہ بیعت ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے ۔ اس روز مزار کی مجلس میں بھی شریک ہوتے اور شہر کے خورد و بزرگ بھی سننے کے لیے آتے ۔ چنانک دست مغنی اور نے کا نہ مست نیں نواز ، نغمہ پرداری اور قانون واری کی داد پاتے اور تقریباً دن ڈھلے تک مجلس برپا رکھتے ۔

اس دور میں جب ریختہ کا طوطی بول رہا تھا ۔ مجالس غنا اور محافل سماع میں اس کے عمل دخل کا نہ ہونا تصور میں بھی نہیں آ سکتا ۔ مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اسی لیے لکھا ہے کہ

---

(۱) آب حیات ، ص ۱۸۷

(۲) تذکرہ ہندی گویاں ، ص ۹۲ ۔

جب شمس اللہ ولی کا دیوان دلی میں پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں سے لیا ۔ قدردانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا ۔ لذت نے زبان سے پڑھا گیت موقوف ہو گئے ۔ قوال معرف کی محفلوں میں انہیں کی غزلیں گانے بجانے لگے ، ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے جو طبعیت موزوں رکھتے تھے انہیں دیوان بنانے کا شوق ہوا ۔

قوالی اور موسیقی نے اردو شاعری کے پھیلاؤ میں جو کام کیا ہے اسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ انسانی طبعیت پر موسیقی کا اثر مسلم ہے ۔ اسی لیے صوفیا کے ایک طبقے نے اسے حصول معرفت میں ممد و معاون کی حیثیت دے رکھی ہے ۔ نور بائی محمد شاہ کے دربار کی ایک گائن تھی ۔ مولانا الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں لکھا ہے کہ[1] اس نے اپنے حسن و جمال، خوش آوازی ، بذلہ سنجی اور مصاحبت کی عمدہ لیاقت کے سبب محمد شاہ کے تقرب کا درجہ حاصل کر لیا تھا اور وہ تمام امرائے دربار کے دلوں پر قابض تھی ۔ ایک روز نواب روشن الدولہ کے یہاں بیٹھی تھی اور ہنسی چہل کی باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں غالباً میراں سید بھیک صاحب کی سواری جن سے نواب کو کمال عقیدت تھی ، آ پہنچی ۔ نواب نے فوراً بائی کو دوسرے کمرے میں بٹھا کر آگے سے چلمن چھڑوا دی ۔ میراں صاحب آئے اور اتفاق سے بہت دیر تک بیٹھے ۔ بائی جو ایک چلبلی اور بے چین طبیعت کی عورت تھی تنہائی میں زیادہ بیٹھنے کی تاب نہ لا کر نے ناگاہ باہر نکل آئی اور شیخ کے حضور میں جھک کر آداب بجا لائی اور عرض کی کہ لونڈی کو حکم ہو تو کچھ گائے میراں صاحب چونکہ سماع کے عاشق تھے خاموش ہو رہے ۔ بائی نے ان کی خاموشی

---

(۱) مقدمہ شعر و شاعری ، ص ۱۰۷ (وحید قریشی ایڈیشن) ۔

کو اجازت سمجھ کر یہ رباعی بہ ادت سوز و گداز کی لے میں گانی شروع کی

شیخے نہ رہے واحسنہ گفتا مستی
کز خیر گستی و بہ سر پیوستی
زن گفت چنانکہ می نمایم ہستم
تو نیز چنانکہ می نمائی ' ہستی

شیخ کی حالت اس برمحل رباعی کے سننے سے ایسی متغیر ہو گئی کہ نائی کو اپنی جسارت سے سخت نادم ہونا پڑا - باوجودیکہ نور بائی کو خاموش کر دیا گیا تھا شیخ کی شورش کسی طرح کم نہ ہوتی تھی وہ زمین پر مرغ بسمل کی طرح لوٹتے تھے اور دیواروں میں سر دے دے مارتے تھے - دیر تک یہی حال رہا اور بہت مشکل سے ہوش میں آئے -''

اس ایک واقعہ سے اہل نشاط کے موسیقی اور شاعری پر احسان عظیم کا حال معلوم ہو جاتا ہے - اردو شاعروں کے ابتدائی تذکروں میں (سوائے نواب درگاہ قلی خاں کی تصنیف مرقع دہلی کے) ارباب نشاط میں سے کسی کا قابل ذکر حال موجود نہیں ہے - البتہ مصحفی کے تذکرہ ہندی گویان میں ان کے کچھ آثار نظر آتے ہیں - ایک مقام پر لکھتے ہیں [1] کہ ایک دفعہ کسی مجلس میں دردانہ نام ایک رقاصہ اپنے رقص کا مظاہرہ کر رہی تھی - میر سعادت علی سعادت امروہوی بھی جو محمد شاہی عہد کے ایک ایہام گو شاعر تھے اس مجلس میں موجود تھے اتفاق سے ان کا بیا جوتا گم ہو گیا - بہت تلاش کیا نہ ملا - اسی وقت بدیہاً کہنے لگے

---

(۱) تذکرہ ہندی گویان ' ص ۱۱۰ -

سعادت شب تماشے میں اگر تیرا نیا جوڑا
گیا ہو جانے دے دردانہ کے بھڑووں کے سر صدقے

ایک اور طوائف کا ذکر بھی ان کے تذکرے میں ہے جو موتی تخلص کرتی تھی۔ اصل شاہجہاں آباد کی رہنے والی تھی بعد میں لکھنؤ چلی گئی تھی[1]۔ ارباب نشاط کے طبقے میں صاحب مذاق اور ذی اعتبار سمجھی جاتی تھی۔ مرزا ابراہیم بیگ مقتول جو اس زمانے کے ایک شاعر تھے اس پر عاشق تھے[2]۔ موتی کی ایک غزل بھی مصحفی نے نقل کی ہے۔ جس کا مطلع ہے ؎

گلابی رو برو ہے اور ہم ہیں
بس اب جام و سبو ہے اور ہم ہیں

خواجہ حسن، حسن اور بخشی رنڈی کے تعلق کا ذکر اس سے پہلے گزر چکا ہے۔

ریختہ نے ارباب نشاط کے منہ چڑھ کر اپنی ہر دلعزیزی اور شہرت کا سامان مہیا کیا ہے۔ بالا خانوں اور مجالس نشاط نے زبان اردو کی ترویج اور ریختہ کی ترغیب میں جو پارٹ ادا کیا ہے ہم اسے آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مصحفی کے تذکرہ ہندی گویاں کی چند شاعرات کے بعد، جن میں سے ایک طوائف کے زمرے میں تھیں، درگا پرشاد نادر اور مولوی کریم الدین کے تذکروں گلدستہ ناز، تذکرہ چمن انداز وغیرہ سے کئی کسبیوں، رنڈیوں، طوائفوں اور بازاری عورتوں کے شعر و شاعری کی طرف راغب ہونے کا پتہ ملتا ہے۔ عورتوں میں اردو کا سب سے پہلا دیوان مرتب کرنے کا شرف بھی ایک طوائف ہی کو

---

(۱) تذکرہ ہندی گویاں، ص ۲۸۱۔
(۲) تذکرہ ہندی گویاں، ص ۲۲۲۔

حاصل ہے جو جنوبی ہند کی رہنے والی تھی اور چندا تخلص کرتی تھی اس کا نام ماہ لقا بائی تھا اور وہ سر جان ملکم جیسے بلند مرتبہ انگریز اور شیر محمد خان ایمان جیسے ثقہ شاعر سے رابطہ رکھتی تھی[1]۔

انشا اللہ خان انشا نے دریائے لطافت میں ٹکسالی اُردو کے سلسلے میں جہاں شاہجہاں آباد کی حیثیت متعین کی ہے چند دوسرے بلاد مثلاً لکھنؤ، عظیم آباد اور مرشد آباد کا ذکر بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ اہل دہلی جہاں بھیجے ہیں دلی وال کہلائے ہیں اور ان کا محلہ بھی اہل دہلی کا محلہ کہلایا ہے انشا اگرچہ دلی اور لکھنؤ کے علاوہ دوسرے مقامات کے لوگوں کو "بزعم خود" اُردو داں کہتے ہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کرتے کہ باقی شہروں میں اہل دہلی ضرور پہنچے تھے اور ان کے الگ محلے بھی تھے۔ اس ضمن وہ دہلی کے بھانڈوں، بھگت بازوں، کسبیوں، مغنیوں اور مرثیہ خوانوں کا ذکر کرتے ہیں جو مرشد آباد پہنچ گئے تھے۔ ان لوگوں نے لازماً اردو کا رواج اس دور دراز علاقے میں بھی کر دیا ہوگا اور اُردو زبان و شاعری کی لذت سے اہل بنگال اس زمانے میں آشنا ہو گئے ہوں گے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ[2]۔

"پوشیدہ نماند کہ در وقت سراج الدولہ بعضے مسصد ازاں و چند نفر از بقالاں کہ بہندی بھانڈ گویند و دوسہ مغنی و دوسہ کسبی و یک دو بھگتیہ و دوسہ نان با و دہ دوازدہ مرثیہ خواں و یکدو سبزی فروش و نخود بریز بامید منافع از شاہجہاں آباد بہ مرشد آباد رفتہ بود"۔

محمد حسین آزاد نے اس بیان کو قدرے اختلاف سے بیان کیا ہے۔

---

(۱) دیکھیے مقالہ "چندا — اُردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ" از الف۔ د۔ نسیم، اورینٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۶۰ء۔

(۲) دریائے لطافت از سید انشا، ص ۷۱۔

آب حیات میں لکھے ہیں[1] کہ جب نواب سراج الدولہ مرشد آباد کے صوبہ دار ہو کر گئے تو وہ خود ان پیشہ وروں کو ساتھ لے گئے کیونکہ محمد شاہی اور اس کے پس و پیش زمانے میں جو امیر دربار سے کسی طرف جاتا تھا وہ ضروری چیزیں اور کاروبار کے آدمی دلی سے اپنے ساتھ لے جاتا تھا تاکہ ہر کام، ہر رسم، ہر بات اور کارخانے کا محاورہ وہی ہو جو دارالخلافہ کا ہے۔

"کریلا ایک پراتم بھانڈ بھی اسی طرح نواب شجاع الدولہ کے ساتھ لکھنؤ گیا تھا[2]۔ وہ دلی کا رہنے والا تھا اور اپنے فن میں صاحب کمال تھا۔ ایک دن کسی محفل میں اس کا طائفہ حاضر تھا شیخ جرأت بھی وہاں موجود تھے اس نے نقل کی۔ ایک ہاتھ میں لکڑی لے کر دوسرا ہاتھ اندھوں کی طرح بڑھاتا ٹٹول ٹٹول کر پھرنے لگا اور کہنے لگا حضور شاعر بھی اندھا شعر بھی اندھا مضمون بھی اندھا ؎

صنم سنتے ہیں تیری بھی کمر ہے

کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے

(شاہ مبارک آبرو)

شیخ صاحب بہت خفا ہوئے مگر نہ بھی سید انشا اور مرزا قتیل کے جتھے کے جز اعظم تھے گھر آ کر انھوں نے بھی اس کی ہجو کہہ دی اور خوب خاک اڑائی اسے سن کر کریلا بہت کڑوایا چنانچہ دوسرے جلسے میں پھر اندھے کی نقل کی اسی طرح لاٹھی لے کر پھرنے لگا۔ ان کی ایک غزل ہے ؎

امشب تری زلفوں کی حکایات ہے واللہ

کیا رات ہے کیا رات ہے کیا رات ہے واللہ

---

(۱) آب حیات، ص ۲۴۴۔
(۲) آب حیات، ص ۲۴۴۔

ہر بات کے لفظ پر لکڑی کا سہارا بداتا تھا کیا رات ہے کیا رات ہے
کیا رات ہے واللہ امر غزل کے ہر شعر کا دوسرا مصرع ایک ہی ڈھنگ
پر ہے چنانچہ ساری غزل کو اس طرح محفل میں پڑھتا پھرا شیخ صاحب
اور بھی غصے ہوئے اور پھر آ کر ہجو کہی ترجیع بند تھا

اگلا جھولے پگلا جھولے ساون ماس کریلا پھولے

اس کو بھی خبر ہوئی بہت تھا پھر کسی محفل میں ایک زچہ کا سوانگ
بھرا ظاہر کیا کہ اس کے پیٹ میں بھا گھس گیا ہے خود ملّا بن کر
بیٹھا اور جس طرح جنات اور سیانوں میں لڑائی ہوتی ہے اس طرح جھگڑتے
جھگڑتے بولا ارے نامراد کیوں غریب ماں کی جان کا لاگو ہوا ہے
جواب ہے تو باہر نکل آ کہ ابھی جلا کر خاک کر دوں آخر اب کی
دفعہ انہوں نے ایسی خبر لی کہ کریلا خدمت میں حاضر ہوا خطا معاف
کروائی اور کہا کہ میں اگر آسمان کے تارے توڑ لاؤں گا تو بھی اس کا
چرچا وہیں تک رہے گا جہاں تک دائرہ محفل ہے آپ کا کلام منہ سے
نکلتے ہی عالم میں مشہور ہو جائے گا اور پتھر کی لکیر ہوگا۔ کہ قیامت
تک نہ مٹے گا بس اب میری خطا معاف فرمائیے''۔

دہلی شاہ عالم ثانی کے زمانے میں اس حد تک اجڑ چکی تھی کہ
لوگ الہ آباد، لکھنؤ، مرشد آباد، عظیم آباد، فیض آباد وغیرہ کی طرف
ہجرت کر رہے تھے۔ لکھنؤ کا دربار تو خاص طور پر مرجع خلائق
خصوصاً مرجع شعرا بن چکا تھا۔ اور دہلی کے مقابلے میں یہاں فصحا کی
تعداد بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کی کسبی عورتیں زبان
شاہجہاں آباد سے سرود، پوشاک، شوخی، زبان وغیرہ میں فوقیت
حاصل کر چکی تھیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دلی کی حیثیت لکھنؤ

(۱) دریائے لطافت، ص ۶۸، ۶۹

سے کم ہو گئی تھی یا ہو رہی تھی بلکہ لکھنؤ کی روش اور فضیلت در حقیقت دہلی ہی کی مرہون منت تھی - کیونکہ یہاں جتنے صاحب سلیقہ مرد اور عورتیں آئی تھیں ان سب کا تعلق شاہجہان آباد سے ہی تھا - ان میں سپاہی پیشہ، مصاحب پیشہ، لطیفہ گو بذلہ سنج، نقال، مطرب، قصہ خوان وغیرہ سب شامل تھے - چنانچہ سید انشا اللہ خان انشا کہتے ہیں کہ

سپاہی و مصاحب پیشہ و لطیفہ گو و بذلہ سنج و نقال و مطرب و قصہ خوان دریں شہر (یعنی لکھنؤ) ہمہ از دہلی آمدہ اند - کدام کس ازیں مجمع است - کہ عمارت بزرگان او را در لکھنؤ صد سال گذشتہ باشد راقم ہیچ عمارت را کہ پنجاہ سال ہم پیش ازیں تعمیر پذیرفتہ باشد و منسوب بہ شاہجہان آباد نمی کنند، ندیدہ ام"۔

بادشاہ نے جس زمانے میں بعض عوارض کی بنا پر الہ آباد کو مستقر بنا رکھا تھا۔ دہلی کے امرائے عالی قدر نیز فصیح و بلیغ مصاحبوں اور دم سازوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے تھے ان کے علاوہ دہلی کا ہر صاحب کمال مرد جو افصح تھا اظہار فن کی ضرورت سے مجبور ہو کر یہاں کے قدر دانوں کے پاس آ گیا تھا - اور سوائے چند توکل پیشہ گوشہ نشینوں کے دہلی میں ہر طرف گورو گوبند سنگھ کی امت یعنی سکھ ہی سکھ نظر آ رہے تھے - اور جا بجا لہرا سنگھ، کھنڈر سنگھ، بھوکا سنگھ، راج سنگھ، حرمت سنگھ، ترکھان سنگھ اور بھاگ سنگھ مجلس آرا دکھائی دیتے تھے اس حالت میں دہلی میں فصحا کا ڈھونڈنا عنقا کی تلاش تھی - سید انشا نے ٹھیک کہا ہے کہ ایسی حالت میں اگر وہ فصحا جو الہ آباد میں جمع ہو گئے ہیں دعویٰ کریں کہ ہم اہل دہلی سے افصح ہیں اور ہماری طرز گفتگو، وضع پوشاک وغیرہ ان سے بہتر ہے۔

تو گردن زدنی نہیں ہوں گے اس لیے کہ شاہجہان آباد کے بدیع الزمان دو جو الہ آباد میں قیام پذیر ہے دہلی کے جھنڈا سنگھ چوہڑہ پرجو ہست دور پٹی، یا کاوی، یا چھپاں سے دہلی بہتا ہے ترجیح دینا آفتاب کی روشنی کی مانند ثابت ہے اور محتاج دلیل نہیں[1]۔ پھر انشا نے خود ہی دہلی کی زبان کی تشریح کی ہے اور کہا ہے کہ[2]۔

"بہر حال بعد تامل بسیار سفینہ و وہم این ہیچ مدان چنین معلوم می شود و مطالب کہ راست باشد کہ زبان شاہ جہاں آباد زبان اشخاص قابل مصاحبت پیشہ دربار رس و گویائی زبان پری پیکر و کلام اہل حرفہ از مسلمانان و گفتگوئے شہدہ ہا و اسباط خدم و حشم از قبیل شاگرد پیشہ امرا است تا جاروب کش ہم داخل ہمین جماعت باشد"۔

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ دہلی کے مصاحب پیشہ، دربار رس، زبان پری پیکر، شہدے، مسلمان اہل حرفہ یہاں تک کہ جاروب کش بھی زبان کے اعتبار سے ترجیح کے قابل ہیں اس بنا پر اہل دہلی کی اس زمانے میں دوسرے شہروں میں بڑی قدر بلکہ مانگ تھی۔ ایک اہل نشاط کے طائفہ ہی کو لے لیجیے اس کے افراد نام کے تو کریلا۔

سجھا، ابوٹھا، بھو، ننو، وغیرہ اور پیشہ کے بھانڈ، نقال، راگی، بھگتیہ، رقاص، وغیرہ ہیں جن سے بازاری بوباس آتی ہے لیکن اس وقت یہ بوباس بڑے بڑوں کے مشام جان کو پسند تھی۔ اور سخنہ تہذیب کا اہم جز تھی۔ دہلی، لکھنؤ، مرشد آباد جہاں کہیں دہلوی امرا کے ٹھاٹھ تھے[3]۔ ان پیشہ وروں کی بن آئی تھی۔ اور ان

---

(۱) دریائے لطافت، ص ۶۹۔
(۲) دریائے لطافت، ص ۷۱۔
(۳) اس زمانے کی دہلی کے مختلف طبقات کی گفتگو کے سلسلے میں دیکھیے

(باقی اگلے صفحہ پر)

کی محفلیں ان کی وجہ سے گل و گلزار تھیں - جن میں ریختہ کی سدا بہار تھی - نثر کے پھول اور نظم کی کلیاں ، کلام کے جھاڑ اور سخن کے فانوس ، خیال کی شمعیں اور فکر کے چراغ ، لطیفوں کی پھلجھڑیاں اور چٹکلوں کی انارکلیاں سب پر ریختہ کا رنگ روغن تھا اور حسن کی آب و تاب قائم رکھے اور بڑھانے میں اہل نشاط کا حصہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا -

اردو شاعری میں ریختی کی ایجاد بہت حد تک اس ماحول کی مرہون احسان ہے - میر عمر عیبی اور بی نورن کی جو گفتگو سید انشا اللہ خاں نے دریائے لطافت میں لکھی ہے - اس میں میر صاحب کہتے ہیں[1] کہ "سعادت یار طہماسپ کا بیٹا انوری ریختے کا آپ کو جانتا ہے رنگین تخلص ہے ایک قصہ کہا ہے اس مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے - رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے میر حسن پر زہر کھایا ہے - ہر چند اس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا - نذر میر کی مثنوی نہیں کبھی سانڈے کا تیل بیچتے ہیں - بھلا اس کو شعر کیوں کر کہیے - سارے لوگ لکھنؤ اور دلی کے رنڈی سے لے کر مرد تک اسے پڑھتے ہیں -

چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

دریائے لطافت از سید انشا اللہ خاں انشا میں: تقریر نواب عماد الملک، تقریر بھڑامل با عماد الملک، تقریر مرزا صدر الدین صفاہانی ، جواب لالہ مکتا پرشاد ، تقریر مرزا کاظم اصفہانی، جواب از مولوی عبدالفرقان ، تقریر براتی بیگم، جواب از کبیر مولوی کرم الرحمان ، تقریر نورن کسبی بامیر عمر عیبی وبائی ، جواب از عمر عیبی وبائی ، گفتگوئے شاگرد تفضل حسین با خدمت گار بادام سنگھ ، جواب از خدمت گار مذکور - اس کے علاوہ دردانہ چہارم در مصطلحات دھلی اور دردانہ پنجم در گفتگو و مصطلحات زنان دھلی بھی دیکھیے -

(۱) دریائے لطافت ، ص ۵۱-۵۲-۵۳-۵۴-۵۵-۵۶ (حاشیہ) -

سو اس عبارت رنگین نے بھی اسی طور پر قصہ کہا ہے کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسالدار مسلّم لیکن تمہارا برچھی بھالے کا چلانے والا تھا و ایسا قابل کہاں سے ہوا اور کراھی پن جو بہت مزاج میں رنڈی بازی سے آ گیا ہے تو ریختے کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے۔ اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں اور ان کے ساتھ اپنا منہ کالا کریں بھلا یہ کلام کیا ہے۔

یہاں گئے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

اور چوڑی انگیا اور نگوڑی انگیا اور مروڑی انگیا اور مرد ہو کے یوں کہے

کہیں ایسا نہ ہو کم بخت میں ماری جاؤں

اور ایک کتاب بنائی ہے اس میں رنڈیوں کی بولی لکھی ہے اوپر والیاں بالیں - اوپر والا چاند - اجلی دھوپ ، اندر والا دل ، اور سہ گانہ - دو گانہ ، یگانا ، زنانی - الاچی (یعنی) دوست - اور ملنے میں جانے کوں لطف ہے کس واسطے کہ لکھنؤ کے گانے والے بھی لونڈے ا رنڈیاں ہیں اگر لونڈے کو دیکھو تو دو پٹے بھڑولے سوانگ بنائے ہوئے داد ہیں سدھ یا جنگلا یا کافی کے سوا بھنک کان میں نہیں پڑی - عجب طرح کے بول کہ فہم میں نہیں آتے -

گدا الادم داوے کس طرح ہو جاندا دلوں

سمھال پیر دھروبا و لیلیٰ مجنوں دا

اور کپڑے بھی دیکھو تو نئی طرح کے ہیں سر میں بیریاں رکھے ہوئے اور چولی انگرکھے کی چونٹوں کے اوپر اور ازار کے پائنچے بھی ڈھیلے اور جوتا بھی نئی چودانی دار - لاحول و لا قوۃ الا باللہ اور رنڈیاں

---

(۱) آزاد نے آب حیات میں کراھی پن کی بجائے شہد پن لکھا ہے -

بھی ٹپے کے سوا گانے سے ربط ھی نہیں رکھتی ھیں -

چیرے والا یار میلا وے

مھیے والا یار میلا وے

دا جاوے محرم تما حا

کبھی تو ساڈلی ماں گر آوے

اور جالی کی کرتی اور گاح کی انگیا اور دوپٹا بھی گاج کا اور پیڑو بھی کھلا ھوا اور پائجامہ بھی بے قرینے، ڈھلے پائنچے اور ازار بند کا ڈول بھی ایسا کہ بہتی بلا اور ناچنے میں مطلق نہ بھانا نہ سین نہ ہیں اور نہ گاتے گاتے سامنے آ کے دامن پسار کے بیٹھنا ایسی پھوھڑ بے سلیقہ، سب کی سب کہ دو کوڑی کے بیر ان کے ھاتھ سے کھانے کو جی نہیں چاھتا اور جب مرے میں آویں گی تب ٹھمری گاویں گی اور ٹھمری بھی ایسی بری کہ نعوذ باللہ اس کے کیا معنی

میری گلی ہوبھیریا ھو ھتھا چڑھ کے آیو

پیا موری لوگ جاہیں سردار آیو

اور اس پھوھڑ پنے پر آپ کو گرم بھی جانتی ھیں اور ھر ایک بھلے آدمی سے ٹھٹھا کرنے کو مستعد ھو جاتی ھیں اور پھبتی بھی کہتی ھیں - مجھ کو ایک رنڈی دیکھ کر کہنے لگی - لالہ جی تم کہاں سے تشریف لائے میں نے کہا جھوٹے کی ماں کی . . . سے - کہنے لگی تم قلعی گر ھو میں نے کہا کہ تم بھی اپنی دیگ درست کروا لو قیں قیں قیں قیں قیں!

اور ایک زمانہ وہ تھا کہ بی کھمبا بائی اور بی چمنی بائی تھیں کل انار جوڑا ھے تو سبز انگیا اور سبز جوڑا ھے تو کل انار انگیا اور ٹانگوں میں تنگ ازار کمخواب کی ایسی کہ چار گھنٹے میں کھینچو تو کھچے اور نیچے ھٹے اور ناک میں نتھ اور کرتی گلے میں تکمہ خوبصورت سا

یاقوت کا یا ہیرے کا یا زمرد کا اوری بہار دے رہا ہے۔ اور اس حسن و جمال پر مارے شرم کے آنکھ اٹھا کے نہ دیکھنا اور بولنا بھی تو معقولی بولنا اور سندل طمورے بغیر کبھی نہ گانا اور لونڈے بھی ایسے کتھک کہ جن کو دیکھ کے پری بھی بھچک رہ جائے۔ سارے سر میں بال کسی کے گلے میں ماجتانی جوڑا کسی کے گلے میں طوطکی اور کسی کے گلے میں لال قطب صاحب کی املیوں کی چھاہوں بیچ جہاں دس بس نے بیٹھ کر اس کو بلایا اور ناچ شروع ہوا تہاں ہر ایک طرف ناچتے ناچتے میں نتا کے رو برو آ کر بیٹھ گئے۔ ہر ایک نے ڈب میں سے پیسے نکال کر دینے شروع کیے مثلاً چار فلوس جو تم نے دئے تو پانچ قلوس میں نے بھی دئے اس طرح سے ایک پھیرے بارہ ٹکے کما لیے اور بیٹھے بیٹھے اس عالم کے بیچ دو ٹکے تم نے ڈب میں سے نکالے تو تین ٹکے میں نے بھی نکالے اور کسی یار نے چھ پیسے کسی یار نے تین پیسے آٹھ دو ٹکے کی تلسکری دمڑی ٹکے کی پاؤ سیر کے حساب لے کے آدھی اس لونڈے کو حوالے کی اور آدھی میں ٹکڑا ٹکڑا سب یاروں نے کھایا اور کسی آب رواں کے کنارے درخت کی ڈالی میں جھولا جو پڑا ہوا ہے تو وہاں بھی دو چار پری زاد کھڑے ہیں۔ ایک طرف کوئی صاحب کمال غزل ایسی ہی کھڑا پڑھتا ہے کہ جس کے ہر ایک مصرع سے معرفت پڑی ٹپکتی ہے۔ ایک غزل کے دو شعر تو بندے کو بھی یاد ہیں؎

پردے کو الٹ کے مکھڑے سے جب یار نے جلوہ دکھلایا
تب چھپ کے بہ شکل انسانی نام اپنا محمدؐ رکھوایا
ولیل ہے وصف اس گیسو کا ابرو کو ہلال نہ کیونکہ کہوں
ماراغ کا سرمہ عرش پہ جا آنکھوں میں زور ہے کھچوایا

اور کوئی بندہ خدا کا یہ سی حرفی پڑھ رہا ہے۔

نظم (سی حرفی)

الف ۔ اللہ کو تو واحد جان

ب ۔ بدی کا تو نہ لا دل میں دھیان

ت ۔ تونی اور منی سے تو گذر

ث ۔ ثبات قدمی اعلیٰ جان

ج ۔ جی دوست پہ کر دل سے نثار

ح ۔ حیا کو سمجھ جیوں ایمان

خ ۔ خرد پر نہ ہو اتنا نازاں

دال ۔ داوار کو بھی ٹک پہنچان

ذال ۔ ذلت ہے یعنی خواهش میں

رے ۔ رب اپنے کو نہ بھول اب کے آن

ز ۔ زمانے میں رہ جوں شیر و شکر

سین ۔ سب ذرے ہیں خورشید کی شان

شین ۔ شکر اپنے خدا کا کیجیے

صاد ۔ صولت کو نہ پوج اے ناداں

ضاد ۔ ضد حشم و جاہ ہے فقر

طوئے ۔ طالب ہے خدا کا انسان

ظوئے ۔ ظالم کو نہ کہیے اچھا

عین ۔ عالم ہے خدا کی برھان

غین ۔ غنچے کی طرح تنگ نہ رہ

---

(۱) مطبوعہ دریائے لطافت میں سہ حرفی لکھا ہے جو درست نہیں ۔

ف ۔ فدا یار پہ کیجیے سو جان
قاف ۔ قدرت سے خدا کی معمور
کاف ۔ کام سے مشکل آسان
لام ۔ لازم ہے عبادت حق کی
میم ۔ مرنا ہے مری جان ندان
نون ۔ نادان سے نہ کیجیے یاری
واؤ ۔ واجب ہے سبھوں پر احسان
ھے ۔ ھدایت کی کرو جستجو
ی ۔ یقیں تیرا ہے غیر مری جاں

اردو زبان و ادب میں عورتوں کے روزمرہ اور محاورہ کے وسیع پیمانے پر دخل پانے میں ریختی کا اور ریختی میں ایک خاص طرز کی مصطلحات، الفاظ اور اسالیب کے آنے میں رنڈیوں اور کسبیوں کا بڑا حصہ ہے۔ دوسرے ارباب نشاط اور رنگیلوں، شہدوں اور بانکوں نے بھی زبان کے ایک مخصوص رنگ کے سرمایہ میں خاص اضافہ کیا ہے۔ رنگیلا کی تعریف سید انشا اللہ خان انشا نے آدم خوش اختلاط اور رنگیلا دوست، کے الفاظ میں کی ہے[1] بانکے کی تشریح میں انھوں نے کہا ہے کہ یہ ہر شہر میں ہوتے ہیں۔ اس میں دھلی کی تخصیص نہیں دکن، بنگال اور پنجاب کے شہروں میں بھی ملتے ہیں لیکن وضع تقریباً ہر جگہ ایک جیسی دیکھنے میں آتی ہے۔ کج ادائی، کج روی، خود نمائی، ان کی صفات اور ہر مونث کو مذکر ادا کرنا ان کی عادت ہے۔ چنانچہ ہماری بکری کو ہمارا بکرا کہیں گے[2]۔ عبدالحلیم شرر نے اپنے مضامین

(۱) دریائے لطافت، ص ۷۔
(۲) دریائے لطافت، ص ۲۷۔

أميـة :) سفيـان بن أميـة بن أبي سفيـان بن أميـة[1] [ ][2]
الـذى ذهـب بمـوت صلى عليـه السّلام الى أهـل الحجاز ، لا عقـب له ه

هؤلاء بنـو أميـة الأكبر بن عبد شمس ه وولـد
حبيبُ بن عبـد شمس ربيعـةَ و أمّـه فاطمـةُ بنت
الحارث بن شجنَةَ من فَهم[3] و سَمُرَةَ لامّ ولد[4] و عمراً
وامّـه من بنى سَهْم - (منهـم :) عبدُ الله بن عامر بن كُرَيْز
ابن ربيعة بن حبيب بن عبد شمس[5] و امّه دَجاجةُ بنت أسماء
ابن الصّلْت[6] عمّةُ عبد الله بن حازم السُّلَمى، وكان من فتيان قريش ،
استعمله عثمانُ [رض] على البصره فلم يزل عليها حتّى عزله معاويةُ ،
و كان من أجود العرب - (من ولده :) عبدُ الملك بن عبد الله
ولى البصرةَ أيـّام ابن الزبير و عبدُ الرّحمان[7] بن عبد الله قُتل يوم

(١) الاصابه ، رقم ٣٣٠٣ -

(٢) الاصل "سفيان بن أبى اميه بن ابى سفيان بن أميّه" ، ١٢ لعلّه مكرر وفيه اضطراب ايضاً -

(٣) وقيل الحارث بن شجنة من بنى عمرو بن قيس عَيْلان (القلقشندى، نهايه الأرب، ص ٣٦١) -

(٤) أى لأمّ ولد سوداءَ (مصعب، ص ١٣٧) -
(٥) ابن سعد، ج ٥، ص ٣٠ و ٣١ ، الاستيعاب، ص ٣٨٧، رقم ١٥٩٧ ، الاصابه ، ٦١٤٥ -
(٦) وهى دجاجه بنت أسماء بن الصّلْت بن حبيب بن حارثه بن هلال بن حَرَام بن سماك [أو سَمّال (الاشتقاق ص ١٨٧)] بن عوف بن امرئ القيس بن بُهْثه بن سُلَيْم (مصعب، ص ١٣٩ ، قب الاصابه : كتاب النساء ، رقم ٣٩٣) -
(٧) وهو عبدالرحمان الاكبر (قب مصعب، ص ١٣٩) -

الجَمَل و عبدُ الحميد بن عبد الله و هو الذى قتل ابنَ باشرةَ المُجاشعىّ فقال أبو خُرابةَ[1] : [من الطويل :]

لَعَمْرى لَقَدْ هَدَّتْ قُرَيْشٌ عُرُوشَهَا
بِأَشْمَصَ نَفَّاحِ العَشِيَّاتِ أَزْهَرَا

/و نوفل وهو عُبيدُ الله بن عبد الحميد بن عبد الكريم ابن عبد الله بن عامر قتله أبو مسلم وله يقول ثابتُ قُطْنَةَ :

[من الطويل]

أَيَذْهَبُ هَذَا الدَّهْرُ لَمْ يَسْقِ[2] نَوْفَلاً
وَ أَشْيَاعَهُ الكَأْسَ الَّتِى صَبَّحُوا بِهَا

يريد خَثْعَمَ بن زَحْرٍ الجُعْفِىّ وعمرو بن عبد الرّحمان ابن عبد الأَعْلَى[3] بن عبد الله بن عامر ولى البصرةَ و تَدورَ دخلته لهارونَ و مُسْلِمُ بن عُبَيْسِ بن كُرَيْزٍ قتله الخوارجُ[4] وعبدُ الرّحمان بن سَمُرَةَ بن حبيب[5] صاحب النّبىّ صلى الله

(١) امّا أبو خرابة فاسمه الوليد بن حنيفة (أو نهيك) من بنى ربيعة بن حنظلة (الطبرى ، ج ٢ ، ص ٣٩٣ ، الحماسة ، ج ٢ ، ص ٢٨٩) - ولعلّه أبو خُرابة بالنّون بدل الباء (الاغانى ، اشاريه : ص ٢٩٢) -

(٢) الاصل : يَسْقِ -

(٣) امّا عبد الأعلى فلم يذكره مصعب فى نسب قريش من ولد عبدالله بن عامر (مصعب ص ١٣٩) -

(٤) قتل مسلم بن عبيس يوم دولاب (الاغانى ، ج ٦ ، ص ٣ و ٤) -

(٥) الاستيعاب ، ص ٣٠٥ و ٣٠٦ ، رقم ١٦٨٣ -

عليه وسلّم وكان يحدّث عنه[1] و هو صاحبُ سجستانَ و سكة سَمُرَة بالبصره[2]
و ابنه عبيد الله الّذى غَلَبَ على البصره أيام ابن الأشعث[3] و هو
الأعوَر و ابنه عُبيدُ الله بن عُبيد الله قتله الحجّاجُ بواسط القَصَب -
هؤلاء بنو حبيب بن عبد شمس -

(و من بنى ربيعة بن عبد شمسٍ :) عُتْبَةُ و شَيْبَةُ ابنا
ربيعةَ أمّهما [هند][4] بنت المُضَرِّب من بنى عامر بن لؤيّ ، قُتلا
يوم بدر كافرين و الوليدُ بن عُتْبَةَ و أمّه [حماس][5] بنت مالك
ابن المضرّب ، قتل يوم بدر كافراً وابو حُذيفةَ[6] بن عتبة

---

(١) خلاصه تذهيب الكمال ٢٢٨ -
و قال ياقوت الحموى فى المقتضب : و عبدالرحمان بن سمره صاحب أنس (ورق ٥ و) -
(٢) و نسب ياقوت الحموى سكة بنى سمره الى عتبة بن عبدالله بن عبد الرحمان ابن سمره (معجم البلدان ، ج ٣ ص ١٠٨ ، قب البلاذرى ، ص ٣٥٢) -
(٣) و أمّا عبيد الله بن عبد الرحمان بن سمره فهو ممن خرج على الحجاج أيام ابن الاشعث (مصعب، ص ١٥٠) -
(٤) الاضافه من مصعب ، ص ١٥٢ -
و أمّا المضرّب هذا فهو عمرو بن وهب بن عمرو بن حُجير بن عبد بن معيص بن عامر بن لؤىّ (مصعب ، ص ١٥٢ و ١٥٣) -
(٥) الزياده من المحبّر ، ص ٣٠٠ و ٣٠١ -
و قيل و امّه صفيّة بنت اميّة بن حارثه بن الأوقص بن مُرّه بن هلال بن فالج بن ذكوان (مصعب ، ص ١٥٣) -
(٦) و اسمه مُهَشَم (الاستيعاب ، ص ٦٥٣ رقم ٢٨٧١ ، قب ابن هشام ١٦٥ ، ٣٨٦ ، البلاذرى ، ص ٩٠) -

وامه [فاطمة][1] [بنت][2] صفوان بن أمية بن محرث[3] شهد بدراً مع رسول الله صلى الله عليه [وسلم][4] و يقال هي صفية بنت أمية/بن حارثة بن الأوقص السلمي وقتل باليمامة شهيداً و ابنه محمد ابن أبي حذيفة ولاه علي [رض] مصر فقتل بها[5] و أبو يسار و هو محمد بن عبد الرحمان بن عبد الله أو عبيد الله بن شيبة و هم بالبلقاء. هؤلاء بنو ربيعة بن عبد شمس -

(و من بني عبدالعزى بن عبدشمس :) [أبوالعاص بن الربيع ابن عبدالعزى بن عبد شمس][6] وهو زوج زينب بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم و كنانة بن عدى بن ربيعة بن عبدالعزى وهو الذى أسر معه بزينب بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم وعرض لها هبار بن الأسود و نافع بن عبد قيس الفهرى فأهويا إليها - وعلي بن أبي العاص قتل يوم اليرموك و عبدالله بن علي بن عدى ابن ربيعة الشاعر وله يقول أبوحرابة : [من الرجز]

---

(١) الزياده من مصعب ، ص ١٥٣ و المحبر ، ص ١٣٣ ، ٢٣٧ ، ٣٠٩ -

(٢) الزياده من الهامش -

(٣) و قيل هي أم صفوان بنت صفوان بن اميه بن محرز (؟) الكنانى (مصعب ، ص ١٥٣) -

(٤) لعله سقط من الاصل سهوا -

(٥) قب المحبر ، ص ١٠٤ -

(٦) لا بد من الزياده (ابن هشام ، ص ٤٦٣ و ٤٦٩) -

و تزوج ابو العاص بن الربيع ، زينب قبل الاسلام فولدت له عليا و امامه - تزوج على بن ابى طالب رضى الله عنه امامه بعد خالتها فاطمه صلوات الله عليها - فلما كان الاسلام فرق بين ابى العاص و بين زينب - فلما أسلم ابو العاص ردها النبى صلعم بالنكاح الاول (المحبر ، ص ٥٣) -

بَنُو عَلِیّ كُلُّهُمْ سَوَاءٌ ‏ ‏ كَأَنَّهُمْ زِينِيَّةٌ جُرَاءُ

و عبدُالله بن عُمَرَ بن عبدالله بن علیّ بن عدیّ الشّاعرُ الّذی یقال له العَبْلیُّ[1] و هو القائل لهشام و حجَّ فقسَمَ فی بنی مخزوم :

[من الخفیف]

حَسَّ حَظّی أَنْ كُنْتُ مِنْ عَبْدِ شَمْسٍ
لَیْتَنِی كُنْتُ مِنْ بَنِی مَخْزُومِ
فَأَفُوزَ الْعَدَاةَ مِنْهُمْ بِسَهْمٍ
وَأَبِیعَ النِّسَاءَ مِنّی بِلُومِ[2]

/و مُحرِزُ بن حارثة بن ربیعة بن عبدالعُزّی و هوالّذی استخلفَهُ عَتّابُ بن أَسید علی مَكّه فی سفره سافرها، وبیوه بالكوفه[3]، كان من ولده العَلاءُ بن عبدالرّحمان بن محرزٍ كان علی الرّبع أیّام ابن الزُّبیر و موضعُ داره[4] دُار عیسی بن موسی الیوم - (و منهم:) عبدُ الله بن الولید ابن یزید بن عدیّ بن ربیعة بن عبد العزّی قتل یوم الجمل مع عائشة [رض] و أمّه الدّاریّة بها یُعرف - هؤلاء بنو عبدالعزّی -

(و من بنی أمیّة الأصغر بن عبد شمسٍ :) الحارث بن أمیّة

---

(۱) الاغانی، ح ۱۰، ص ۱۰۳ بعد -

(۲) فافوز العداه منهم بسهم ‏ ‏ وأبیع الأبَ الشّریفَ بلُومِ (الاغانی، ح ۱۰، ص ۱۰۳) -

(۳) الطبری، ج ۲ ص ۶۲۸ -

(۴) لعلّها سكه ابن محرز (الطّبری، ح ۲، ص ۶۲۸) -

الّذي يقال له "ابنُ عَمّلَةَ" ابن عبد شمس الشّاعر[1]. (من ولده:) عبد الله بن الحارث أدرك معاويةَ شيخاً كبيراً وورثَ دارَ عبدشمس بمكّه لأنّه كان أقعدهم فحجّ معاويةُ فى خلافته فدخل ينظر الى الدّار فخرج إليه يحجن ليضربه وقال: لا أشبع اللهُ بطنك! أما يكفيك الخلافةُ حتّى تخنى فتطلبُ الدار فخرج معاويةُ وهو يضحك[2] (ومنهم:) أبو حراب وهو محمّد بن عبدالله بن محمّد بن عبدالله ابن الحارث قتله داؤدُ بن علىّ: والثُّرَيّا بنتُ علىّ بن عبد الله بن الحارث[3] التى كان يشبّب بها/عُمَرُ بن [أبى][4] ربيعه و [كانت][5] مولاه الغريض المُغَنّى تزوّجها سُهَيْل بن عبدالرّحمان بن عوف ويقال: بل سهيل بن عبدالعزيز بن مروان وقال الشّاعرُ[6]

[ابن الحميف]

أَيُّهَا المُنكِحُ الثُّرَيّا سُهَيْلاً ... عَمْرَكَ اللهَ كَيْفَ يَجْتَمِعَانِ

فهؤلاء بنو أميّة الأصغر.

(ومن ولد عبد أميّة بن عبد شمس:) منصور بن عبد الله ابن الأحْوَص بن عبد أميّة وهم بالشام. (ومن بنى نوفل بن عبد

(١) وعبلة اسم امرأة (الاشتقاق، ص ٥١) وأمّا الحارث بن أميّة فأمه عاتكه بنت خالد (مصعب، ص ٥٠١).
(٢) الاغانى: ج ١، ص ٨٣.
(٣) ويقال بل الثّريّا بنت عبدالله بن الحارث (مصعب، ص ١٥١).
(٤) سقط كلمة "أبى" من سهوالكاتب فى الاصل.
(٥) الاصل: هو.
(٦) أى عمر بن أبى ربيعه (ديوان عمر بن ابى ربيعه: ص ٥٨٦).

شمس :) أبو العاص بن نوفل قُتل يوم بدر كافراً و خالد بن يزيد ابن عثمان بن هَبّار بن أبي العاص قتله عبدُ الله بن عليّ بالشام فهولاء بنو عبد شمس بن عبد مناف -

و ولد المُطّلبُ بن عبد مناف مَخْرَمَةَ و أبارُهْمٍ واسمه أُنَيْس و أمّهما هند بنت عمرو بن ثعلبة بن سَلول من الأنصار وأخوهما لامّهما أبو صَيْفيّ بن هاشم بن عبد مناف و هاشماً وأبا عمرو وأمها خديجةُ بنت سعيد بن سَهْم[1] و أبارُهْمٍ الأصغر وعَبّاداً وأمّها عُمَيْزَةُ[2] بنت عمرو ابن طريف الطائيّ و الحارث وأبا شِمْرانَ و مَحْضَناً وأمّهم امّ الحارث بنت الحارث من بني سَليط بن يربوع بن حنظلة و علقمة و عمرا و أمّها /عاتكة[3] بنت عمرو بن الحارث بن صُبَاح من بني ضَبّة بن أُدّ - ٢٠

(فمن بني المطّلب :) عُبَيْدَةُ و الطّفيل و الحُصين[4] بنو الحارث ابن المطّلب شهدوا بدراً مع رسول الله صلى الله وسلّم ضرب عبيدةُ على رِجْله ضربةً مات منها بالصَّفراء[5] و حُذافةُ بن الحارث قُتل يوم الفجار و عبدُ الله بن الحصين الشّاعر[6] و محمّدُ بن قيس بن مَخْرَمَةَ

---

(١) وقيل : بل خديجه بنت سعيد بن عمر بن سهم بن عمرو بن هُصيص بن كعب ابن لؤيّ (المقتضب' ورق ١٠ ط) وولدت ايضا للمطلب العاله بنت المطّلب و عاتكه بنت المطلب (مصعب ٩٢)-

(٢) الاصل : " عتره " وهو تحريف ' وقيل هي عميره ابنه طريف بن عمرو بن ثمامه (مصعب ' ص ٩٢) -

(٣) وهي عاتكه بنت عمرو بن الحارث بن صباح بن ثعلبه بن سعد بن ضبه بن ادّ (مصعب ' ص ٩٢) -

(٤) الاصل : " حصين "-

(٥) ابن هشام ' ٤٨٦ ' ٥٠٦ -

(٦) الاصابة : ج ٢ ' ٢٩٧-٢٩٨ رقم ٣٦٢٩ -

وعبدُ الله بن قيس بن مخرمة بن المطّلب وَلِيَ مكّة زمن عمر بن عبدالعزيز وجُهَيْم بن الصَّلت بن مخرمة بن المطّلب الّذى رأى الرُّؤيا يوم بدر[1] قال : كان قيس بن مخرمه بن المطّلب [ ][2] بمكّو حراء فسمع بكاؤه بالكعبه ومِسْطَحُ بن أُثَاثةَ بن عَبّاد بن المُطّلب ممّن قال الافك وقد شهد يوم بدر مسلماً[3] ورُكانةُ بن عبد يزيد بن هاشم بن المطّلب الشديدُ الّذى صرعه النّبىّ صلى الله عليه وسلّم[4] وعَلِىٌّ بن يزيد بن رُكانة كان أشدّ النّاس بَطْشاً[5] والسّائبُ ابن عُبَيْد[6] بن عبد يزيد بن هاشم بن المطّلب أُسِرَ يوم بدر وكان يشبّه بالنّبىّ صلّى الله عليه وسلّم/(ومن ولده :) عيّاشٌ وعلىٌّ وشافعٌ (ومن بنى شافع :) الشّافعىُّ الفقيه وهو محمّد بن إدريس ابن العبّاس بن عثمان بن شافع بن السّائب بن عبيد بن عبد يزيد بن هاشم

(١) ابن هشام ، ص ٤٣٧ -

(٢) الاصل : " ولى مكّة زمن عمر بن " فهو سهو الكاتب -

(٣) وشهد مسطح بدرا و المشاهد كُلّها (ابن هشام، ص ٤٨٦ ، ٧٣٦ ، الاستيعاب ص ٢٩٤ رقم ١٢٣٩)-

(٤) ابن هشام، ص ٢٥٨- ويقال ان الّذى صرعه رسول الله صلعم يزيد بن ركانه (الاشتقاق ، ص ٥٣) -

(٥) وقيل : وكان علىٌّ هذا أشدّ النّاس صحراً فيضرب به المثل للشئ اذا كان ثقيلا " أثقل من فحر ابن ركانه " (مصعب ، ٩٦) -

(٦) الاشتقاق ، ص ٥٣ ، ارشاد الأريب ، ج ٦ ، ص ٣٦٧-٣٦٨ ، وقيل : بل هوالسائب بن عبيده بن عبد يزيد (المقتضب ، ورق ٤ ط) فهو سهو - و ذكره ابن حبيب من المشبهين بالنّبىّ صلعم و قال : السّائب بن عبد يزيد بن المطّلب بن هاشم بن عبد مناف (المحبر ، ص ٤٦) فهو خطأ واضح -

ابن المطّلب[1] و عمرو بن علقمة بن المطّلب الّذى قتله خداش ابن عبدالله بن ابى قيس من بنى عامر بن لؤىّ وكان فيه القسامه والسرّ[2]، وكان يقال لعبد يزيد بن هاشم "المحض لا قذى فيه" لأنّ أمّه الشّفاء بنت هاشم بن عبد مناف - هؤلاء بنو المطّلب بن عبد مناف -

و ولد نوفل بن عبد مناف عديّا وأمّه[3] هند بنت نسيب بن زيد من بنى مازن بن منصور بن عكرمة بن خصفة و عمراً و عبد عمرو و امّها قلابة بنت جابر بن نصر بن مالك ابن حسل بن عامر بن لؤىّ[4] و عامراً و امّه كهيّمه[5] بنت جندل[6] ابن أبير بن نهشل بن دارم - (فمنهم:) مطعم[7] بن عدىّ بن نوفل كان سيّداً وفيه يقول أبو طالب : [من الطّويل]

(١) وذكره ياقوت الحموى فى نسب الامام الشافعى (ارشاد، ج ٦، ص ٣٦٧-٣٦٨) و قال : . ابن هاشم بن عبدالمطلب . . وهوسهو -

(٢) قد ذكر قصته مصعب و ابن حبيب (مصعب، ص ٩٧، المحبر، ص ٣٣٥ - ٣٣٦)-

(٣) وقيل أمه أم الخيار هند بنت وهب بن نسيب بن زيد بن مالك بن عوف بن الحارث بن مازن بن منصور (مصعب، ص ١٩٧) -

(٤) و من سائر بنى نوفل بن عبد مناف لامّهم قلابة : أبو عمرو بن نوفل وأمه بنت نوفل (مصعب، ص ١٩٨) وقيل بل هى آمنة بنت نوفل (المحبّر، ١٩)-

(٥) هكذاهما، و فى نسب قريش لمصعب (ص ١٩٨) : فكيهة بنت جندل -

(٦) الاصل : حمدل (بعمّ الحيم)-

(٧) الاصل : المطعم (بلام التعريف) قب الاستقاق، ص ٥٣ -

أَمُطْعِمُ إِنَّ الْقَوْمَ سَامُوكَ خُطَّةً

وَإِنِّي مَتَى أُوكَلْ فَلَسْتُ بِآيِلِ[1]

وطُعَيمة بن عديّ قتل يوم بدر كافراً وهو أبو الريان و الخيار ابن عدي و جُبير بن مطعم كان أعلام قريش في رواته و ابناه /نافع و محمّد كانا نسيبين و أبو سليمان بن محمّد بن جُبير كان فقيهاً و عُبيد الله بن عدي[2] بن الخيار بن عدي كان من رجال قريش و نافع بن طُرَيب[3] بن عمرو بن نوفل الذي كتب المصاحف لعمر بن الخطاب و مُسلم بن قَرَظة بن عبد عمرو ابن نوفل قتل يوم الجمل مع عائشه و أخته فاختة امرأة معاويه و الحارث بن عامر بن نوفل قتل يوم بدر كافراً و فيه نزل : "وَقَالُوا إِنْ نَتَّبِعِ الْهُدَى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ أَرْضِنَا"[4] وكان النبي صلّى الله عليه وسلّم قال : من لنبيه فلينعه لايتام بني نوفل - هؤلاء بنو نوفل بن عبد مناف - وهؤلاء بنو عبد مناف بن قصي -

٢١ ط

---

(١) يروى فاسب بوائل (الاشتقاق ، ص ٥٧) -

(٢) اى عُبيدالله بن عدي الأكبر بن الخيار (مصعب ، ص ٢٠١) -

(٣) كذا في الاشتقاق (ص ٥٥) ، وقيل بل نافع بن ظريب (مصعب ، ص ٢٠٣ ، ابن حزم ، ص ١٠٧) -

(٤) القرآن ، ٢٨ ـ ٥٧ -

و ولد عبدُ الدّار بن قصيٍّ عثمانَ و وَهْباً درج و كَلَدَةَ درج و عبدَ مناف وأمّهم [هندٌ][1] بنت دُوَىّ بن مَلكان[2] من خُزاعة وَ السَّبّاق و [بنو السّبّاق][3] كانوا أوّلَ من بَغَى بمكّة على قُريش و تطاولوا عليهم فأُهلكوا و أمّه النّاقِصةُ[4] بنت [عامر بن][5] ذُؤَيبة ابن قُصَيَّةَ بن نَصْر بن سعد بن بكر بن هَوَازِن فولد عثمانُ عبد العُزّى و الحارثَ و أمّها هُصَيّصةُ بنت عمرو بن عُتْوارَة بن عائش ابن ظَرِبَ بن الحارث بن فِهْر و شُرَيحاً و أمّه بنت حَلَف/بن صَدّاد من بنى عدىّ بن كعب و ولد عبدُ مناف هاشماً و كلدةَ و عثمانَ و أمّهم تُماضُر بنت[6] عبد مناف بن قصيّ. و ولد السّبّاقُ الحارثَ و أمّه النّاقِصة بنت عامر بن ذُؤَيبة بن قُصَيّة بن نصر بن سعد بن بكر بن هوازن و عوفاً و عُمَيْلةَ[7] و عُبَيْداً بنى[8] السّبّاق و أمّهم بنت عُمَير بن حارثة بن سعد بن تيم بن مُرّة بن كعب

122 ا

(١) الاضافة من نسب قريش لمصعب (ص ٢٥٠)۔
(٢) مختلف القبائل، ص ٦ - ٧ (هامش)۔
(٣) الزيادة للتصريح۔
(٤) هكذا هنا. وقيل بل الناقمة بنت دؤيبة (مصعب، ص ٢٥٦)۔
(٥) الزيادة من قول ابن الكلبى (ورق ٢٢ و)۔
(٦) الاصل: بن (فهوسهو)۔
(٧) كما فى الاشتقاق (ص ٩٨): وقيل: بل عَميلة (مصعب ص، ٢٥٦، ابن حزم ص ١١٧)۔
(٨) الاصل: ابنى۔

ابن لؤى بن غالب وعبد الله بن السّباق وعُبيدة[1] وامّهما بنت عائذ بن مالك بن جذيمة المُصطلق من خزاعة، فدرج بنو السّباق كلّهم غير أهل بيت باليمن فى عكّ. قال هشام: حدّثنى أبو محمّد الفُهريّ قال: قال: أخبرنى شيخ من بنى عبد الله بن صفوان بن أميّة قال: سمعت قريش فى بعض الليل قائلا يقول: [من البسيط]

أُنظُرْ إليكَ بنى السّباق إنّهمُ
عمّا قليلٍ فلا عَيْنٌ ولا أثَرُ
هُدى إيادٌ وكانوا أهلَ سابِقةٍ[2]
وأهلكوا إذ بَغَوْا ظُلماً على مُضَرَ

(ومنهم): طلحة وعثمان[3] وأبو سعد[4] بنو ابى طلحة بن عبد العُزّى ابن عثمان بن عبد الدار قُتلوا يوم أُحُد معهم اللّواءُ كفّاراً - ومُسافعٌ وجُلاسٌ[5] وكلابٌ والحارث بنو طلحة بن أبى طلحة

(١) هكذا هنا - وفى نسب قريش لمصعب (ص ٢٥٦): عُبيدالله بن السّبّاق -

(٢) وبهامش النسخة «بادية» وبدل ياقوت الحموى فى المقتضب (ورق ٦٠و) «مأثره» -

(٣) وقيل بدل ابو عثمان (الاشتقاق ص ٥٦)-

(٤) زعم ابن حزم (ص ١١٧): هو أبو سعيد، وقال مصعب فى نسب قريش (ص ٢٥١): هو أبو طلحة بن أبى طلحة واسمه اسيد قتله سعد بن أبى وقّاص يوم أحد ومعه اللّواء -

(٥) ويروى: الجلاس (بلام التعريف) راجع مصعب، ص ٢٥٢، الاشتقاق، ص ١٠٠ -

قُتلوا أيضاً يوم/أحد معهم اللواءُ وعثمان بن طلحة و هوالذى ٢٢
أخذ رسول الله صلى الله عليه وسلّم منه المفتاحَ يوم الفتح ثمّ ردّه عليه
و فيه نزلت : " إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا "[1]
و علقمة بن طلحة قتل يوم اليرموك (و منهم :) ابرَاهيم بن عبيدالله
ابن عبد الله بن عثمان بن طلحة بن أبي طلحة بن عبدالعزّى
ابن عثمان بن عبد الدار[2] الذى يُقال له الحَجَبىّ[3] ولّاه هارون اليمن
و يزيدُ بن مُسافِع بن طلحة قتل يوم الحرّه و عبد الله بن مُسافِع
قتل يوم الجمل مع عائشه و شيبة بن عثمان بن أبي طَلحة
الحَاجب بعد عثمان بن طلحه بن أبى طلحه[4] و عُبيد الله[5] الأعْجَمُ بن شيبة
الّذى ضربه خالد بن عبد الله القَسْرىّ فضُرب له خالد بن عبد الله وقال
الفرزدق : [من الطّويل

---

(١) القرآن ' ٤ : ٦١ -

(٢) وقال مصعب : هو ابراهيم بن عبدالله بن عثمان بن طلحه بن ابى طلحه (ص ٢٥٢) ' وعند ياقوت الحموى (المقتضب ' ورق ٦ و) هو ابراهيم بن عبيدالله بن عثمان بن عبدالله بن عثمان بن طلحه بن أبى طلحه - قب ابن بكّار ' نسب قريش مخطوط باكسفورد رقم Marsh 384 ورق ٨٧ ' سطر ٢٥ -

(٣) الحَجَبىّ بفتحتين و باء موحده الى حجابه الكعبه شرّفها الله تعالى (لُبّ اللباب ' ص ٧٦) -

(٤) الطبرى ' ج ٣ ص ٢٣٥٣ -

(٥) و قال مصعب (ص ٢٥٣) : وعبدالله الاصغر بن شيبه بن عثمان وهوالاعجم -

لَعَمْرِي لَقَدْ صُبَّتْ عَلَى ظَهْرِ خَالِدٍ
شَآبِيبُ مَا اسْتَهْلَلْنَ مِنْ سَبَلِ الْقَطْرِ[1]

وقاسط بن شُرَيْح بن عثمان بن عبد الدّار قتل يوم أحد[2] ومعه اللّواء والعَنْقَرِيُّ[3]

وهو عبدُ الله بن شيبة بن أبي طلحة الّذى ردّ على خالد بن صفوان

وعامر بن هاشم بن عبد مناف بن عبد الدّار الّذى عَقَدَ الحلْفَ

بين المُطَيَّبين و بين الأحلاف[4] و جهمُ بن قيس بن عبد شُرَحْبِيل

ابن هاشم بن عبد مناف بن عبد الدّار [كان من مهاجرة الحَبَشة[5]

و مصعب الخير بن عمير بن هاشم بن عبد مناف بن عبد الدار][6]

شهد بدرا مع رسول الله صلّى الله عليه وسلّم و قتل يوم أحد شهيداً

و أخوه أبو عزيز واسمه زُرارة أسر يوم بدرٍ كافراً و قتل يوم احد

كافراً و أخوهما أبو الرُّوم كان من مهاجرة الحبشة و مصعب بن عُمير

ابن أبي عزيز بن عميرٍ قتل يوم الحرّة و عكرمة[7] بن عامر بن

---

(1) ويروى : فأسبح قد صُبّت على رأس خالد شآبيب لم يُرْسَلْنَ من سَبَل المطر (مصعب ، ص ٢٥٣ ، قب ديوان الفرزدق ص ٣٤٣).

(2) الزيادة من مصعب ، ص ٢٥٣ .

(3) وقيل والعقرى بفتح أوّله والقاف و راء الى العقر و هو الرّيحان (لبّ اللّباب ، ص ١٨٣ ، الصحاح ص ٨٨٥).

(4) ابن هشام ، ص ٨٣ .

(5) ايضاً ص ٢١٠ ، مصعب ، ص ٢٥٥ .

(6) الاضافة من هامش النسخة .

(7) الاصل : عِكْرُمة بضمّ الرّاء).

هاشم الشّاعر وهو الّذى باع دارالّندوة[1] من معاوية بمائة ألف درهم[2] و بَغِيضُ[3] بن عامرٍ الّذى كتب الصّحيفة بين قريشٍ و بين بنى هاشم و بنى المطّلب يوم الشّعب فشلّت يدُه[4] والحارث بن علقمة بن كَلَدَةَ بن عبد مناف بن عبد الدّار رهينةُ قريشٍ عند أبى يَكْسُومَ الحبشىّ و ابنه النّضْر بن الحارث قتل يوم بدر كافراً و كان النّضر أوّلَ من غَنّى بمكّة من قريش و اخوه النُّضَير قتل يوم اليرموك و ميمونُ بن محمّد بن المُرْتَفِع بن النّضير وهو صاحب البئر بمكه بئر ميمون بن المرتفع[5] و مالك بن عُمَيْلة[6] بن السّبّاق الشّاعر و ابو السّنابل بن بَعْكَك بن الحارث [بن عميلة][7] بن السّبّاق

(١) الاصل : دار ندوه -

(٢) وقال ابن حزم : وامّا عكرمه بن عامر فهوالّذى باع دار الندوه من حكيم ابن حزام فى الجاهليه (ص ١١٨ ، قب ص ١١٢)-

(٣) الاصل : بغيض -

(٤) ابن بكار (مخطوط بالدلين لائبريرى رقم Marsh 384) ، ورق ٨٨ ظ ، س ١٧-١٨ -

وقيل : و ابوالروم منصور بن عبد شرحبيل وهوالّذى كتب الصحيفه (ابن حزم ، ص ١١٦) ، وقال ابن هشام : وكتبها منصور بن عكرمه بن عامر او النضر ابن الحارث (ص ٢٣٠) -

(٥) قال مصعب (ص ٢٥٦) و ابن هشام (ص ١٥) : و محمد بن المرتفع بن النضير بن الحارث صاحب بئر ابن المرتفع بمكه - و قال البلاذرى (ص ٣٩) : و حفر ميمون بن الحضرمى . . . بئره و هى آخر بئر حفرت فى الجاهليه بمكه (قب معجم البلدان ، ج ١ ، ص ٣٣٦)-

(٦) وقيل : و هو عَميله (بفتح اوّله : مصعب ، ص ٢٥٦) -

(٧) الزياده من ابن هشام ص ٨٨٢ -

٢٢ ط الشاعر و [الأسود بن][1] الحارث بن عامر/أسر يوم بدر[2]

وعبدُالله بن أبي مَسَرَّةَ بن عوف بن السَّبّاق قتل مع عثمان رض

قال : لم يُهاجِر من بنى عبدالدار ولم يُسْلِم منهم قبل الهجرة

إلّا مصعب بن عُميرٍ وجَهْمُ بن قيس بن عبد شُرَحْبِيلَ و أبو الرّوم

منصور بن عبد شرحبيل. فهؤلاء بنو عبدالدّار بن قصّى۔

و ولد عبد بن قصّيٍ وَهبَ بن عبد كان أوّلَ من ولى الرّفادةَ

والمُنْتَهِبَ[3] بن عبدٍ وهو أبو كبيرٍ و بُجَير بن عبد. (منهم :)

طُليب بن عُمير بن وهب بن عبد [بن][4] قُصيٍّ صحب النبّى

صلّى الله عليه و سلّم و شهد معه بدراً[5] و امّه عمّة النبّى صلّى الله عليه

و سلّم أَرْوَى بنت عبد المطّلب و الحُوَيرِث[6] بن نُقَيْد بن بُجير

---

(١) الرفادة من هامش النسخة۔

(٢) و امّا الاسود بن الحارث فاسر يوم بدر كافرا (مصعب ' ص ٢٥٦)۔

(٣) و عند مصعب (ص ٢٥٦) هو منتهب (دون اللام) بن عبد بن قصّى۔

(٤) سقط من الاصل۔

(٥) و قيل : هو كثير بن عمير (ابن حزم ' ص ١١٩) لعله تحريف۔ وقتل طليب يوم اليرموك شهيداً (مصعب ' ص ٢٥٧ ' قب ابن هشام ' ص ٢١٠ ' ٢٣١)۔

(٦) كذا في الاصل ' وهوالاصح۔

و قال ابن هشام : وهوالحويرث بن نقيد بن وهب بن عبد بن قصى (ص ٨١٩)' وعند ابن حزم (ص ١١٩) هوالحويرث بن نمير (بالراء)۔ وقال ياقوت الحموى : والحويرث بن نفيل (بلام) بن بجير قتل يوم الفتح كافراً (المقتضب ' ورق ٦ ط) و قال مصعب (ص ٢٥٧) : والحارث بن نقيد بن بجير بن عبد بن قصى كان ممن هدر رسول الله صلعم دمه يوم الفتح۔

خطبۂ استقبال

جو

اورینٹل کالج لاہور کے ۹۳ یوم تاسیس

(منعقدہ ۱۷ دسمبر ۱۹۶۲)

کے موقع پر پڑھا گیا

★

از

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

پرنسپل ، اورینٹل کالج ، لاہور

خطبۂ استقبال

(از (ڈاکٹر) سید عبداللہ، کالج کے ۹۳ ویں یوم تاسیس کے موقع پر پڑھا)

جناب صدر—خواتین و حضرات!

میں آپ سب کی عنایت فرمائی کا شکر گزار ہوں۔ اور جناب صدر کا خاص طور سے ممنون ہوں کہ وہ کالج کی گراں بار مصروفیات کے باوجود ہمارے لیے وقت نکال سکے۔ جناب والا! آپ کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کے علم و فضل سے ملک کا ہر پڑھا لکھا آدمی باخبر ہے—مگر مجھے یہ بھی کہہ لینے دیجئے کہ آپ کے سینے میں ایک ایسی دولت چھپی ہوئی ہے جس سے ممکن ہے سب لوگ باخبر نہ ہوں اور وہ ہے آپ کا تعلیمی خلوص اور قومی جذبہ—جس کی رہنمائی میں ہم نے اس سے پہلے جو قدم بھی اٹھایا وہ ملک اور تعلیم کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔ آج میں نے پھر اسی قسم کی رہنمائی حاصل کرنے کے لیے آپ کو دعوت دی ہے۔

جناب والا! آج اورینٹل کالج کا ۹۳ واں یوم تاسیس ہے۔ ایک لحاظ سے ۱۹۶۸ء میں اس کالج کے سو سال پورے ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس کالج کی ابتدائی صورت ۱۸۶۸ء میں ظہور میں آچکی تھی۔ سو برس کی اس مدت میں اس کالج نے بہار و خزاں کے بہت سے موسم دیکھے اور اگر اورینٹل کالج کے مقاصد اور درسیات کے نشیب و فراز کی تفصیلات پر غور کیا جائے تو ہم پر چند عجیب عجیب حقیقتوں کا انکشاف ہوتا ہے—یہ حقیقتیں قومی تعلیم اور ملکی و مشرقی زبانوں کے متعلق ہمارے ہر لحظہ بدلتے ہوئے نقطۂ نظر کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ آج سے سو سال پہلے، اس کالج کے تعلیمی مقصد دو تھے اول یہ کہ ملک

نے علوم قدیمہ کو ان کی متعلقہ روایتوں سمیت نئے ماحول کے لیے قابل قبول بنا کر ان کو ترقی دے جائے۔ دوسرا یہ کہ علوم جدید کو اُردو کے ذریعے پڑھا کر ملک میں علوم مفیدہ کو پھیلایا جائے ــــ چنانچہ مدت دراز تک اس کالج میں علوم مشرقی کے علاوہ ریاضی، منطق و فلسفہ، انجینئرنگ، مساحت ــــ وغیرہ کی کلاسیں بھی جاری رہیں، اس کے علاوہ علوم جدید کو اُردو میں منتقل کرنے کے لیے محقق اور پروفیسر بھی رکھے جاتے تھے جو اُس زمانے میں فیلو اور ریڈر کہلاتے تھے۔ یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ چنانچہ علامہ اقبال نے بھی اورینٹل کالج میں ریڈر کی حیثیت سے کام کیااور ان کی کتاب علم‌الاقتصاد اسی دور کی یادگار ہے۔

در حقیقت کالج کا اصل مقصد یہی تھا مگر موسموں اور فضاؤں میں متواتر تبدیلی آتی رہی اور آج کا اورینٹل کالج اصلی اورینٹل کالج کے مقابلے میں اتنا مختلف نظر آتا ہے کہ اس کو اگر بالکل نیا ادارہ کہہ دیا جائے تو کوئی بے جا بات نہ ہوگی۔ آج کا اورینٹل کالج خالص مشرقی تہذیبوں کا دارالتحقیق اور دارالتعلیم ہونے کی بجائے مشرقی اور مغربی زبانوں کا ادارہ بن گیا ہے جو بجائے خود بڑی قدر و قیمت کی چیز ہے اور مجھے اس پر کوئی خاص اعتراض بھی نہیں۔ اور میں یونیورسٹی کا شکر گذار ہوں کہ اس کے ارباب اقتدار نے اس نئے مغربی عنصر کی مدد سے کالج کو مزید تقویت دی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ مشرقی زبانوں اور تہذیبوں کو جو مرکزی اہمیت پہلے حاصل تھی وہ موجودہ صورت میں باقی نہیں رہی ــــ اس کے علاوہ اس رجحان سے میرے دل میں ایک خوف بھی پیدا ہوتا رہتا ہے اور وہ یہ کہ بے مہری اور حقیقت ناشناسی کے کسی سرد موسم میں عربی فارسی کے مطالعہ کو

محض لسانی مطالعہ کبھ کر اس کی اہمیت کو اور بھی گھٹا نہ دیا جائے کیونکہ ہم عربی فارسی کو محض زبان نہیں سمجھتے، ہم تو ان کو اپنی تہذیبی ادبیات اور تاریخ کا سر چشمہ سمجھ کر پڑھاتے ہیں اور ان کے توسط سے ہم اخلاقیات کی اس روح کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں جو منظم صورت میں ہمارے ملک کے آخری دو بڑے اساطین علم یعنی شاہ ولی اللہ اور اقبال کے افکار کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے -

میری بے اطمینانی کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ علوم مفیدہ کو اردو میں منتقل کرنے کی تحریک ہماری یونیورسٹی میں بالکل ضعیف ہو گئی ہے اور یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے تعلیمی واضعین نظام اس کالج اور اس یونیورسٹی کے اصل مقصد سے بہت دور جا پڑے ہیں -

کالج کے موجودہ مسائل بہت سے ہیں، جن میں ایک طلبا کی غیر معمولی حد تک کثیر تعداد کے مقابلے میں جگہ اور دوسری سہولتوں کی کمی کا مسئلہ بھی ہے مگر یہ مسائل داخلی ہیں اور ان میں ہمیں یونیورسٹی کے موجودہ وائس چانسلر صاحب کی ہمدردی مطلوب بھی ہے اور حاصل بھی ہے - لہٰذا میں ان سے قطع نظر کرتے ہوئے عربی فارسی کے چند خاص مسائل اور تعلیم کے بعض عام رجحانات کو زیر بحث لانا چاہتا ہوں تاکہ میری گفتگو نجی اور محدود بن کر نہ رہ جائے -

عربی فارسی کے خاص مسائل میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ملک کے سرکاری نظام تعلیم میں خصوصاً چھٹی جماعت سے لے کر بارھویں جماعت تک عربی فارسی کی حیثیت بہت گھٹا دی گئی ہے - میں شریف تعلیمی رپورٹ کے مداحوں میں ہوں مگر میں کری کولم

کمیٹی کے جن فیصلوں سے کبھی مطمئن نہیں ہوا ان میں ایک یہ ہے کہ بارھویں تک عربی فارسی کو علاقائی زبانوں کے ساتھ بریکٹ کر دیا گیا ہے۔ علاقائیت کے فروغ کے اس دور میں علاقائی کا نام آتے ہی لوگ بے قابو سے ہو جاتے ہیں۔ اور علاقائیت کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس کی قدریں بہت محدود اور اس کے مقاصد سخت بے توازن ہوتے ہیں۔ تاہم میں ایمانداری اور انصاف کے نام پر یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا سچ مچ ایک علمی اور تعلیمی یا تحقیقی زبان کی حیثیت سے عربی اور کوئی علاقائی زبان وزن اور افادہ و سرمایہ کے لحاظ سے اہم برابر ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔ اور کوئی وہ شخص جو تعلیم کو محض تعلیم کی روشنی میں دیکھتا ہے اس امر سے متفق نہیں ہو سکتا کہ عربی فارسی کو اپنی بلند سطح سے گرا کر ایک علاقائی زبان کے مقابل لا کھڑا کیا جائے۔۔۔ ملک کی ان اہم زبانوں کے متعلق یہ فیصلہ کمشن نے نہیں کیا اور نہ اس کو حکومت کی کسی پالیسی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔۔۔ یہ تمام مصیبت ڈری کولم کمیٹی کی لائی ہوئی ہے جو مختلف مضامین کا توازن قائم نہیں رکھ سکی، جس کی وجہ سے تعلیم میں سخت بے آہنگی پیدا ہو گئی ہے۔ میرا تقاضا یہ ہے کہ عربی فارسی کو پنجابی، سندھی پشتو اور بلوچی سے الگ رکھ کر اور ان سے بلند تر جگہ دے کر ان کو تعلیم کے کسی ایک مرحلے پر (جیسا کہ انگریزوں اور ہندوؤں نے اجازت دے رکھی تھی) لازمی مضمون کی حیثیت دی جائے۔

مجھے اس بات سے بھی اتفاق نہیں کہ عربی فارسی کو محض بول چال پر قدرت کی خاطر پڑھا پڑھایا جائے، عربی فارسی کی تعلیم جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ہماری ایک تہذیبی ضرورت کو پورا

کرتی ہے۔ لہذا اسے محض محاورہ جدید کی خاطر نہیں بلکہ اس کے پورے
ادب کو اس کے تہذیبی پس منظر کی خاطر بھی پڑھانا لازمی ہے ۔ ۔ ۔
جدید عربی یا فارسی ہماری ضرورتوں کے صرف ایک حصے کو پورا کرتی
ہے لہذا ہمارے نصاب میں عربی فارسی کے جملہ اہم اور نمایاں ادبی
شاہکاروں کو شامل کرنا از بس ضروری ہے تاکہ ہمارے تہذیبی تصور
کی سالمیت برقرار رہے ۔

اب میں دو چار جملے "نوکروں کی زبان" کے متعلق کہنا چاہتا
ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ یہ نیا نام اردو کے لیے
تجویز ہوا ہے ۔ مگر ناموں اور خطابوں کے معاملے میں اردو کوئی
بدقسمت زبان نہیں ۔ چنانچہ ھندی ھندوی ۔ زبان پنجاب ۔ ریختہ اور
ھندوستانی کے علاوہ اس کو کسی نے 'کل کی چھوکری' اور کسی
نے ایک 'لاوارث بچہ شاھجہانی لشکر کا' بھی کہا ہے ۔ مگر نوکروں
کی زبان کا نیا خطاب واقعی دلچسپ ہے ۔ اور یہ روایت بھی مجھ تک
پہنچی ہے کہ اس کو بعض لوگ چھوکروں کی زبان بھی کہتے ھیں
جس کا نوکروں کی زبان سے قافیہ ملتا ہے ۔ اور اسی بنا پر میرے قافیہ
پسند مزاج کو یہ نام برا بھی نہیں لگا ۔

ع بلبل ھمیں کہ قافیہ گل شود بس است

کچھ لوگ اردو کے اس نئے خطاب کو سن کر ناراض ہوئے ھیں،
مگر حساب والا ۔ اردو اگر نوکروں کی زبان نہیں تو شاھوں کی زبان بھی
تو نہیں ۔ ۔ ۔ وہ کون سا شاھی دربار ہے جہاں اسے رسائی حاصل ہے،
وہ کون سا گھر دار ہے جو اس سے منہ لگاتا ہے ۔ اور وہ کون سا مینا
بازار ہے جہاں اس کا استعمال لطیف و نازک روحوں کے لیے گوارا
ہے ۔ ۔ ۔ تاہم یہ بھی کیا کم ہے کہ مسلسل کئی برس سے اس کا نام

ملک کے دستور اساسی میں ایک دوسری زبان کے ہمراہ قومی زبانوں کی صف میں درج نظر آتا ہے ---- اور سچی بات یہ ہے کہ میں اسی کو دیکھ کر خوش ہو لیتا ہوں ۔ ورنہ اگر کوئی اس کو شاہجہانی لشکر کا لاوارث بچہ کہہ کر کسی یتیم خانے میں پھینک دیتا تو ہم اس کا کیا بگاڑ لیتے ۔

ذاتی طور پر میں حکومت کے رویے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے کے حق میں نہیں ہوں کیونکہ حکومت نے تعلیمی کمشن جیسی اہم دستاویز میں ذریعہ تعلیم اور لازمی مضمون کی شق درج کرکے اردو کے متعلق اپنی حکمت عملی کا واضح اعلان کردیا ہے ۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ حکومت اپنی پالیسی پر چٹان کی طرح کھڑی رہے گی ۔ حکومت کی کچھ مشکلات بھی ہیں ان کا احساس کیے بغیر ناراض ہو جانا ٹھیک بات نہیں یہ اعصاب زدگی کی علامت ہے یا اپنی بے عملی کا اعتراف کہ ہم ہر بات میں حکومت سے ناراض ہوتے رہتے ہیں اور خود کچھ نہیں کرتے ۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم تعلیمی کمشن کی متعلقہ سفارشات کی پر زور تائید کریں تاکہ حکومت کے ہاتھ مضبوط ہوں اور لسانی مسئلے کے متعلق حکومت اپنی پوزیشن کے متعلق ثابت قدم رہے ۔

ذریعہ تعلیم کی تبدیلی کا سوال بلا شبہ معرض التوا میں ہے مگر یہ کام حکومت نے یونیورسٹیوں اور بورڈوں کے سپرد کر رکھا ہے ۔ اس سلسلے میں یونیورسٹیوں اور بورڈوں پر زور دینا چاہیے ۔ میں اس موقع پر لاہور ثانوی تعلیمی بورڈ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس کی انتظامیہ نے ڈاکٹر نیاری کی روشن ضمیر قیادت کے تحت ایف ۔ اس سی کے لیے اردو ذریعہ امتحان کی اجازت عطا فرما دی ہے ۔ ہم اپنی

یونیورسٹی کے عالی مرتبت اور والا مقام وائس چانسلر صاحب سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی یونیورسٹی میں انگریزی کے ساتھ اردو کو بھی ایک ذریعہ امتحان سے کی اجازت دلوادیں ۔

جناب والا! میں آپ کے اور سامعین کے درمیان زیادہ دیر تک مثل دیوار فاصل اور حائل نہیں رہنا چاہتا ۔ لیکن احساس فرض کا تقاضا ہے کہ میں اس موقع پر اس ذہنی انتشار کی طرف بھی ھلکا سا اشارہ کروں جو ہمارے نوجوانوں کے ایک خاص طبقے میں روز بروز بڑھ کر ہمارے معاشرہ کے لیے داغ بدنامی اور ہماری ملت کے مستقبل کے لیے خطرناک مرض بنتا جا رہا ہے ۔ اس ذہنی خلفشار کے اسباب کی بحث میں پڑے بغیر میں یہ عرض کرنے کی گنجائش رکھتا ہوں کہ اس کا ایک بڑا سبب تعلیم کے مقصد کے بارے میں ہمارے ذہنوں کا صاف نہ ہونا بھی ہے ۔ جناب والا ! مقصد تعلیم کچھ بھی ہو ' اتنا یقینی ہے کہ اس کا ایک مقصد ڈیوی کے بقول (Effort to socialise the child) اور (Nunn) کے بقول طلباء میں اخلاقیت اور اجتماعی آداب کی روح پیدا کرنا بھی ہے ۔ تعلیم خواہ سائنسی ہو یا ٹیکنیکل ' خواہ ادبیات کی ہو خواہ سماجی علوم کی ' آبروئے زندگی اور آبروئے انسانیت کا احترام پیدا کرنا ہر تعلیم کا مقصد ہونا چاہیے ۔ لیکن افسوس ہے کہ ہماری تعلیمی دنیا میں آداب زندگی کا احترام ختم ہوتا جاتا ہے ۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ امریکہ اور مغرب کی یوتھ موومنٹ کے اثرات کا نتیجہ ہے ۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو ' مگر اپنی ہر کمزوری کو دوسرے کے سر تھوپنے کو اب میں پسند نہیں کرتا ـــــ یہ تعلیمی رہنماؤں کی بے اثری اور ملکی اور سماجی عمائد کی بے عملی کا نتیجہ ہے کہ وہ اس ملک کے نوجوانوں کو ملکی اور مشرق

اخلاقیت کے نام پر اپیل کر کے ان کی کج روی کو روکنے کی اہلیت نہیں رکھتے یا اس کی اہمیت نہیں سمجھتے - بہر حال یہ کام کرنے کا ہے اور یہی میری التجا ہے -

جناب صدر ! میں اپنے خیالات کا اظہار کر چکا اور اب آپ سے درخواست ہے کہ ان مسائل کے بارے میں جن کے متعلق میں نے اشارہ کیا ہے آپ ہماری رہنمائی کرکے ہمیں ممنون فرمائیں - واللہ غالب علی امرہ و بیدہ التوفیق -

خطبۂ صدارت

جو

اورینٹل کالج لاہور کے ۹۳ ویں یوم تاسیس

(منعقدہ ۱۷ دسمبر ۱۹۶۲ء)

کے موقع پر پڑھا گیا

★

از

حمید احمد خاں

پرنسپل، اسلامیہ کالج، لاہور

خطبۂ صدارت

جناب پروفیسر حمید احمد خان صاحب، پرنسپل اسلامیہ کالج، لاہور
۹۳ ویں یوم تاسیس کے موقع پر پڑھا

اب پرنسپل صاحب، خواتین و حضرات،

میرے لیے یہ بڑا اعزاز ہے کہ مجھے اورینٹل کالج کے جشن
یں اور ارباب علم و دانش کے اس منتخب اجتماع میں شرکت کا
قع عطا فرمایا گیا۔ ایک سو برس ہوئے ہماری قومی تہذیب کے یورپی
دردوں نے، جو ہمارے تہذیبی و تعلیمی مسائل کو مغرب کی عینک
دیکھتے تھے، اس کالج کے لیے ''مشرقی کالج'' کا نام تجویز کیا
ا۔ اس دور کے لیے یہ نام بہت موزوں تھا، لیکن آج میں اپنے دل
ٹٹولتا ہوں تو اس کے اندر مجھے نہ تو سمت کی وہ مخصوص تمیز
ی ہے، اور نہ اپنے اجتماعی شعور سے قطعی علیحدگی کا وہ احساس،
ن کے ماتحت سرزمین یورپ صحیح مقام نظر قرار پاتی ہے، اور اس
م سے عرب و عجم اور پاکستان و چین بجا طور پر بلاد مشرق کی
یثیت سے دکھائی دیتے ہیں۔ یقین مانئے میں خود اپنا غیر بننے کی کتنی
کوشش کروں، میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ انگریز یا امریکی بن
ؤں اور خود اپنے آپ کو ''اورینٹل'' سمجھنے لگوں۔ یہ قومی
العلوم ہماری تہذیب کی سرپرست گاہ اور ہماری علمی روایت کا گہوارہ
۔ اس کالج کو دور آخر کے اُن صاحب کمال بزرگوں سے نسبت
صل رہی ہے جو آسمان علم و ادب کے ستارے تھے۔ یہ اُن کی
ی ہوئی روشنی کی کرامت ہے کہ ہماری یہ لمبی اندھیری رات، رات

میں رہی اور ہمیں اپنے ہزار سالہ ماضی سے اپنا تعلق برقرار معلوم ہوتا ہے۔ جناب والا، آپ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ آپ کو ایسی درخشاں روایت میں کام کرنے کی سعادت حاصل ہے۔ میرے نزدیک آپ کا جذبۂ حب قوم اور علمی بصیرت دونوں اس بات کے ضامن ہیں کہ جس بلند مقصد کی تکمیل کے لیے اس کالج کا قیام عمل میں آیا تھا، اس کے ساتھ ہمارا رابطہ نہ صرف استوار رہے گا بلکہ اس رابطے میں نئی قوت اور نئی وسعت جلوہ گر ہوگی۔ اس مقصد عزیز کی حفاظت کا سوال پیدا ہوتا ہے تو قوم کی نگاہیں سب سے پہلے آپ کی طرف اور اس کالج کی طرف اٹھتی ہیں، کیونکہ وہ علوم و ادبیات جن پر صدہا برس تک ہماری قومی ہستی کی بنیاد قائم رہی، اب بھی اس چار دیواری کے اندر زندگی سے لو لگائے ہوئے ہیں۔ بے شک آندھیاں چلتی رہی ہیں، اور چل رہی ہیں، لیکن ہمارا ایمان ہے کہ ہماری قومی تہذیب کا چراغ ان ناسازگار حالات میں بھی فروزاں رہے گا۔

جناب والا، آپ نے اورینٹل کالج میں مغربی زبانوں کے اس نفوذ پر جو گذشتہ چند سال سے عمل میں آ رہا ہے، کچھ اندیشوں کا اظہار کیا ہے۔ اگر ہم واقعی نئی داخل نصاب مغربی زبانوں کا روپ اور دیکھنے میں اس قدر محو ہو گئے کہ اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا تو یہ بڑی افسوسناک بلکہ ہلاکت انگیز صورت حال ہوگی لیکن میرا خیال ہے کہ اگر ہماری قومیت کی بنیادیں بدستور قائم رہیں تو ان نوواردوں سے ملاقات کسی تشویش کا باعث ہونے کے بجائے باعث انشراح خاطر بلکہ باعث تقویت قلب و بدن ثابت ہو سکتی ہے۔ میری رائے میں عربی، فارسی اور اردو میں تازہ کار عناصر کا داخلہ ان کے احیا و استحکام کا باعث ہوگا۔ اگر آپ ان بیرونی اثرات کو اپنی زبانوں بالخصوص اردو

میں جذب کرسکیں تو اورینٹل کالج میں ان غیر ملکیوں کی آمد بہت با برکت ثابت ہوگی۔ اور مجھے ذاتی طور پر یہ عمل قرین قیاس بھی معلوم ہوتا ہے۔ اردو فارسی کے طلبہ کو جرمن اور فرانسیسی کی محفل میں بیٹھنے دیجئے تاکہ اُن کے ذہنوں کی ترکتاز نئے میدانوں سے آشنا ہو اور وہ نئی فتوحات سے قومی زبان کو مالا مال کریں۔ نیت میں راستی ہو تو غیر سے ملنا، اور اُس کے سرمایۂ معرفت کو اپنے علوم میں شامل کر لینا، کیا مشکل ہے۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ اُس پختہ کار عاشق کے بتائے ہوئے گر پر عمل کیجئے جس نے فرمایا ہے ؎

آلام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اُسے غم جاناں بنا دیا

حوادث و حضرات، یہ محض شاعری نہیں، حقیقت کا بیان ہے کہ علوم اور تہذیبیں اگر اپنے گرد و پیش کی مفید تحریکات پر حاوی ہونے کی کوشش نہ کریں تو امتداد زمانہ سے بے مایہ اور بے کار، بلکہ بے جان ہو جاتی ہیں۔ یورپ کی تحریک احیائے علوم کے دور آخر سے لے کر انیسویں صدی کے وسط تک مسلمانوں نے یورپی علوم و فنون کے ظہور کو عالمگیر پیمانے پر جس طرح نظر انداز کیا اور ان سے اپنی علیحدگی پر جس طرح مصر رہے، وہ ہماری تہذیبی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہمارے تمدن نے جدید علوم کو وقت پر بتدریج جذب کرکے جزو بدن بنا لیا ہوتا تو ہم اُس علمی و تہذیبی خلفشار میں مبتلا نہ ہوتے جو موجودہ دور میں ہمارے لیے زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی میں، جب ہم اپنے تمدن کی قدامت اور تہذیب کی پختگی پر نازاں تھے، یورپ نے

سائنس کے انکشافات اور قوموں کی جمہوری شیرازہ بندی کے بل پر
مشینی آلات کی مدد سے ایک ایسا نظام معیشت وضع کیا جس کی
جارحانہ قوت تسخیر کے سامنے پہلے ہمارے تمدن کے ہزار سالہ ایوان اور
پھر ہمارے عقائد و اعمال کے مضبوط قلعے پاش پاش ہونے لگے۔ یورپی
تمدن زندگی کے ہر شعبے پر اس طرح محیط ہونے لگا کہ ہماری اپنی
قاعدہ دانی اور وضع داری اور حفظ مراتب کے لیے کوئی جگہ باقی نہ
رہی۔ صنعتی انقلاب کا لایا ہؤا تمدن محض آنکھیں بند کر لینے سے
کالعدم نہ ہو سکتا تھا۔ اور جب ہم نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ
انسان کی زندگی ایک ایسی منزل میں داخل ہو رہی ہے جسے ہم نہیں
پہچانتے۔ موٹر کار، ہوائی جہاز، ٹیلیفون اور ریڈیو کے دور میں پالکی کی
سواری، چاندنی کی نشست اور ڈھولک کی تھاپ عہد دقیانوسی کی نشانیاں
نہ بھی معلوم ہوتیں تب بھی مشینی تمدن کے پیدا کردہ لوازم حیات سے
بے نیاز رہنا عملاً ناممکن تھا۔

یہ ظاہر ہے کہ ہر تہذیب بڑی حد تک ایک باطنی ضابطۂ اقدار سے
عبارت ہوتی ہے، اور اپنی بقا اور فروغ کے لیے خارجی دنیا میں لازماً
ایک ایسے تمدن کا ظہور چاہتی ہے جو اس کے اپنے مزاج کے مطابق
ہو۔ یہی وجہ تھی کہ انیسویں صدی میں ہند اسلامی تہذیب کی روایات
ایک طرف، اور فرنگی تمدن کے طور طریقے دوسری طرف، دو اٹل
بے جوڑ حقیقتوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہوگئے، اور
ان کو باہم ترکیب دینے کی کوئی صورت نظر کے سامنے نہ آئی۔ سچ
پوچھئے تو گزشتہ صدی میں یورپ کا مشینی تمدن ہماری قومی تہذیب پر
ایک مصیبت بن کر نازل ہوا۔ کیونکہ جس فضا میں اس تہذیب کی
زندگی اور کارفرمائی ممکن تھی، وہ یک بیک معدوم ہوگئی۔ اس انقلاب نے

عظیم سے محفوظ رہنے کی ایک ہی صورت ممکن تھی کہ ہمارا تمدن صدیوں پہلے سائنسی اور مشینی تمدن کے تدریجی تغیرات کے ساتھ ساتھ ڈھلنا شروع ہو جاتا تاکہ ہمارا تہذیبی نصب العین ہمارے تمدنی اعمال کی قدم بہ قدم رہ نمائی کرتا ہوا ہمیں ذہنی کشمکش اور اندرونی خلفشار سے بڑی حد تک بچا کر آگے لے آتا۔ میری رائے میں یہ صورت ملت اسلامیہ کے لیے بالکل قابل عمل تھی، کیونکہ ہمارے دینی عقائد بنیادی طور پر مطابق فطرت یا مطابق عقل ہیں، اور اگر یورپ اپنے قرون وسطی کے بوجھاپ سے نکل کر اپنے تمدن کو سائنسی بنیادوں پر استوار کر سکا ہے، تو ہمارے لیے یہ طریق کار بدرجہ اولیٰ ممکن تھا۔ ہمارے لیے لباس، بود و ماند، کلام و طعام، دینداری و پرہیزگاری، عیش و عشرت، شادی بیاہ، مرگ و ولادت، تعلیم و تربیت، غرض زندگی کے ہر شعبے میں تہذیبی تصور اور تمدنی عمل کے درمیان بتدریج ہم آہنگی پیدا کر لینا نسبتاً آسان تھا۔ اس صورت حال کے برعکس جب یورپی تمدن زلزلہ بن کر ہمارے سر پر ٹوٹا تو قدرتاً ایک ہنگامۂ گیرو دار برپا ہوا جس نے ہمارے معاشرے میں طرح طرح کی ذہنی پیچیدگیوں، بغاوتوں، اور وسوسوں کو راہ دی۔ ان ایک ہزار ایک بلاؤں کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ لیکن مجھے یہ ضرور کہنا ہے کہ ہم موجودہ عہد میں کسی بھی علمی، تعلیمی، معاشرتی یا سیاسی فساد کا جائزہ کریں، اس کی جڑ ہماری قومی تہذیب اور ہمارے اختیار کیے ہوئے یورپی تمدن کے باہمی افتراق تک پہنچی ہوئی معلوم ہو گی۔ اس ذکر کے بعد آپ کو اس قسم کے واقعات پر تعجب نہ ہوگا کہ پتلون کی شکن کے خراب ہو جانے کے اندیشے نے کسی خوش پوش مرد مسلماں کو آرام کی نشست، بلکہ نماز کے ایک سجدے،

سے بھی محروم رکھا... بزرگی و خوردی کے درمیان نئی جمہوریت کو کوئی پردہ حائل نظر نہ آیا.... اور ماسٹر صاحب نے پس از سبق شاگرد کو بل پیش کر دیا۔

خواتین و حضرات، میں نے آپ کی خدمت میں اپنی قوم کی عمرانی تاریخ کا خلاصہ ایک حکایت کے انداز میں پیش کیا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ جس تاریخی حقیقت کو میں نے بیان کرنا چاہا ہے اسے درست باور کرنے میں آپ کو تامل نہ ہوگا۔ ہماری پرانی تہذیب اور ہمارے نئے تمدن کی دوئی نے احترام روایت کے متعلق ہمارے تمام تصورات، نیز ہماری موجودہ تعلیم اور ہمارے عقائد و اخلاق کے باہمی تعلق، اور اس کے ساتھ طلبہ اور معلمین کے روابط میں ایسی ہل چل پیدا کر دی ہے کہ جو تھوڑا بہت امن و سکون ہماری زندگی کو میسر ہے، اسے بھی ایک معجزہ قرار دیا جائے تو مناسب ہوگا۔ اس موقع پر آپ قدرتاً یہ سوال کریں گے کہ کیا اس پرانے مرض کا کوئی علاج بھی ممکن ہے؟ وقت کا پہیا اُلٹا نہیں گھوم سکتا، نہ تاریخ اپنے کسی باب کو دہراتی ہے۔ لیکن میری رائے میں اب بھی ہم اپنی قوم کے اس درد کا کچھ نہ کچھ مداوا کر سکتے ہیں۔ اس کی ایک تدبیر وہ ہے جس کی طرف، جناب والا، آپ اپنے بلیغ خطبے میں اس سے پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ اورینٹل کالج دو تعلیمی عقیدوں کی بنیاد پر قائم ہوا: پہلا یہ کہ قوم کے پرانے علوم کو نئی زندگی سے روشناس کرانا ضروری ہے، اور دوسرا یہ کہ نئے علوم اردو کے قالب میں ڈھال کر طلبہ کے سامنے پیش کرنے چاہئیں۔ یہ دونوں عمل، جن کا ذکر آپ نے کیا، دراصل ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ یہی وہ طریق کار ہے جسے اختیار کرکے ہم

مغربی تمدن کے شداد کو مشرف بہ اسلام کر سکتے ہیں۔ یہ تمدن سو ڈیڑھ سو برس سے ایک پرانی بلا کی طرح ہمارے سر پر معلق ہے۔ جب تک یہ ہمارے عقائد و افکار کی حدود سے باہر ہمارا محاصرہ کیے پڑا ہے، اس وقت تک، اسے ایک فضائے محرم قرار دینا چاہیے۔ لیکن اگر ہم اس نہ ٹلنے والے حملہ آور کو اپنے قبیلے میں شامل، بلکہ جذب، کر لیں تو وہ خطرہ جس سے ہم مضطرب ہیں خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ خواتین و حضرات، مغربی علوم کے مطالب کو قومی زبان میں ادا کیجیے۔ یہ نسخہ ایک نہیں، سو بیماریوں کا علاج ہے۔ تعلیم اور اخلاق اور اصلاح معاشرت کے کئی عقدے اسی طرح حل ہوں گے۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک ہم انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنائے رکھیں گے، یورپی انسان کے پیدا کیے ہوئے بہترین افکار، غیر کی دی ہوئی خیرات کی طرح ہماری ہتھیلی پر پڑے رہیں گے۔ لیکن یہی مضامین اردو میں گھول کر ہمیں پلائیے تو یہ ہمارا جزو بدن بن جائیں گے۔ اس صورت میں ہم انہیں عربی اور فارسی کی قدیم روایت کے پس منظر میں دیکھیں گے اور ان سے مرعوب و مغلوب ہو جانے کے بجائے ان پر اپنا ذہنی تسلط قائم کر سکیں گے۔ یقین مانیے کہ عالم افکار میں غلبے کا یہ احساس ابھرا تو وہ توازن قائم کر لے گا جسے بے حسی اور خیرات خوری اور اغیار کی نقالی نے عرصۂ دراز سے درہم کر رکھا ہے۔

خواتین و حضرات، میرے انگریز اور امریکی اصحاب بعض دفعہ تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ انگریزی زبان و ادب کا معلم ہوتے ہوئے میں کیوں انگریزی کو ذریعۂ تعلیم کے منصب سے ہٹانے کے حق میں ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں انگریزی زبان و ادب کی وفاداری میں اپنے انگریز دوستوں سے بھی کچھ آگے ہوں۔ میرے دوست فقط

ایسا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں چند انگریزی داں پیدا ہو سکیں ' میری کوشش یہ ہے کہ ہم سب انگریزی داں نہیں ' انگریز بن جائیں ' مگر مکالے کے ساختہ پرداختہ مصنوعی انگریز نہیں ' بلکہ وہ سچے انگریز ' جو اپنے دین و وطن پر جان دیں ' عرب ہمیں کے نگہبان ہوں اور انسانی مساوات کے قدرداں ' عام کی راہ میں کڑیاں جھیلنے کو دن رات مستعد رہیں ' منطقی صحت بیان اور لفظوں کے محتاط استعمال میں یگانہ روزگار ہوں ' لیکن جہاں قومی روایت سے عشق کا سوال پیدا ہو ' وہاں منطق کو بالائے طاق رکھ دیں - اب آپ ہی فرمائیے کہ انگریزی کا سچا خیرخواہ میں ہوں یا میرے وہ انگریز اور امریکی احباب جو صرف انگریزی زبان کا چھلکا ہماری قوم کے ہاتھ میں دینا چاہتے ہیں - مجھے یقین واثق ہے کہ جب تک انگریزی زبان و ادب کی روح ہماری قومی زبان میں منتقل نہ ہوگی ' انگریزی کے افکار و جذبات کا صحیح فیضان ہماری قوم کے سواد اعظم تک نہ پہنچے گا -

جناب والا ' آپ نے اپنے تمہیدی خطبے میں ضمناً یہ بھی کہا کہ "علوم مفیدہ کو اردو میں منتقل کرنے کی تحریک ہماری یونیورسٹی میں بالکل ضعیف ہو گئی ہے -" میں یونیورسٹی کی کم کوشی و سست کاری کی شکایت کرنے کی حد تک آپ کا ہم نوا ہوں ' لیکن مجھے یہ دعویٰ قبول کرنے میں تامل ہے کہ اردو کی تحریک اس یونیورسٹی میں بے جان ہو گئی ہے - خود آپ ہی کے کالج میں اردو اکیڈمی ایک عرصے سے بہت مفید کام کر رہی ہے - حال میں اردو کی ترقی و ترویج کے لیے یونیورسٹی نے ایک ادارۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا ہے جو عنقریب وسیع پیمانے پر درسی کتابوں کی تالیف شروع کرے گا - یہ ادارہ اپنے مقصد اور نوعیت کار کے لحاظ سے در اصل اورینٹل کالج کا ایک

شعبہ ہونا چاہیے - جوں ہی اس ادارے کو یونیورسٹی سے ملحق کوئی موزوں جگہ ملتی ہے، میں اس کے موجودہ ناظم کی حیثیت سے تحریک کروں گا کہ ادارہ تالیف و ترجمہ کا نظم و نسق اورینٹل کالج کے حوالے کر دیا جائے - اس طرح یہ کالج اپنے تعلیمی و تدریسی کام کے علاوہ اپنے اس تحلیقی نصب العین سے بھی بہرحاصل طور پر وابستہ رہے گا جس کے ماتحت علوم جدیدہ کو اردو میں منتقل کرنا اس کے فرائض میں داخل ہے -

جناب والا ، خواتین و حضرات، اب آپ کی اجازت سے میں ایک اور مسئلے کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہوں ، جس کا حلیہ بعض انتشار پسند عناصر نے اس طرح بگاڑا ہے کہ اسے خواہ مخواہ ایک نا خوش گوار مگر بے معنی اور مضحکہ خیز صورت مل گئی ہے - یہ مسئلہ علاقائی زبانوں، اور بالخصوص پنجابی ، کی ترقی کا مسئلہ ہے - اردو اور علاقائی زبانوں کے درمیاں گہرا اور قریب کا تعلق ہے- پاکستانی ثقافت کو متنوع اور جاندار بنانے میں ان زبانوں کا حصہ بڑا اہم ہے - ہمیں یقیں ہے کہ ان کا فکری اور لغوی سرمایہ قومی زندگی اور قومی زبان کی قوت میں گراں قدر اضافے کا باعث ہوگا - جہاں تک پنجابی کا تعلق ہے یہ اردو کی حقیقی بہن ہے اور اس کی ترقی میں اردو کی ترقی کے کئی پہلو مضمر ہیں - دیکھنا یہ ہے کہ اس وقت پنجابی کو کس قسم کے مسائل درپیش ہیں؟ مغربی پاکستان کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ پنجابی بولتا ہے اور پنجابی کی تنومند اور محاکاتی ترکیبوں سے مناسب موقعوں پر لطف اندوز ہوتا ہے - اہل لاہور کی علمی زبانیں انگریزی اور اردو ہیں لیکن جب کوئی نفسیاتی لمحہ وارد ہوتا ہے تو اہل لاہور پنجابی کی صوتی صلابت کا سہارا لینے میں تکلف محسوس نہیں

کرتے ۔ لاہور میں برسوں سے سرکاری امداد کی بنا پر ایک پنجابی ادبی اکیڈمی قائم ہے جو بہت سی مطبوعات قابل ذکر سلیقے اور اہتمام کے ساتھ شائع کر چکی ہے ۔ پنجابی کی متعدد ادبی مجالس الگ سرگرم عمل ہیں اور بعض اہل زبان اپنی شوقیہ تحریروں سے پنجابی شعر و ادب میں مفید اضافہ کر رہے ہیں ۔ توقع یہ ہے کہ جوں ہی پنجابی کے اہل علم اصناف نثر میں معتدبہ ذخیرہ فراہم کر لیں گے ، پنجابی بطور ایک ادبی مضمون کے ہمارے نظام تعلیم میں داخل ہو جائے گی ۔ حال ہی میں بلھے شاہ کی کافیاں یونیسکو کی توجہ میں آئیں اور بین الاقوامی سطح پر ترجمے کے لیے منتخب ہوئیں ۔ یہ تمام حالات بظاہر اطمینان بخش معلوم ہوتے ہیں لیکن گزشتہ چار مہینے سے جدا جانے کن اسباب کی بنا پر بعض گوشوں سے واویلا کی پکار اس طرح بلند ہوئی ہے جیسے کسی نے یکایک پنجابی کا ٹینٹوا دبوچ لیا ہے ۔ اگر اس شور کو ذرا غور سے سنیے تو اس میں ایک خاص سر بار بار نمایاں ہو کر اصرار کر رہا ہے کہ :

(الف) مغربی پاکستان کی قومی زبانیں پنجابی ، سندھی اور پشتو ہیں ۔ اردو ایک غیر ملکی زبان ہے ۔

(ب) بلھے شاہ ، شاہ لطیف اور رحمان بابا کو ان کی اصل زبان میں پڑھو ۔ یہی قومی وحدت کا راز ہے ۔

(ج) مختلف علاقے ہم دل ہو جائیں تو ایک زبان کی ضرورت ہی نہیں رہتی ۔

یہ سب انکشافات اپنی جگہ بھی کچھ کم دلچسپ نہ تھے ، مگر پچھلے دنوں ایک سیاسی بزرجمہر نے لاہور میں یوم شاہ لطیف کی تقریب پر تقریر کرتے ہوئے اس عام اصول کا اعلان فرما دیا ، ایک

زبان کا خیال ''احمقانہ خیال'' ہے، ان اقوال کی روشنی میں یہ سمجھنا کچھ دشوار نہیں رہتا جو لوگ یہ نعرہ لگا رہے ہیں کہ ''پنجابی خطرے میں ہے'' اُن کی اصل غرض و غایت کیا ہے ۔ ان صاحبوں کو یہ واضح رہے اُردو اگر اُن کی نعرہ بازی سے ملیا میٹ بھی ہو جائے تو بھی پنجابی کو مغربی پاکستان کی قومی زبان بننے کے لیے پشتو اور سندھی جیسے سخت جان حریفوں کا سامنا ہوگا ۔ یہ بھی بالکل واضح ہے کہ علاقائی زبانوں میں گھمسان کا رن ڈالے بغیر کسی نئے لسانی تفوق کا فیصلہ نہیں ہو سکتا ۔

جن نامعلوم وجوہ کی بنا پر پنجابی زبان کی حفاظت کے لیے ہوا میں تلواریں چلائی جا رہی ہیں، اُن کی ماہیت دریافت کرنے کے لیے پنجاب کے علاقے کی لسانی صورت حال کا جائزہ لیجیے ۔ یہاں ہر وقت تین زبانوں کو نمایاں اور اہم مقام حاصل ہے ۔ تعلیمی اور سرکاری زبان ایک قسم کی مسخ شدہ ، یا نیم مسخ شدہ ، انگریزی ہے ۔ اخباری اور ادبی زبان اُردو ہے، میل جول اور کاروبار کی زبان وسیع پیمانے پر پنجابی ہے ۔ اس صورت حال کو برہم کرنے کے لیے جو کوششیں شروع کی گئی ہیں ، اُن کے مقصد دو ہی ہو سکتے ہیں ۔ ایک یہ کہ پنجابی کو انگریزی کی جگہ دے کر تعلیمی اور سرکاری زبان بنایا جائے ۔ دوسرے یہ کہ اُردو کو اس کے موجودہ عوامی منصب سے ہٹا کر پنجابی کو اخباری اور ادبی زبان قرار دیا جائے ۔ لطف یہ ہے کہ اس ہنگامے میں پنجابی کے علم بردار ساتھ ہی یہ نعرہ بھی لگائے جا رہے ہیں کہ اُردو ہماری قومی زبان ہے ۔ یہ عجب قومی زبان ہے جو نہ تعلیم کی زبان ہے، نہ سرکار کی ، اور اگر عوام از راہ محبت اسے رضاکارانہ طور پر اخباری اور ادبی بناتے ہیں تو یار لوگوں کا دل جلنے لگتا ہے ، قوم کی

زندگی میں قومی زبان کا اتنا عمل دخل بھی کیوں رہے۔

خواتین و حضرات، قومی زبان کوئی بیکار سا کھلونا نہیں ہے کہ جی چاہا تو اُٹھا کر باہر پھینک دیا۔ یہ اجتماعی زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے جس کو پورا کیے بغیر معاشرے کی تشکیل و تکمیل نہیں ہوتی۔ قومی وحدت کی تعمیر کے لیے افراد قوم کا ہم خیال ہونا اور ہم حال ہونے کے لیے ہم زبان ہونا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یقین جانیے کہ زبان کا فرق دلوں کے فرق پیدا کر دیتا ہے لیکن ہم زبانی ہم دلی کی پہلی شرط بن جاتی ہے۔ برطانیہ اور امریکا کی مثال لیجیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر امریکا عالمی سیاسیات سے الگ رہنے کی حکمت عملی پر کاربند تھا۔ با ایں ہمہ جب برطانیہ کو جرمنی نے بری طرح آ گھیرا تو امریکا اپنے پرانے اصول کو ترک کرکے برطانیہ کی حمایت کے لیے جنگ میں آ شامل ہوا۔ ان دونوں ملکوں کے درمیان ہم جہتی کی بنیاد ان کی مشترک زبان پر قائم ہے اور آج بھی یہ کیفیت ہے کہ یہ دونوں دو الگ ملک ہونے کے باوجود ایک معلوم ہوتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو انسانی جماعتوں کے درمیان اشتراک زبان ایک نعمت خدا داد ہے جس کی قدر کرنا عین مقتضائے فطرت ہے۔ اگرچہ مذہب یا نسل یا زبان قومیت کا جزو لاینفک نہیں ہے، لیکن یہ سب مجموعی طور پر اور الگ الگ قوم کے وجود کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یک زبانی قوم کی وحدت و سالمیت کے استحکام کا باعث ہوتی ہے۔ کسی مشترک زبان کا نہ ہونا قوم کی وحدت کے لیے اس طرح ضعف کا باعث ہوتا ہے جس طرح عقیدے یا نسل کا اختلاف۔

قومی زبانوں کے وجود میں آنے کی کئی صورتیں ہیں۔ بارہا قومی

زبان ملک کی اکثریت کی زبان ہوتی ہے، جیسے برطانیہ میں۔ لیکن انڈونیشیا کو دیکھیے تو وہاں صورت حال برعکس ہے۔ انڈونیشیا میں ایک چھوٹی سی اقلیت کی زبان پورے ملک کی زبان قرار دی گئی ہے تا کہ ملکی آبادی کے بڑے اجزا کے لسانی مناقشات اتحاد قوم کو متاثر نہ کریں۔ کبھی کبھی ایک ہی ملک کے اندر متعدد قومی زبانوں کا وجود بھی ممکن ہوتا ہے۔ لیکن اس قسم کی خال خال مثالیں عام اصول کے استثنٰی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سوئٹزر لینڈ کئی زبانوں کا ننھا سا ملک ہے اس کی قومی وحدت اپنے محدود جغرافیے کی بنا پر قائم رہ سکی ہے۔ نیز اسے یہ سہولت میسر ہے کہ اس کی مختلف زبانیں کسی نہ کسی متصل ملک کی قومی زبان ہونے کی حیثیت سے تعلیمی اور دفتری کاروبار کے لیے پہلے سے تیار ہیں۔

لسانی بنیادوں پر پاکستان کی تقسیم چاہنے والے بارہا روس کا ذکر کرتے ہیں کہ وہاں کی بیسیوں بولیوں کو سرکاری زبانوں کا مرتبہ حاصل ہے اس قسم کے بیانات محض اپنے آپ کو یا دوسروں کو فریب دینے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ روس میں روسی زبان کے سر پر جو چتر شاہی سایہ افگن ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ تمام قومی اور بین الاقوامی کاروبار اسی زبان کے ذریعے سے طے ہوتا ہے۔ علاقائی بولیوں کی خود مختاری کی حقیقت اس واقعے سے کھل جاتی ہے کہ ترکستان کے مسلمانوں کے نام تک ابراہیموف، احمدوف اور یوسفوف کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ میرے نزدیک پاکستان کی علاقائی زبانوں کی ترقی پاکستان کی قومی زبان کی ترقی ہے۔ میں یہ اس لیے کہتا ہوں کہ پشتو، سندھی، پنجابی اور اردو سب کی سب ایک ہی

تہذیبی روایت کی زبانیں ہیں۔ اس کے برعکس روسی اور ترکی ، روسی اور فارسی ، وغیرہ کے درمیان اس قسم کا کوئی تہذیبی اور تاریخی تعلق موجود نہیں ہے۔ مغربی پاکستان کی علمی و ادبی روایت شمال سے جنوب تک ایک ہے اور یہاں کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ کسی ایک زبان کا فروغ کسی دوسری زبان کو نقصان پہنچائے۔ مجھے اگر اعتراض ہے تو اس ذہنیت پر جو اردو اور علاقائی زبانوں کے قریبی تعلق کو ختم کر کے قوم کے مختلف طبقوں کے درمیان ایک خلیج حائل کر دینا چاہتی ہے۔ اتحاد کی جو دولت ہمیں ایک مسلسل تاریخی عمل کے ذریعے سے حاصل ہوئی ، اس کو تلف کرنے کی کوششوں پر خاموش رہنا کسی صحیح العقیدہ انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ جناب والا ، مجھے معلوم ہے کہ ہمارے بعض عزیز دوست آپ کے جذبۂ حب وطن کو "عشق اردو" کا نام دے کر آپ سے ناراض ہوتے ہیں۔

لقد لامنی فی حب لیلیٰ اقاربی !

لیکن مجھے یقین ہے کہ ملامت یا خوشامد کا کوئی حربہ ان ارباب ہمت کے خلاف کارگر نہیں ہوتا جو کسی بڑے مقصد کو سامنے رکھ کر سیدھے راستے پر چلے جا رہے ہوں۔ میرا اپنا مسلک یہ ہے میں "ادبی پنجابی" سے محبت کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی اس پلیٹ فارم سے یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے "سیاسی پنجابی" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ پنجابی کے لیے ادبی اور لسانی کام کرنے کی بے انتہا گنجائش موجود ہے اور ضرورت ہے کہ یہ کام صاحب فراست اور صاحب اخلاص لوگوں کے ہاتھوں انجام پائے۔ لیکن جو لوگ پنجابی زبان کو سیاسی سازشوں کا اکھاڑا بنانا چاہتے ہیں ، اور اس حیلے مغربی

پاکستان کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا خواب دیکھتے ہیں، میں ان سے قطعی طور پر علیحدہ ہوں۔ جناب والا، اگر آپ میری اس جسارت کو معاف فرمائیں تو میں یہ عرض کروں گا، پنجابی کی ترقی کا مسئلہ تخریب پسند عناصر کے ہاتھ میں دے کر آپ نے اور پنجاب یونیورسٹی نے ایک اہم فرض کو نظر انداز کیا ہے۔ جن قوتوں نے اس وقت پنجابی کی پکار لگائی شروع کی ہے آن کو یہ موقع اس لیے مل گیا کہ بے شمار ایسے اشخاص جو مغربی پاکستان کی وحدت اور لسانی توافق کے حامی تھے علاقائی زبانوں کی صحت مندانہ نشو و نما سے غافل ہوگئے۔ اگر اورینٹل کالج میں علاقائی زبانوں کا ایک شعبہ قائم ہو جاتا اور اس کام پر وہی توجہ دی جاتی جو ہم دوسری علمی و ادبی تحقیقات پر دیتے ہیں تو علاقائی زبانوں کی ترقی کے مسئلے کو تخریب کی نیت سے استعمال کرنے کی وہ کوشش صورت پذیر نہ ہوتی جس کے بعض آثار اب لاہور میں بھی نظر آنے لگے ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ کی دانش مندانہ قیادت میں علاقائی زبانوں کے ایک شعبے کا قیام آن ناراست اور کج اندیشانہ سرگرمیوں کا سدباب کردے گا جن سے ہمارے وطن کے موجودہ لسانی توازن کو درہم کرنا مقصود ہے۔

خواتین و حضرات، اس میں شک نہیں کہ اس وقت معاشی رقابتیں اور اقتصادی ناہمواریاں بھی زبان کے مسئلے کو آلجھا رہی ہیں۔ لیکن ان پیچیدگیوں کی نوعیت دائمی نہیں ہے۔ اور تدبر کا تقاضا یہ ہے کہ ہم مستقبل پر اپنی نظر رکھیں اور کسی عارضی ناآسودگی سے متاثر ہو کر آن گراں مایہ وسائل کو اپنے ہاتھوں تباہ نہ کر دیں جن پر ہمارے اتحاد و استحکام کی بنیاد ہے۔

یہ عبوری دور ایک لحاظ سے دور ابتلا ہے لیکن میرا ایمان

کہتا ہے کہ صبح اسی وقت قریب ہوتی ہے جب رات کچھ زیادہ اندھیری معلوم ہو رہی ہو:

مردہ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

۱۷ دسمبر ۱۹٦۲ع — حمید احمد خاں

رب یسّر ولا تعسّر و تمّم بالخیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اظفری گورگانی
اور ان کا ریختہ کلام

★

مؤلّفہ

سیّد علی عباس
ہسٹری ڈیپارٹمنٹ ، پنجاب یونیورسٹی
لاہور

فہرست مضامین

پیش لفظ

پیش لفظ کی ضرورت عموماً اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ مولف کو تالیف کی وجہ بیان کرنے کا موقع مل جائے اور کچھ کچھ انکسار کے ساتھ تالیف کی خامیوں کو بھی واضح کر سکے تا کہ قارئین کی طرف سے زبان درازی نہ ہو۔ مؤخرالذکر وجہ کے لیے میرا قلم میری زبان کی طرح خاموش ہے۔ خاموشی کا سبب یہ نہیں کہ قلم ان خامیوں کے لیے قوت جواز سے محروم ہے۔ زبان کو اگر بولنے کا موقع ملے تو وہ خاموش بھی کم رہتی ہے مگر جواز ایک طرح خامیوں کا اعتراف ہوتا ہے۔ مجھے ان خامیوں کا بجا طور پر اعتراف ہے جو میرے مضمون میں موجود ہوں گی۔ لیکن نہ میں اہلِ زبان ہوں، نہ زبان فہمی کا دعویٰ کبھی کیا ہے۔ ادب سے تعلق مجھے اتنا ہی ہے جتنا تاریخ کو ادب سے۔ نہ زیادہ نہ کم۔

واقعات اظہری تاریخ بھی ہے اور ادب بھی۔ اس کے ادب ہونے کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اظہری کا دیوانِ جدید اس نسخے کا ایک حصہ ہے۔ مجھے اس نسخہ کی تلاش تو نہ تھی، لیکن اپنی تاریخی تحقیق کے دوران میں ایک روز اتفاقاً یہ نسخہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں نظر سے گذرا۔ نسخے کا تذکرہ سٹوری (Storey) نے اپنی فارسی ادب کی فہرست میں کیا تھا۔ لہٰذا نسخے کے ہاتھ آتے ہی میری دلچسپی بڑھ گئی۔ ابتداء میں مایوسی ہوئی کیونکہ وہ مسائل جو تاریخی تحقیق کے ضمن میں میرے ذہن میں موجود تھے اس نسخہ میں ان کا جواب نہ ملتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ میں نے نسخہ ابھی

پورا پڑھا بھی نہ تھا کہ واقعات کو مع دیوانِ جدید شائع کرنے کا ارادہ کر لیا۔

واقعات کا اثر مجھ پر وقتی نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے - قلعہ مبارک کے احوال کی جستجو مجھے ایک عرصے سے تھی۔ اس قلعہ کی زندگی باقی دنیا سے بالکل الگ تھی۔ اس لیے مؤرخین نہ اس کا مفصل ذکر کرتے ہیں نہ اس کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں - واقعات اظفری مجھے ایسا پہلا نسخہ ملا تھا جس میں قلعہ مبارک کے سب و روز، اس کے مکین کے احوال، ان کی تعلیم و تربیت، شادی بیاہ اور رسم و رواج وغیرہ کے متعلق کچھ مواد ملتا ہے۔ یہ حالات تفصیل طلب ہیں کیونکہ اظفری کی رہائی کے سلسلہ میں ضمناً آئے ہیں۔ لیکن پھر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ کاش اظفری کو قلعہ مبارک کے بارے میں کچھ اور لکھنے کا خیال آ جاتا۔

اظفری کا دہلی سے مدراس تک کا سفر دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی، دلچسپ اس لیے ہے کہ رہائی کے شوق اور حصول رہائی کی مشکلات نے واقعات کو ایسی صورت دے دی ہے جو پڑھنے والے کے استعجاب کو قائم رکھتی ہے۔ اہم اس لیے ہے کہ ان سے مختلف ملاقات کی آب و ہوا۔ امراء کی دھن اور عوام کی بود و باش پر روشنی پڑتی ہے - جغرافیائی اعتبار سے مختلف مقامات کی زمین، اس کی سطح اور موسم کے متعلق اظفری اپنے مشاہدات بیان کرتے ہیں۔ مزید براں واقعات میں زوالِ حکومتِ مغلیہ کی تصویر نہایت عبرت ناک ہے۔ وہ خاندان جس کی شان و شوکت کی داستانیں آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں زوال کے بعد کس حد تک برباد ہوا۔ اعتقادات، کم ہمتی اور بے عملی کے سبب، جادو، عملیات اور تعویز گنڈوں کے ذریعہ مشکلات کو حل کرنے

کی کوشش شہزادے اور شہزادیوں میں کس قدر جزو زندگی بن گئی تھی - یہ سب کچھ واقعات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے -

واقعات فارسی زبان میں ہیں لیکن نسخہ کے آخر میں دیوانِ جدید ریختہ میں ہے - عبارت کے درمیان بھی کہیں کہیں اردو فارسی اور ترکی قطعات آ جاتے ہیں - ابتدائی عبارت کو آیات قرآنی سے مزیّن کیا گیا ہے - اٹھارویں صدی کے دوسرے مؤرخین اور اظفری کی فارسی میں چنداں فرق نہیں لیکن قرآنی آیات سے تشبیہ مولوی خیرالدین محمد علی پانی پتی - غلام علی خاں یا محمد قاسم عبرت کے ہاں نہیں ملتی -

واقعات کا آغاز ۱۲۰۲ھ سے ہوتا ہے اور اختتام انیس سال بعد ۱۲۲۱ھ میں - اس وقت اظفری ۳۸ سال کے تھے اور اس کے بعد سترہ برس تک اور حیات رہے - اظفری کے وہ حالات جو انہوں نے خود بیان کئے ہیں نہایت دلچسپ ہیں اور ان کا ماخذ صرف واقعات اظفری ہے - بعد کے سترہ سال کے حالات سوانح مختار میں اور کچھ تذکرہ ''گلزار اعظم'' میں ملتے ہیں - ہمارا مقصد واقعات اظفری کا ترجمہ کرنا نہیں - بلکہ اظفری کی رہائی اور سفر کے متعلق دلچسپ تاریخی معلومات کو پیش کرنا ہے - دیوانِ جدید اٹھارویں صدی کے بیگماتی محاورے اور روز مرہ کا مجموعہ ہے جو ایک خاص مقصد کے تحت تدوین ہوا تھا - اس کی اہمیت ادبی اعتبار سے بھی بہت ہے یا کم از کم اس سے کہیں زیادہ ہے کہ وہ ایک مغل شاہزادے کا ادبی شاہکار ہے -

یہ کہنا دشوار ہے کہ واقعات اظفری کو اس سے قبل کس کس نے استعمال کیا ہے - البتہ اظفری گورگانی پر ایک مضمون جناب مولوی

محمد حسین محوی اردو انگچرار مدراس یونیورسٹی نے "اردو" اپریل ۱۹۴۰ء کے شمارہ میں شائع کیا - ان کا دعوی ہے کہ واقعات کا اردو ترجمہ اور دیوان جدید بھی مدراس سے شائع ہو چکا ہے - مگر شاید اب دستیاب نہیں - اظفری پر ایک مضمون انگریزی زبان میں ابو سعید بزمی انصاری نے انسائکلو پیڈیا آف اسلام میں شائع کیا ہے جو بہت مختصر ہے - ایک مضمون مولانا ڈاکٹر محمد شفیع صاحب قبلہ چیئرمین اردو انسائکلوپیڈیا آف اسلام پنجاب یونیورسٹی نے بھی تحریر کیا ہے جو تا حال شائع نہیں ہوا - واقعات اظفری کا ایک نسخہ مدراس یونیورسٹی کے کتبخانہ میں بھی ہے ہمارے نسخہ میں ہر صفحہ میں ۱۷ سطریں ہیں - ہر باب سرخ روشنائی سے شروع ہوتا ہے - اس نسخہ کی تکمیل خواجہ نصیرالدین نے ۹ شعبان ۱۲۲۷ھ میں کی - نسخہ میں واقعات ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ان اشعار، قطعات اور رباعیات کے علاوہ جو واقعات میں درج ہیں دیوانِ جدید میں ۷۹۲ اشعار ہیں - دیوانِ جدید حمد اور نعت کے دو شعروں سے شروع ہوتا ہے - واقعات کی ابتدا "بعد حمد پروردگار و درود حضرت رسول مختار ..." سے ہوتی ہے - یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارا نسخہ مدراس کے نسخہ سے ملتا ہے یا نہیں لیکن بقول محوی صاحب ان کے نسخہ میں بھی اشعار کی تعداد ۸۰۰ کے قریب ہے - انہوں نے انڈیا آفس کے نسخہ کے صفحات کا ذکر کیا ہے مگر ان کے اپنے نسخہ کے کتنے صفحات ہیں بیان نہیں کرتے -

بے جا نہ ہوتا اگر میں اس موقع پر چند ایک احباب کا شکریہ ادا کر دوں جن کی مدد کے بغیر واقعات اظفری پر کچھ تحریر کرنا یا دیوانِ جدید شائع کرنا تقریباً نا ممکن ہوتا - اس فہرست میں پہلا نام پروفیسر مس سکیلہ

شریف کا آتا ہے جن کے تعاون سے دیوان جدید نقل ہو سکا ۔ مس شریف کا اس لیے مزید مشکور ہوں کہ وہ اپوا کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے ایک بڑی ذمہ داری کے باوجود بھی وقت نکال کر میری مشکلات کے وقت آڑے آتی رہیں ۔ خدا انہیں جزائے خیر اور بلند مرتبہ عطا فرمائے ۔ آمین ۔

ڈاکٹر وحید قریشی صدر شعبہ فارسی اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور ان لوگوں میں سے ہیں جو تحقیق و تدریس میں مسلسل جد و جہد کے قائل ہیں ۔ خود کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں اور دوسروں کو ترغیب دینا ان کا نہایت دلکش مشغلہ ہے ۔ ڈاکٹر موصوف نے اس سلسلہ میں میری جس قدر ہمت افزائی فرمائی ہے محتاج بیان نہیں ۔ میں ان کا جس قدر بھی شکریہ ادا کروں کم ہے ۔

خواجہ نور الہی کا ذکر بھی یہاں تفصیل سے ہونا چاہیے ۔ یہ پنجاب پبلک لائبریری میں ہیں ۔ علم و ادب کے حلقے میں وہ کون با ذوق ہے جو صاحب موصوف سے متعارف نہیں اور ان کے گن نہیں گاتا ۔ سچ تو یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے ہر صاحب تحقیق کو موہ لیا ہے اور ہر ادیب ان کا مرہون منت ہے ۔ ان کی امداد اور تعاون کا شکریہ الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا ۔

مختصراً میں اپنے ان تمام احباب کا مشکور ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً مجھے اس کام میں مدد دی ہے یا مشورہ دیا ۔ فہرست اس قدر طویل ہے کہ فرداً فرداً تحریر کرنا مشکل ہے ۔ البتہ مجھے اپنے دو دوستوں کا مزید شکریہ ادا کرنا ہے جو اتفاق سے میرے شاگرد بھی ہیں ۔ ان دونوں حضرات یعنی خالد شمیق خان اور خالد مسعود قریشی نے از راہ عنایت دیوان جدید کی نقل کا اصل نسخہ سے دوبارہ تقابل کیا ۔

علی عباس

اورنگ زیب کے بعد

اورنگ زیب کی آنکھیں ابھی بند بھی نہ ہوئی تھیں کہ ہر طرف فتنہ و فساد کا غبار چھا گیا۔ بڑے بڑے امراء بادشاہ وقت سے کنارا کش ہو کر شاہزادوں کی طرف رخ کرنے لگے۔ بادشاہ کی آنکھیں بند ہوئیں اور خون بہنا شروع ہوا۔ عوام کا خون ہوا۔ فوج کا خون بہا، بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ شاہزادے اپنے ہی خون میں تڑپنے لگے۔ ایک شاہزادہ فاتح ہوا اور دوسرا مفتوح۔ وہی امراء جو ابھی بہادر شاہ عالم بادشاہ کے خلاف سمشیر بکف تھے۔ اب جھک جھک کر کورنش بجا لا رہے تھے۔ اور شاہ عالم نشۂ فتح میں مدہوش ہر ایک کو انعام و اکرام سے نوازتا رہا۔ مگر حالات بگڑے اور بگڑتے چلے گئے۔ راجپوت بغاوت پر اترے ہوئے تھے۔ سکھ فساد برپا کر رہے تھے۔ مرہٹے کمین گاہوں سے نکل کر پھر میدان میں آ گئے۔ شاہ عالم کبھی راجپوتانہ کی طرف دوڑتا کبھی بندہ بہادر کا تعاقب کرتا۔ کبھی دکن کا رخ کرتا۔ ضعیف العمری، بار حکومت اور مسلسل بغاوتیں۔ آخر تخت نشینی کے پانچویں سال ہی راہی ملک عدم ہوا۔

بہادر شاہ کی آنکھیں بند ہوئی تھیں کہ فتنہ و فساد کی آگ پھر بھڑک اٹھی۔ چاروں بیٹے خانہ جنگی پر آمادہ ہو گئے۔ عظیم الشان، شاہ عالم کا نہ صرف چہیتا بیٹا تھا بلکہ مثل دارا شکوہ صاحب قوت بھی تھا۔ مغلیہ فوج کے بیشتر امراء اس کے ساتھ تھے۔ مگر دارا شکوہ کی طرح قسمت اس کے ساتھ نہیں تھی۔ ذوالفقار خاں کا جہاندار شاہ

سے ملنا تھا کہ شاہزادے کی قسمت میں اندھیرا چھا گیا - پہلے تین بھائی مل کر اس کے خلاف صف آرا ہوئے - پھر رفتہ رفتہ جہاندار شاہ دوسرے بھائیوں کو تباہ کرکے خود تمام ملک پر قابض ہو بیٹھا - خدا کی شان کہ وہ شاہزادہ جس کے پاس فوج تھی نہ روپیہ تھا - نہ دل تھا نہ جواں مردی تھی آج ذوالفقار خان کی بدولت ہند کا والی تھا - حکومت کے انتظام میں وہ سب کہاں جو لال کنور[1] کی زلف گرہ گیر اور رقص و سرود میں تھا - دربار تا حال عالمگیری منصب داروں سے مرصع تھا - مگر جہاندار شاہ کے ہم مذاق کا فقدان اسے ایک آنکھ نہ بھاتا - چنانچہ لال کنور کے ہم پیشہ اور کم ظرف لوگوں کو بڑے بڑے منصب دے کر فہرست امراء میں شامل کیا گیا - یہ بے سروسامانی کے دن چلتی - فرخ سیر[2] نے باپ کے خون ناحق کا بدلہ لینے کا عزم کیا اور سادات بارھہ کی مدد سے جہاندار شاہ کو شکست دے کر حکومت پر قابض ہو بیٹھا - یہ شاہزادوں کی خانہ جنگی اور کشمکش کا آخری دور تھا - اس کے بعد شاہزادوں کا آپس میں نہیں بلکہ امراء اور بادشاہ کی کشمکش کا آغاز ہوتا ہے - فرخ سیر سادات بارھہ کی بدولت بادشاہ تو بن بیٹھا مگر اب خود ان کی انگلی کے اشارے پر ناچنا - وہ جس کل چاہتے فرخ سیر کو اٹھاتے یا بٹھاتے اور وہ ٹس سے مس نہ ہوتا - جب بادشاہ کو ہوش آیا اور اس نے حکومت کا اقتدار خود لینا چاہا تو پانی سر سے گزر چکا تھا - سادات اتنے طاقت ور تھے کہ بادشاہ کو حکومت سے بر طرف کر کے نابینا کر دیا اور رفیع[3] الدراجات کو محبس[4] سلاطین سے نکال کر تخت

---

(۱) ایک بیسوا تھی -
(۲) عظیم الشان کا بیٹا -
(۳) رفیع الشان کا بیٹا -
(۴) اس کا ذکر آگے آئے گا -

طاؤس پر بٹھا دیا مگر شاہزادہ جوانی کے عالم میں دق شراب کے ساتھ ساتھ حکومت کا بار نہ اٹھا سکا۔ سادات بارھہ نے اسے حکومت کا اہل نہ سمجھ کر برطرف کر دیا مگر ابھی ایک ہفتہ نہ گزرا تھا کہ وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ رفیع الدرجات کی برطرفی کے بعد سادات اس کے بڑے بھائی رفیع الدولہ کو پکڑ لائے اور تخت طاؤس پر لا بٹھایا۔ مگر وہ عمر بھر [illegible] چکے ہوئے۔ چنانچہ تقریباً دس ماہ کی قید سادات کے بعد ملک عدم کو سدھارے۔

سادات اس مرتبہ محل سے جہاں شاہ بن شاہ عالم کے بیٹے روشن اختر کو لے آئے اور محمد شاہ کے لقب سے تخت نشین کیا۔ مگر سادات کا زمانہ عروج ختم ہو رہا تھا۔ اور تورانی امراء کی سازش زور پکڑ رہی تھی۔ بالآخر پہلے سید حسین علی قتل ہوئے اور بعدہٗ سید عبداللہ۔ محمد امین خان نے وزارت کا عہدہ سنبھالا مگر عتاب نامود[1] سے جانبر نہ ہو سکے۔ اور انتقال کیا۔ وزارت کا عہدہ اب نظام الملک کو ملا۔ مگر درباری امراء نے سازشوں کا جال پھیلا دیا اور نظام نے بادشاہ کی بے تعلقی سے مایوس ہو کر واپسی کا ارادہ کیا۔ مرہٹوں نے جنوبی ہند کے بیشتر حصوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ پنجاب میں سکھ باقاعدہ طور پر صف آرا ہو رہے تھے۔ اور دیگر جانب کی تمام مصروفیات انہی کی سرکوبی میں تمام ہوتی تھیں۔ یہی ہنگامے حکومت کی جڑیں کھوکھلی کرنے کو کم نہ تھے کہ اسی زمانہ میں نادر شاہ نے تخت فارس پر قبضہ

۱۔ ایک ایرانی جادوگر تھا جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور ہندوستان میں متعدد لوگوں کو گمراہ کیا تھا۔ محمد امین نے نامود کو ختم کرنا چاہا مگر اچانک بیمار پڑا اور مر گیا۔ نامود نے کہا کہ وزیر اس کے عتاب سے مر گیا۔ نامود نے ایک عجیب و غریب زبان میں ایک کتاب بھی تالیف کی تھی جسے وہ خود ہی پڑھ سکتا تھا۔

کرکے ہندوستان پر حملہ کر دیا اور میدان کرنال میں مغلیہ فوج
کو شکست دے کر دہلی پہنچا اور مال و دولت سمیٹنے لگا۔ دہلی کے
قتل عام نے دولت سمیٹنے میں مزید مدد دی۔ امراء خود اپنے خزانے
نذرِ فاتح کرنے لگے۔ نادر شاہ تقریباً ستّر کروڑ کا سامان اور تخت طاؤس
لے کر عازم قندھار ہوا۔ ایرانی حملہ نے مغلوں کی رہی سہی ساکھ بھی
ختم کر دی۔ خزانے خالی ہو گئے۔ نظام الملک نے دکن پر قبضہ کر
لیا۔ علی وردی خان بنگال میں خود مختار ہو گیا۔ اس زمانہ میں
محمد شاہ چل بسا اور دکن میں نظام الملک نے بھی انتقال کیا۔
برہان الملک، نادر شاہ کے قیام دہلی ہی میں مر چکا تھا۔ پرانے امراء
رفتہ رفتہ دم توڑ گئے۔ نئے امراء حریص بھی تھے اور خود غرض بھی۔
ان کا تمام تر وقت سازشوں کی تکمیل یا جاگیروں کی تحصیل میں گذرتا
تھا۔ محمد شاہ کے بعد اس کا نو عمر بیٹا احمد شاہ تخت نشین ہوا
یہ ایک رقاصہ قدسیہ بیگم کے بطن سے تھا۔ بری صحبت نصیب
تھی۔ اور طبعاً عیاش تھا۔ صفدر جنگ جس نے برہان الملک کے انتقال
کے بعد اودھ کی صوبہ داری حاصل کر لی تھی اپنے نائب کو جاگیر میں
چھوڑ کر احمد شاہ کا وزیر ہوگیا مگر قدسیہ بیگم اور جاوید خان،
خواجہ سرا کو ایک آنکھ نہ بھایا۔ صفدر جنگ اسی اثنا میں روہیلوں
سے بھڑ پڑا اور مغلیہ فوج لے کر دو مرتبہ احمد خان کے مقابلہ میں
نکلا مگر شکست کھائی۔ آخر مرہٹوں کی مدد سے روہیل کھنڈ کو تباہ
کرنے نکلا۔ مگر احمد شاہ ابدالی کے حملہ نے واپسی پر مجبور کیا۔
ادھر قدسیہ بیگم نے نظام الملک کے پوتے غازی الدین عماد الملک سے
سازش مکمل کر لی۔ جاوید خان خواجہ سرا بھی اس سازش میں شریک
تھا۔ صفدر جنگ کو واپسی پر کچھ بوئے مخالفت آئی۔ اس نے جاوید خان

دو گھر ملا کر مروا دیا۔ مگر مخاصمت کی خلیج وسیع تر ہوتی گئی۔ عماد الملک نوعمری کے باوجود نہ صرف عمدہ سیاست دان تھا بلکہ ہوا مردی اور شہسواری میں بھی اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ صفدر جنگ کی شکست میں مضمر در اصل عماد الملک کی ہی فتح تھی۔ چنانچہ دہلی کے کوچہ و بازار جنگ آماد ہوگئے۔ صفدر جنگ نے سورج مل جاٹ کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ عماد الملک نے مرہٹوں کو خرید لیا۔ ایک جانب سے جاٹ آتے اور غریب شہریوں کو لوٹ لے جاتے، دوسری جانب سے مرہٹے آتے اور محلہ تاراج کر جاتے۔ غرض چھ ماہ کی طویل مدت کے بعد صفدر جنگ اودھ جانے پر رضامند ہوا اور خلعت وزارت انتظام الملک بن محمد امین خاں وزیر کو عطا ہوا۔ عماد الملک میر بخشی رہے اور بادشاہ و ملکہ کی توجہ خاص کا مرکز ہوگئے۔ مگر انتظام الملک عماد سے خائف تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ رفتہ رفتہ بادشاہ کو میر بخشی کے خلاف بدظن کر دے چنانچہ جب عماد الملک جاٹوں کے خلاف مہم میں شریک تھا انتظام، احمد شاہ کو ورغلا کر سکندریہ لے گیا کہ در پردہ سورج مل کی امداد کی جائے مگر مرہٹوں کو بر وقت خبر مل گئی، ہولکر جمنا کو عبور کرنے کے بعد یکایک سکندریہ پر حملہ آور ہو گیا بادشاہ و وزیر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے کہ حرم کا ہوش نہ رہا جو مرہٹوں کے ہاتھ لگیں مگر با عزت و احترام عماد کے حوالے کر دی گئیں۔ عماد ہولکر کی معیت میں دہلی پہنچا۔ قلعہ بند تھا۔ لہذا محاصرہ کرنا پڑا۔ احمد شاہ متواتر صلح کی درخواستیں بھیج رہا تھا لہذا عماد نے انتظام کی برطرفی کی شرط پیش کی۔ شرط قبول ہوئی۔ انتظام وزارت سے علیحدہ کر دیا گیا اور خلعت وزارت خود عماد نے پہن لیا۔ دربار میں اپنے آدمی متعین کیے۔ احمد شاہ اور اس کی والدہ چونکہ

امراء کی سازشوں میں شریک رہتے تھے اس لیے ہر وزیر کے لیے باعث خطرہ تھے - چنانچہ چند روز بعد عماد الملک نے احمد شاہ کو تخت تیموری سے معزول کرکے جہاندار شاہ کے بیٹے عزیزالدین کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت نشین کیا مگر مرہٹوں کا زور جنوب کی طرف سے اور افغانوں کے حملے شمال کی طرف سے اس قدر متواتر اور شدید تھے کہ مغلیہ حکومت کا حملۂ نادری کے بعد سنبھلنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا - شمالی ہندوستان میں مرہٹوں اور افغانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت بالآخر انہیں ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے میدان پانی پت میں لے آئی - جہاں چند گھنٹوں میں مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی اور ان کے بڑے بڑے سردار میدان میں کام آئے -

اسی دوران میں انگریزوں نے بنگال میں قدم جما لیے تھے- غیر مسلم تعاون اور مسلم غداری کے سبب مسلمان حکومت کا صرف نام رہ گیا تھا- قوت در اصل انگریز تاجروں کے ہاتھ میں تھی جو اب تمام ہندوستان پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے -

عالمگیر ثانی جنگ پانی پت سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا تھا - اس کا بڑا لڑکا عالی گوہر وزیر دشمنی میں گھر سے نکلا اور اودھ جا پہنچا یہاں شجاع الدولہ اور محمد قلی خاں نے اسے انگریزوں کے خلاف بھڑکایا وہ ابھی بہار ہی میں قسمت آزما تھا کہ باپ کی موت کی خبر آئی - مسافرت میں ہی جامۂ شاہی زیب تن کیا اور شاہ عالم ثانی کا لقب اختیار کیا - انگریزوں سے لڑائی راس نہ آئی - بکسر کے مقام پر شجاع الدولہ کی شکست نے انگریزوں کی برتری واضح کر دی - شاہ عالم پیشتر ہی انگریزوں سے گفتگو کر رہا تھا - چنانچہ بادشاہ کی موافقت نے انگریزوں کی سیاسی منصوبہ بندی کے لیے مزید راستے کھول دیے- کلائیو نے

۱۲ اگست ۱۷۶۵ء کو شاہ عالم سے مبلغ ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ کے عوض بنگال بہار اور اڑیسہ کی دیوانی لکھوا لی۔

شاہ عالم الہ آباد کی رہائش سے غیر مطمئن تھا۔ وہ انگریز کی مالیہ خوار کی حیثیت سے زیادہ عرصہ نہ گزار سکا اور اپنے آبائی وطن کو لوٹنے کے لئے مرہٹوں سے ساز باز کرنے لگا۔ انگریزوں نے ہر چند اسے روکنے کی کوشش کی مگر شاہ عالم مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ لہذا ۱۷۷۱ء کے اواخر میں عازم دہلی ہوا۔

دہلی میں شاہ عالم کی عدم موجودگی اور پانی پت کے مقام پر مرہٹوں کی عبرتناک شکست نے وقتی طور پر روہیلوں کو برسراقتدار کر دیا تھا۔ نجیب الدولہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ضابطہ خان دہلی میں خود مختارانہ حکومت کر رہا تھا اور بادشاہ کی غیر موجودگی میں حرم میں داخل ہو جاتا اور ناشائستہ حرکتیں کرتا۔ چنانچہ شاہ عالم نے الہ آباد ہی سے اس کی برطرفی کا فرمان ارسال کیا تھا۔ جسے قوت نافذہ میں یہ درگذر کر گیا۔ دہلی پہنچ کر شاہ عالم نے پہلا کام یہی کیا کہ ضابطہ خان کو دہلی سے باہر نکالا اور بعدہ جب اسے معلوم ہوا کہ وہ اس کی بہن خیرالنساء سے ناجائز تعلقات قائم کر چکا ہے تو وہ مرہٹوں کو ہمراہ لے کر غوث گڑھ کی طرف جوش انتقام میں دوڑ پڑا۔ اور ضابطہ خان کی جاگیر کو تباہ و برباد کر دیا۔ اور اس کے لڑکے غلام قادر کو قید کر کے ہمراہ لے لیا۔

شاہ عالم حسن پرست بھی تھا اور عیاش بھی۔ غلام قادر کو اس کی خداداد خوبصورتی کے سبب زنانہ لباس زیب تن کرا کر دربار میں اپنے قریب بٹھاتا تھا۔ ایک دن غلام قادر شاہ عالم کے پاس سے بھاگ کر پھر اپنے باپ کے پاس جا پہنچا اور انتقام کی تدابیر سوچنے لگا۔

باپ کے انتقال کے بعد وہ روہیلوں کا سردار بن بیٹھا اور دہلی میں اسماعیل خان سے ساز باز کرکے شاہی قلعہ پر حملہ آور ہو گیا ۔

شاہی خاندان پر غلام قادر کے مظالم تاریخ کے طالب علم سے پوشیدہ نہیں ۔ نہ ان کا دہرانا ہمارا مقصد ہے ۔ یہی وہ زمانہ تھا جسے اظفری نے بچشم خود دیکھا اور بعد رہائی تحریر کیا ۔ اور یہی وہ دور تھا جس میں اظفری نے پرورش پائی اور تعلیم حاصل کی درآنحالیکہ وہ قید میں تھا ۔

قید سلاطین :

شاہ عالم بہادر شاہ کے انتقال کے بعد معزالدین جہاندار شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی تمام شاہزادوں کو جو خانہ جنگی میں حیات رہ گئے تھے قلعہ مبارک میں نظر بند کر دیا ۔ اس کا مقصد در اصل یہ تھا کہ خانوادۂ تیموری کی نسل بھی جاری رہے اور وہ بادشاہ وقت کے خلاف بغاوت کے قابل بھی نہ رہیں ۔ قلعہ کے اندر شاہزادوں کو مختلف حجروں میں رکھا جاتا تھا ۔ ان کے وظائف مقرر تھے ۔ ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہوتا تھا ۔ شادی بیاہ کے سلسلے ہوتے تھے ۔ جن میں اکثر بادشاہ بھی از راہ کرم شرکت کرتے تھے ۔ اگر قید تھی تو صرف اتنی کہ قلعہ سے بغیر سلطانی اجازت نہ جا سکتے تھے ۔ مگر قید بہرحال قید تھی ۔ سہولتیں ہر چند ہوں مگر پھر بھی قید میں امراء اور شاہزادوں کی شایان شان اہتمام نہ تھے ۔ جو آزادی کی ہوا میں ہو سکتے ہیں ۔ اس لیے اس قید نے شاہزادوں کی ہمتوں کو پست اور حوصلوں کو مردہ کر دیا تھا ۔ ان کی جانیں اکثر خطرہ میں رہتی تھیں ۔ ایک کی ناعاقبت اندیشی بہت سے خون سر لے لیتی ۔ فرخ سیر کی برطرفی کے بعد سادات بارھہ نے قید سلاطیں سے شاہزادوں کو نکال کر

بادشاہ بنانا شروع کیا - جس نے قید سلاطین میں ایک نئی روح پھونک دی -
اور شاہزادے بادشاہی کے خواب دیکھنے لگے - محمد شاہ کی طویل حکومت
۱۷۴۸ء میں ختم ہوئی تو اس کا بیٹا احمد شاہ تخت نشین ہوا - مگر احمد شاہ
کا بھی حشر ہوا جو فرخ سیر کا ہوا تھا - اور اس مرتبہ سادات بارھہ
کا عمل عمادالملک نے ادا کیا اور احمد شاہ کو تخت سے معزول کرکے
جہاندار شاہ کے ضعیف العمر بیٹے عزیزالدین کو عالمگیر ثانی کے لقب
سے تخت پر بٹھا دیا - اس قسم کے اقدام سے قید سلاطین میں جہاں
شاہزادوں کے دلوں میں بادشاہی کی ایک موہوم تمنا نے جنم لیا وہاں
فرخ سیر اور احمد شاہ کے انجام نے ان کے دلوں میں ایک خوف اور
ہراس بھی پیدا کر دیا - یوں تو قید و بند سے نکلنے کی خواہش
فطری ہے مگر ان واقعات کے بعد متعدد شاہزادوں نے جان ہتھیلی
پر رکھ کر قید سلاطین سے فرار کا ارادہ کیا - مگر ارادہ تو درکنار
اس قسم کے باغی خیالات کا ہونا بھی قید میں قابل گردن زدنی تھا -
قید میں ہر وقت جوجے اور شاہی پیادے مسلط رہتے جو ہر آتے جاتے پر
کڑی نظر رکھتے - سرکاری قاعدہ تھا کہ ہر روز ناظر کل محاورت کا
نائب انہیں سلام کرنے اور دیکھنے کی غرض سے آتا جو مردانے تک
کے افراد کی دیکھ بھال کا ذمہ دار تھا - زنانے کے لیے ایک عورت بھی
قلعہ میں متعین تھی جسے ''ناربردار'' کہا جاتا تھا - یہ عورت محل
دار بیگم کی طرف سے نائب مقرر ہوتی اور رات دن میں چار مرتبہ
ڈیوڑھی سلاطین پر حاضری دیتی - اس کا فرض تھا کہ جس حالت میں
بھی شاہزادے ہوں انہیں اپنی آنکھ سے دیکھ کر جائے اور یہ بھی
معمول تھا کہ تین پہر دن ڈھلے سلاطین کی ڈیوڑھیاں بند ہو جاتی
تھیں - اندر اور باہر سے دروازوں میں تین تین قفل ڈالے جاتے تھے

کنجیاں ناظر کل کے پاس چلی جاتی تھیں - ان تمام مشکلات کے باوجود چند ایک شاہزادے قید سلاطین سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے - انہی میں سے ایک مرزا ظہیر الدین اظفری بھی تھے -

اظفری کا سلسلہ نسب :

مرزا اظفری[1] کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے :

عالمگیر اورنگ زیب
|
شاہ عالم اول
|
جہاندار شاہ
|
عزیز الدین عالمگیر ثانی — عصمت آرا بیگم

عزیز الدین عالمگیر ثانی
|
شاہ عالم ثانی

عصمت آرا بیگم
|
سلطان محمد عیسیٰ
|
سلطان محمد ولی
|
ظہیر اظفری
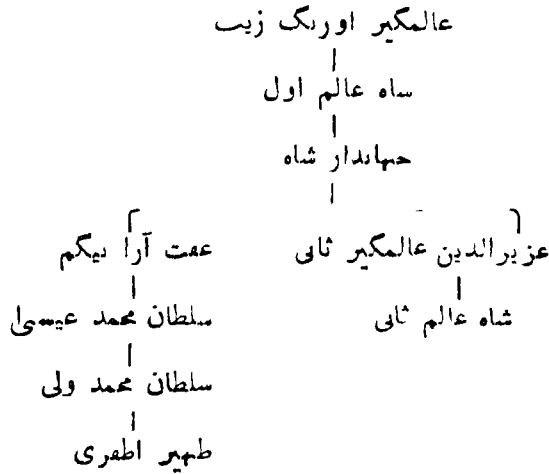
یعنی اظفری کے والد کی دادی (عصمت آرا بیگم) شاہ عالم ثانی کی سگی پھوپھی تھیں یا اظفری کے دادا سلطان محمد عیسیٰ شاہ عالم کے سگے پھوپھی زاد بھائی تھے - اظفری کے والد جو بالعموم منجھلے صاحب کے نام سے موسوم تھے قلعۂ مبارک ہی میں پیدا ہوئے - وہیں پلے اور بڑھے، وہیں شادی ہوئی اور نہایت شریفانہ حیثیت سے زندگی کے بقایا ایام گزار دئے اور محرم الحرام شب جمعہ ۱۲۰۰ھ اس دار فانی سے کوچ کر گئے[2]- اظفری کے دو بڑے بھائی باپ کی موجودگی ہی میں فوت

---

(۱) اظفری کا پورا نام مرزا ظہیر الدین علی محب اظفری تھا -

(۲) اظفری نے باپ کی وفات پر قطعہ تاریخ کہا - قطعہ یہ ہے -

گر تو تاریخ وفات آں ولی را طلبی   ہر کس از تاریخ ہر دو حرف علت اظفری

درمحرم ہم شب آدینہ دنیا را گذاشت   روز جمعہ شد عواب اندر مرزا انوری

ہو گئے تھے - اظہری کی والدہ کا نام نہ واقعات اظہری میں ملتا ہے اور نہ اس زمانے کے دیگر تذکرہ نگاروں کے حوالوں میں - بہر حال یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت ابوالعلا خواجہ محمد شاہ خواجہ نوراللہ سعیدی بن حضرت ابوالوفا حسینی کے خاندان کا چشم و چراغ تھیں - بڑی متودہ صفات اور نہایت عفت مآب خاتون تھیں - بقول اظہری انہوں نے کبھی اپنے حقیقی بھائی کے بچوں کو محبت اور پیار سے بوسہ نہیں دیا بلکہ جب بچے چار سال سے زیادہ ہو جاتے تو ان سے اپنا چہرہ چھپاتی تھیں اور بالمشافہ انہیں نہیں دیکھتی تھیں - اظہری کے بیان کے مطابق قلعہ مبارک میں چند ایک خواتین سے کرامتیں ظاہر ہوتی تھیں ان میں سے ایک اس کی والدہ بھی تھی - منجھلے صاحب (اظہری کے والد) کے انتقال کے بعد بھی یہ بہت دن حیات رہیں اور جب اظہری قلعہ سے رہائی کے بعد مدراس پہنچے تو یہ انہی کے پاس پہنچ گئیں اور ۱۰ ماہ جمادی الاول ۱۲۲٦ھ میں بعارضۂ سرسام انتقال کیا - میاں قاسم علی پیر زادہ کے باغ میں دفن ہوئیں جو عنایت باغ اور حضرت قادر ولی کے جھنڈے اور برخدابس باغ کے متصل واقع تھا - مرزا اظہری یہیں رہتے تھے - مگر اب نہ اس باغ کا پتہ ہے نہ مزار کا - قادر ولی کے جھنڈے کے نام پر ایک بازار اور چوراہا البتہ موجود ہے -

مرزا اظہری کی ایک بہن فیض النساء بیگم تھیں جن کی شادی اپنے چچیرے بھائی مرزا ہمایوں بخت سے ہوئی - ایک چھوٹے بھائی مرزا جلال الدین عرف چھوٹے مرزا لکھنؤ میں آباد تھے -

اظہری کی تعلیم و تربیت :

مرزا اظہری ۱۱۷۲ھ میں قلعہ مبارک میں پیدا ہوئے جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں ذکر ہوا ہے - قلعہ میں تعلیم و تربیت کا مناسب

بندوبست نہیں تھا۔ لیکن تمام تر دشواریوں کے باوجود اس زمانے کی تعلیم و تربیت کا بہترین نمونہ تھے۔ فطری غیر معمولی طور پر ذہین تھے۔ ادب کا ذوق بھی فطری ودیعت تھا۔ عربی، فارسی اور اردو و ترکی زبانوں کے ماہر تھے۔ اردو مادری زبان تھی۔ فارسی اور ترکی زبان میں بھی تصانیف پائی جاتی ہیں۔ عربی سے اردو میں ترجمہ کی مہارت تھی۔ نیز عربی کے علاوہ ہر زبان میں شعر کہتے تھے۔ اردو کے مسلم الثبوت استاد مانے جاتے ہیں۔ قلعہ مبارک کے باقی تمام شاہزادوں سے زیادہ لائق اور فائق تھے۔ فارسی اور ترکی زبان میں بے تکلف درس بھی دیتے تھے۔ اہل قلعہ اور متقدر شاہزادے اکثر اہم معاملوں میں ان سے مشورہ لیتے۔ قلعہ مبارک میں مدرس اور نگراں کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ خود اپنے چچیرے بھائی اور چھوٹی مرزا ہمایوں کو تعلیم دیتے۔ شاہ‌عالم بادشاہ بھی ان کے ذوق ادب کی قدر کرتے اور قلعہ مبارک کے متعلق معلومات فراہم کرنے کا مرکز یہی تھے۔

اس کے علاوہ فطری کو فن طب، رمل، عروض اور فن شعر میں بھی دخل تھا۔ وہ خود تو یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ انہیں انگریزی بھی آتی تھی مگر ان کے ایک مدراسی شاگرد نے ایک شعر میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

تھا انگریزی میں بھی انہوں کو عبور
دم عیسوی ان سے پایا ظہور (نادر)[1]

شعر و شاعری کے ذوق نے موسیقی سے بھی رغبت پیدا کر دی تھی۔ البتہ فن شہسواری کا قلعہ مبارک کی زندگی میں کوئی موقعہ تھا نہ گزر۔ عبرت کا مقام ہے کہ اولاد تیموری اس زمانہ میں شہسواری کو

(۱) نادر کا دیوان قلمی نسخہ کی صورت میں گورنمنٹ کتب خانہ مدراس میں محفوظ ہے۔

ترسے - مگر دل میں ولولہ ضرور تھا - چنانچہ لکھنؤ پہنچتے ہی نواب آصف الدولہ سے بیر اندازی سیکھی اور خوب مشق بہم پہنچائی -

قید خانہ کی زندگی نے انہیں علوم کا شوق بھی پیدا کر دیا تھا جو مستقبل کے حالات کا پتہ بتلاتے ہیں - چنانچہ علم رمل میں خاص دسترس بھی ان کے استخراج اکثر واقعہ کی صورت میں نمودار ہوتے کہ یہ خود حیرت میں پڑ جاتے - اس سلسلہ میں ایک حوالہ دیتے ہیں کہ انہوں نے علم رمل سے غلام قادر کی گرفتاری اور شاہ عالم کے دوبارہ تخت نشینی کی تاریخ نکالی اور بادشاہ کے پاس مخفی طور پر روانہ کر دی - چنانچہ جو کچھ اظفری نے تحریر کیا تھا اسی کے مطابق عمل میں آیا - اس کے علاوہ بھی اظفری نے کئی ایک واقعے درج واقعات کیے ہیں -

طبابت میں اظفری حکیم عنایت اللہ خان دہلوی کے آگے زانوے ادب طے کرتے رہے - یہ حکیم عبد اللہ خان کے بیٹے تھے جو جہاندار شاہ کے حرم محترم کے طبیب خاص تھے - اظفری کے والد نے انہیں خطاب "خانی" سے نوازا تھا - عنایت اللہ نے حسن دل و جان سے اظفری کی رہنمائی کی وہ ان کی طبی قابلیت سے ظاہر ہے - حکیم موصوف نے ایک کتاب بھی فن طب میں تالیف کرکے اظفری کے نام منسوب کی - ان کے بعد اظفری حکیم میر حسن بن حکیم میر امام الدین دہلوی سے طبی فوائد حاصل کرتے رہے اور تقریباً چار سال تک مہارت طب - تجربہ قارورہ و نبض و خاصی میں درس حاصل کرتے رہے - قیام قلعہ مبارک میں بیماروں کا علاج خود اظفری کرتے تھے اور بالآخر فن طب میں ایک رسالہ بھی تالیف کیا - جن دیگر اطباء سے اظفری وقتاً فوقتاً استفادہ حاصل کرتے رہے ہیں ان کا ذکر واقعات میں بالتفصیل آیا ہے -

علم معرفت :

اظفری کی علوم معنوی سے رغبت اس کے اتقا اور پرھیزگاری کی دلیل تھی۔ لیکن قید سلاطین نے اسے تا حال کسی کا مرید نہ ہونے دیا تھا۔ ایک روز موقعہ پا کر اظفری سید انوار اللہ قادری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ جامع مسجد کے خطیب تھے۔ مولانا موصوف اپنے زمانے میں علوم معرفت میں یکتا تسلیم کیے جاتے تھے۔ اظفری کے ہمرا دو شاہزادے مرزا ہمایوں اور مرزا جلال الدین بھی تھے۔ تینوں نے مرشد کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مولانا، اظفری کی دینی معلومات اور اخلاق سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً خلعت خلافت سے سرفراز فرمایا اور وہیں ان کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ ہر دو شاہزادوں کو ہدایت کی کہ ان کی ہر ممکن تعظیم کریں اور فرمایا کہ انہیں میرا خلیفہ جان کر میری ہی طرح سمجھیں اور کبھی ان کے خلاف کوئی بات نہ کریں۔ پھر اسی مجلس میں اپنی مہر اور بیعت نامہ مع سلسلہ پیری و مریدی عنایت فرمایا اور مرید بنانے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ لیکن اظفری نے اپنی خانہ بدوشی کے تحت کبھی مرید نہ بنائے۔

اظفری کی والدہ جیسا کہ سطور بالا میں ذکر ہے ایک برگزیدہ خاندان سے متعلق تھیں۔ اظفری خود کہتے ہیں کہ۔ ہر چند ماں یا باپ کی طرف سے عاصی کی اصل و نسل میں کوئی قصور نہیں ہوا لیکن تقوی میں فتور عظیم برپا ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم کرامت اور خرق عادت سے بہت دور جا پڑے ہیں۔

اظفری اور قید سلاطین :

اظفری کے لیے قید سلاطین کی پابندیاں بہت صبر آزما تھیں۔ وہ

ایک وسیع قلب و دماغ لے کر پیدا ہوا تھا۔ اس کی طبیعت میں جولانی تھی وہ عالموں کی حس ر کھتا تھا جو اپنے آزاد دنیا میں پہنچنے پر لگساتی تھی اس لیے نہیں کہ وہ حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں۔ بلکہ محض اس لیے کہ شاید ان سے کوئی کارِ خیر سرانجام پا جائے اور ملک و وطن کی کوئی خدمت ادا ہو سکے۔ لیکن قلعہ کی حدود میں اس قسم کا تخیل بھی ایک سنگین جرم تھا۔ لہذا اظفری کے دل کی دل ہی میں رہی اور وہ حرف بدعا زبان پہ لا سکے۔

اسی دوران میں غلام قادر روہیلہ نے بغاوت کی۔ شاہ عالم کی آنکھیں نکال لی گئیں۔ خلافت کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ دروس کھود کر ویرانے نکالے گئے۔ حرم شاہی کی بدذلیل ہوئی۔ شہزادیاں بے آبرو ہوئیں۔ طرح طرح کے مظالم توڑے گئے کہ کسی طور پوشیدہ خزانوں کے راز معلوم ہو جائیں جو کچھ ملا لوٹ لیا گیا۔ جب قلعہ معلیٰ لٹ چکا تو قلعہ سلاطین کی باری آئی۔ یہاں بھی اس قسم کے مصائب کی بوچھار رہی۔ والیٔ حیل نامی ایک دلال نے غلام قادر کی خوشنودی کے لیے چند حسین شہزادیوں کے نام لیے اور وہ اسی رات موتی محل میں برہنہ غلام قادر کے حضور میں پیش ہوئیں۔ غرض جب خانوادۂ تیمور پر ایسی قیامتیں ٹوٹ رہی تھیں اس وقت اظفری نے حق المقدور حرم شاہی کی حفاظت کی اور کئی ایک شہزادیوں کو بے آبرو ہونے سے بچا لیا۔ غلام قادر کے حملہ کے بارے میں بھی اظفری نے پیش از وقت شاہ عالم کو اطلاع دے دی تھی۔ وہ اپنے واقعات میں ذکر کرتے ہیں کہ "ہم اس نمک حرام کے عزم فساد سے بہتر ہی واقف تھے"۔ چنانچہ (ہم نے) ایک عریضہ اپنی پھوپھی صاحبہ کے ہاتھ حضرت قدرت[1]

(۱) شاہ عالم ان سے مراد ہے۔

کے حضور بھجوایا تھا مگر بادشاہ سلامت کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے تھے اور وہ غلام قادر سے بہت محبت رکھتے تھے - عرضی دیکھ کر فرمایا ''میں نہیں سمجھتا کہ اس یتیم کے ساتھ ہر خاص و عام کو اس قدر عداوت کیوں ہے - پھر پھوپھی صاحبہ سے فرمایا - ''میرے بچوں سے کہہ دو کہ تم ابھی بچے ہو - ان باتوں کو کیا جانو - غلام قادر خانہ زاد اور حضور کا نمک پروردہ ہے - یہ کیا مقدور رکھتا ہے کہ گستاخی کا قدم آگے بڑھائے - یہ سب خلق اللہ کی افترا ہے - سب فرزند خاطر جمع رکھیں'' - آخر چند روز کے بعد ہی فتنہ کا آغاز ہوا اور ایسا ہوا کہ تخت حکومت متزلزل ہو گیا - تمام شہر میں پہلے ہی شہرت پھیل گئی تھی - ۱۰ محرم الحرام ۱۲۰۳ھ کو اس نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا - اور بادشاہ کو گرفتار کر لیا - یہ وہ دن تھا کہ انسان اپنے بھائی - ماں باپ اور بیوی سے بھاگتا تھا - قلعہ والوں کی حالت ''یوم یکون الناس کا الفراش المبثوث'' کی تفسیر تھی - سمسہ بارود اور گولے سے محلات کی چھتیں اڑ گئی تھی - اور ایک زبردست دھماکہ ہوا گویا صور اسرافیل کی صدا تھی جو ''القارعہ ما القارعہ وما ادراک ماالقارعہ'' کی یاد دلاتی تھی - دیوار و در کے گرنے سے گرد و غبار ہوا میں پھیل گیا جس سے ''اذاالشمس کورت'' کا منظر ہویدا ہوا - اور مسلسل گولہ باری سے زمین و زماں لرز اٹھے - قلعہ کے کنگرے گرنے لگے جن سے ''وتکون الجبال کالعھن المنفوش'' کا سماں ظاہر تھا - اطہری کہتے ہیں کہ ہمارے رہنے کا محل قریب ہی تھا - گولہ بارود کی ضرب سے چند بھائیوں اور پھوپھی صاحبہ کے سر پر اور پاؤں پر بھی چوٹیں آئیں - گو جانیں سلامت رہیں - اہل قلعہ کی آہ و بکا نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا -

دھونیں اور کثرت گرد و غبار سے صرف آوازیں کان میں پڑتی تھیں۔ کسی کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ تمام رات طرح طرح کی آفتوں کا سامنا رہا۔ صبح ہوتے ہی غلام قادر اپنی فوج لے کر قلعہ پر آ چڑھا۔ لیکن سب اللہ تعالی کی حفاظت میں رہے۔

غلام قادر نے شاہ عالم کو معزول اور اندھا کر کے بیدار شاہ ایک اور شہزادے کو محبس سلاطین سے نکال کر تخت نشین کر دیا تھا مگر مرہٹوں کی آمد آمد سے غلام قادر کو دارالحکومت خالی کرنا پڑا۔ اور جب مرہٹوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کر کے شاہ عالم کو بحال کر دیا تو غلام قادر نے شاہ عالم کی خوشنودی کے لیے بیدار شاہ کو معزول کر کے اکبر شاہ پسر شاہ عالم کو تخت نشین کر دیا۔ یہ سب کچھ تیرہ دن کے اندر اندر ہوا۔ جب شاہ عالم کو معلوم ہوا کہ ولی عہد تخت نشین ہو گیا ہے تو اس نے فوراً خوشی کے پیغامات اور غلام قادر کا معافی نامہ روانہ کیا۔ لیکن مرہٹوں نے اس خلوص کو تسلیم نہیں کیا بلکہ خود شاہ عالم کو بادشاہ بنائے رکھا۔ یہ عظیمہ سلطنت کا پہلا نابینا حکمراں تھا۔ غلام قادر مرہٹوں کا انبود دیکھ کر بھاگا مگر پکڑا گیا اور عبرت ناک سزا پائی۔

شہزادہ اکبر شاہ کی قید سلاطین میں آمد:

شہزادہ اکبر بوجہ ہم عمری اظفری سے بہت نزدیک تھے دونوں میں گہری دوستی تھی۔ یوں بھی اظفری کی علوم دینی و دنیاوی کی شہرت دور دور تھی اور قلعہ معلی کے بسنے والے بھی کم متاثر نہ تھے۔ ایک روز قلعہ مبارک میں ولی عہد کی آمد آمد کا غل ہوا۔ اور شہزادہ معہ دیگر شہزادوں کے قلعہ مبارک میں تشریف لائے۔ اظفری کے گھر کو رونق بخشی۔ مرزا اظفری نے چاہا کہ سر جھکا کر قدم بوسی

کریں مگر شہزادے نے ھاتھ بڑھا کر پکڑ لیا، سینے سے لگایا۔ اور فرمایا خلاف معمول آج ان تمام تکلفات کا کیا سبب ہے؟ اطفری نے عرض کیا۔ اب تو آپ بادشاہ ھیں اور ھم سب آپ کے خانہ زاد غلام۔ رشتہ داری کے تمام تعلقات برطرف، حضور نوازیں یا مار ڈالیں۔ اختیار بدست مختار۔ ھماری کہاں یہ تاب کہ پہلے کی طرح برابری کا دم ماریں۔ مسکرا کر فرمایا کہ واللہ میں اب بھی تم کو وھی فرزند جگر بند جانتا ھوں اور انشاء اللہ ھمیشہ ایسا ھی سمجھوں گا۔

اطفری اکبر شاہ کو مسند پر لے گئے اور باعزت و احترام بٹھایا ایک بیت جو اکبر شاہ کی تخت نشینی کے جلسہ میں اطفری نے کہی تھی پیش خدمت کی۔ بیت یہ تھی۔

برد بعرش مہ و مہر ضرب سلطانی
خدیو شاہ جہاں گیر اکبر ثانی

شہزادہ بیت پڑھ کر بہت خوش ھوا۔ اطفری نے بیت واپس لے لی۔ اکبر شاہ نے فرمایا کیا معنی! دی ھوئی چیز واپس لیتے ھو۔ عرض کیا، یہ میرے پاس حضور کی امانت ہے جب آپ تخت نشین ھوں گے تو پیش کروں گا۔ امید ہے کہ حضرت اس بیت کو اپنے سکہ پر ضرب فرمائیں گے۔ فرمایا! تمہاری یہ درخواست قبول ہے۔ اطفری نے اس واقعہ پر دوسرے شہزادوں کو گواہ کیا اور تسلیمات بجا لائے۔ قبل ازیں بھی متعدد مرتبہ ولی عہد بمعہ دیگرشہزادوں کے خانۂ اظفری میں رونق افروز ھو چکے تھے۔ وہ اطفری کو طرح طرح پر نوازتے اور اس کی صحبت سے لطف اندوز ھوتے۔

شاہ عالم کا قلعہ مبارک میں ورود:

جب شاہ عالم تخت مغلیہ پر دوبارہ جلوہ افروز ھوئے تو از راہ

حسروانہ و مرط محبت سے عید سعید کے دن ممعہ تحت و چتر اطمری کی ڈیوڑھی کو رونق بخشی - ملی ازیں اطمری نے شاہ عالم کو نابینائی کی تاریخ ایک قطعہ میں ارسال کی تھی - اس کے علاوہ غلام قادر کے قتل اور بادشاہ کے دوبارہ تحت نسیبی کی تاریخ بھی اطمری نے علم رمل سے نکال کر پیش خدمت کی تھی - بادشاہ نے وعدہ فرمایا تھا کہ اگر دوبارہ تحت نشیں ہوئے تو اطمری کو محبس سلاطیں سے رھائی عطا فرمائیں گے اب جس وقت بادشاہ نے حادثۂ اطمری کو رونق بخشی تو موحرالذکر نے وعدوں کی یاد دھانی کرائی - بادشاہ نے پھر اقرار کیا کہ با اختیار ہو کر جلد ان کو کامیاب کریں گے اور نہایت دلاسا دیا اور هر پرانے وعدے کی از سر نو توثیق هوئی - اس کے بعد بادشاہ نے اطمری کا هاتھ پکڑا اور کچھ نقد ان کی مٹھی میں ڈال دیا اور مٹھی بند کر دی - شاھانہ عطا نے اطمری کو بہت متاثر کیا اور وہ مستقبل کے بارے میں بہت پر امید ہوگیے -

شاہ عالم بادشاہ اطمری کے کلام کو بھی بہت پسند فرماتے تھے حود بھی شاعری کے آفتاب تھے - اکثر چند اشعار تحریر فرما کر اطمری کو بھیج دیے اور جواب کی فرمائش کرتے - اطمری نے حادثۂ روھیلہ کے متعلق ایک قطعہ تاریخ تحریر کر کے دست اقدس میں پیش کیا جو مقبول ہوا -

قطعہ مندرجہ ذیل ہے :

چوں من دھت کریمی کا مژدہ
اس سال ہوا نصیب شاہ عالم
تھا فکر میں تاریخ کے بولا ھاتف
ہے اطمری تاریخ یہ عالم کا غم   ۱۲۰۲ھ

عزم فرار :

یہ سب درست مگر شاہ عالم نے اظفری سے کیا ہوا وعدہ ایفا نہیں کیا ۔ اظفری کی یہ خواہش نہیں تھی کہ وہ اسے اس طرح آزاد کر دیں کہ انہیں سن مانی کرنے کا موقعہ ہاتھ آئے ۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ وہ امراء کی سلک میں منسلک ہو جائیں اور ملک و وطن کی خدمت انجام دیں ۔ مگر بادشاہ کی وعدہ خلافی سے اظفری کو بہت رنج پہنچا اور انہوں نے قسم کھا لی کہ اگر وعدہ پورا نہ ہوا تو یہ قید خانہ سے فرار ہو جائیں گے ۔ پھر اپنے محل سے نکل کر اس مسجد میں آئے جو نور محلہ سے قریب تھی ۔ اس وقت تک بادشاہ سلامت معہ دیگر سلاطین کے وہیں تھے اظفری نے خدا کی قسم کھا کر احمد علی خاں اور کنور شنکر ناتھ کے ذریعہ بادشاہ کو پیغام بھیجا کہ انہیں اطلاع دے دیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں فریب کار کہیں اور ملامت کریں ۔ مگر ان لوگوں نے کچھ نہ کہا اور خاموش رہے ۔ اظفری پہلے ہی بد دل تھے ۔ بادشاہ کے سکوت نے دل پاش پاش کر دیا اور مصمم ارادہ کر لیا کہ جس طرح ممکن ہو نعمت آزادی حاصل کرنی چاہیے ۔

اظفری شروع ہی سے اپنی رہائی کے سلسلہ میں پر امید تھے مگر پھر بھی دور اندیشی کے خیال سے مختلف راجاؤں سے خط و کتابت پوشیدہ طور پر کر رہے تھے ۔ راجہ جے پور اور جودھپور نے امداد کا وعدہ بھی کیا تھا ۔ چنانچہ شاہ عالم کی طرف سے مایوسی کے بعد اظفری نے خود ہی رہا ہونے کا ارادہ کر لیا ۔ انہیں اپنی رہائی کا کامل یقین تھا ۔ اُن کے باپ اور چچا پیشتر ہی ان کے بارے میں پیشگوئی کر چکے تھے ۔ نیز اور بھی چند بزرگوں نے رہائی کی بشارت سنائی تھی ۔ جن پر اظفری کو پورا پورا اعتقاد تھا ۔ اس کے علاوہ واقعہ روہیلہ سے سات سال

ل اطہری اور دوسرے شاہزادوں نے حکیم عنایت اللہ کی معرفت میاں
لام چشتی سے اپنی آزادی کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ میاں
لام اس زمانے کے مانے ہوئے درویش تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ
ب سال بعد قلعہ پر آفت آنے گی۔ اس کے بعد تمہیں رہائی نصیب ہوگی۔
اطہری نے یہ تاریخ ایک کتاب کی دست پر تحریر کر دی اور جب
سالات ہوئے تو پورے ۔ ۔ سال گزر چکے تھے۔ اس پیش گوئی
ے اطہری کے دل کو مزید تقویت ہوئی۔ اور انہوں نے عملی طور پر
کوشش شروع کر دی۔

رہائی:

اطہری نے رہائی کے متعلق اپنا راز سب سے پہلے حکیم عنایت اللہ
سے بیان کیا اور امداد چاہی۔ مگر حکیم صاحب نے عذر خواہی کی اور
صاف صاف عرض کیا کہ یہ کام ان کے لائق نہیں۔ اطہری خاموشی
سے واپس آ گئے اور تھوڑا چند دیگر حضرات کی طرف رجوع کیا اور
انتظام مکمل کر لیے۔

اطہری چاہتے تھے کہ قلعہ سے فرار میں وہ پہچانے نہ جا سکیں،
حسن اتفاق سے چشم آشوب ہو گئی۔ ڈیوڑھی کے نائب ناظر کو
بلایا اور تکلیف بیان کی۔ حد درجہ بے قراری کا اظہار کیا۔ گویا شدت
آشوب سے بصارت آفتاب گراں تھی۔ اور فرمایا۔ چند دن حجرہ میں قیام
رہے گا تاکہ سکون ہو اور آپ تشریف لا کر مجھے دیکھنے کی زحمت
نہ کریں۔ یہی گفتگو بازیدار سے ہوئی۔ وہ خود بیمار تھی مگر حکم
حاکم سے لاچار تھی۔ اُٹھ بیٹھ نہ سکتی تھی مگر پھر بھی قلعۂ مبارک
کی حاضری دیتی تھی۔ اس نے کسی ملازمہ (لونڈی) کو بھی منع کیا
کہ روز آ کر اطہری کو پریشان نہ کرے۔ ضروری انتظامات مکمل کرنے

کے بعد بروز اتوار ربیع الاول ۱۲۰۳ھ کو رات کے ۳ بجے عزم فرار طے پایا۔ جن لوگوں کو روپیہ دے کر ساتھ کیا تھا ان میں سے ایک سمہ ایک نمبر دہ (؟) اور چوبدار کے دو لڑکے تھے۔ جو عموماً ڈیوڑھی پر قفل لگاتے تھے۔ بھاس کے ایک بھگ گوجر ملازم رکھے۔ ڈاک کے چند نمبر علیحدہ نوکر تھے۔ جن کا حصہ قیام سبری منڈی میں تھا۔ چند لوگ اور سولہ کہار۔ دومیانے اور اسی قدر کہار کچھ آگے پر سرو کی گڑھی میں۔ اس سے دو چند نمبر پٹودی میں۔ ایک گھوڑی اور کئی گھوڑے اور ایک کپڑوں کی بگی اور زین ریواڑی میں تیار تھے۔

سقہ نے اپنی کمر کی لنگی تبدیل لباس کے لیے خفیہ طور پر مرزا ھمایوں کی معرفت بھجوا دی تھی۔ مرزا نے لنگی دی اور بغل گیر ہونا چاھا مگر اظہری ہٹ گئے اور کہا میں رھائی سے قبل کسی عزیز کے لیے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ بہاؤں گا۔ پھر فرمایا۔ نہ وقت رفاقت کا ھے رونے کا ہے۔

اس کے بعد حجرے میں واپس آئے اور شاہ عالم بادشاہ کے نام ایک عریضہ تحریر کیا جس میں اپنے فرار کا احوال بیان کیا تاکہ بعد میں ان کے بھائی نہ پکڑے جائیں۔ رازدار بھائی سے عرض کیا کہ فرار کے ایک روز بعد یہ عرضی بادشاہ تک پہنچا دیں۔ عریضہ سے فارغ ہو کر اپنا چہرہ افیون سے سیاہ کیا اور اپنا لباس اتار کر بازاری لڑکوں کی طرح پگڑی سر پر باندھ لی جس کے پیچھے اور آگے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایک تہ بند باندھ لیا اور ایک دوتہی قبا اوڑھ لی۔ "پشت ماھی" کی رضائی سر پر ڈالی۔ بہشتیوں کی طرح ایک لنگی کمر سے لپیٹی۔ ٹوٹے ہوئے جوتے جو قبل ازیں کبھی آنکھ سے نہ دیکھے ہوں گے پاؤں میں ڈالے۔ ایک اشرفیوں کی تھیلی کمر میں باندھی۔

کچھ اشرفیاں اور روپے پگڑی میں رکھ لیے کہ شاید ضرورت پڑے۔
ہمراہیوں کی کمر میں بھی اشرفیاں باندھ دی گئیں تاکہ وقت ضرورت
ر.وس دینی پڑے۔ اور محل کی دیوار سے ہوتے ہوئے گنو برج کی جانب
لے۔ ادھر نے جو ایمان تنخواہ نہ ملنے کے سبب بلوہ کرکے شاہ عالم
نے حھرو لے لی گئے تھے اور ان کی جگہ اطہری کے رمق دیوار
سے چپکے آئے۔ اطہری کو دیکھ کر ایک جھک گیا اور عرض کی
حضور کمر پر چھلانگ لگا دیں۔ مگر اطہری نہ مانے اور زمین پر
کود پڑے۔ وہیں سب ساتھی جمع ہو گئے۔ میں نے ایک جسک مسک ان
کی کمر پر ڈال دی اور کہا صاحب عالم جمعہ کا وقت ہے۔ ملا جھجک
غلاموں کے ساتھ چلے آئیے۔ سیر روی کے سبب ہماری ڈیوڑھی کے
ایک میر دشت کے لڑکے کو شبہ ہوا۔ ہمارے رفقا سے پوچھا کہ یہ
کون لوگ ہیں۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر پوچھا اور کہا عیش محل کے
بہشتی ہیں۔ اپنے اپنے گھروں کو جا رہے ہیں۔ اتفاقاً اس روز
کھاری دروازہ وجہ مرمت بند تھا۔ کہا دہلی دروازے کی طرف رخ
کرنا پڑا اور بغیر کسی زحمت کے باہر نکل گئے۔ جامع مسجد کے
نیچے پہنچ کر ساتھ کے آدمیوں کا انتظار رہا اور اسی میں آدھا گھنٹہ
لگ گیا۔ تمرد بیجو حال وہاں کی آکر ساتھیوں پر ملی اور کامیابی
کی منت مانی اور پھر اجمیری دروازہ کی کھڑکی سے باہر کود گئے۔ ڈیڑھ
میل فاصلہ طے کرتے ہوئے جوتے کی ایڑی تلوے کے خون سے لت پت
ہو گئی تھی۔ نا سو پیدل چلنے کی نوبت محسوس نہیں آتی تھی یا اب
بھاگم بھاگ چلنا پڑا۔ پاؤں کی کھال اتر گئی۔ آبلے پڑ گئے۔ جوتے
نکال کر پھینک دیے، فرمایا۔ اب پیدل نہ چلوں گا۔ کاندھے پر اٹھا لو۔
ملازم نے اپنی پگڑی سے دھجیاں پھاڑ کر پاؤں باندھ دیے اور کہا۔

ڈاک کی گاڑی یہیں سے گذرتی ہے۔ حضور یہیں توقف فرمائیں۔ کچھ دیر وہیں انتظار کیا۔ ڈاک والے نہ آنے تھے نہ آئے۔ آہستہ خرام آگے چل پڑے۔ تکان تکلیف اور خوف سے مایوسی بڑھتی جاتی تھی کہ دور سے گاڑی کی گڑگڑاہٹ نے چوکنا کر دیا۔ گاڑی نزدیک آئی تو جان میں جان آئی۔ معاملات طے کیے۔ گاڑی کی سواری نے آرام تو دیا مگر سبک رفتاری سے خنک ہوا کا دباؤ بڑھ گیا اور سردی شدت سے محسوس ہونے لگی۔ روئی دار قبا ساتھ تھی۔ بہت پہننا چاہا مگر پہنی نہ گئی۔ آخر یونہی اوڑھ کر گریبان کا سرا باندھ لیا۔ اسی طرح پورا دن گذر گیا۔ ڈاک گاڑی پہاڑی میدانی راستوں سے گزرتی رہی رات کی تاریکی پھر چھا گئی۔ رفتہ رفتہ سردی کی شدت نے دانت سے دانت بجا دیے۔ نماز سحر کے وقت پر نرو کی گڑھی پہنچے۔ کچھ دیر وہاں قیام کیا۔ پھر منزل کی طرف کوچ کیا۔ بعد دوپہر پٹودی پہنچے دوپہر کا کھانا کھایا، کچھ دیر آرام کیا اور پھر چل پڑے۔ نماز عشاء کے وقت رواڑی پہنچے۔ یہاں شاہ عالم کی علمداری ختم تھی۔ مہاراجہ ہرناب سنگھ سوائے کی سرحد شروع تھی۔ دو رکعات نماز شکرانہ ادا کی نماز عصر اور مغرب قضا پڑھی اور رہائی کے یقین کے ساتھ سکھ کا سانس لیا۔

اظفری کی رہائی پر دہلی میں پریشانی :

یہ وہ زمانہ تھا کہ بادشاہ وقت کو امراء پر اعتماد تھا نہ رعایا پر اور نہ اپنے عزیز و اقارب پر۔ وہ تنہائی میں اپنے سایہ سے خوف کھاتا تھا۔ شاہ عالم ہر چند نابینا تھا مگر اسے مرہٹوں نے عارضی بینائی دے دی تھی۔ وہ انہی کی آنکھ سے دیکھتا اور انہی کے کان سے سنتا تھا۔ اسے یہ بھی خوف تھا کہ مرہٹے حکومت پر اس حد تک قابض ہیں کہ وہ جب چاہیں اسے تخت سے علیحدہ کرکے کسی دوسرے

شاہزادے کو تخت نشیں کر سکتے ہیں۔ پھر اپنی معزولی کا اسے غم نہ تھا مگر یہ کہ اکبر شاہ کو تخت نہ ملے یہ اسے گوارا نہ تھا۔ اسی کے لیے وہ غلام قادر کے وحشیانہ سلوک کے باوجود اسے معاف کر رہا تھا۔ اسی کو بچانے کے لیے اس نے غلام قادر اور اس کے ہمراہیوں سے جنگ مول لی تھی کہ اسے اپنی آنکھوں سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اب یہ کس طرح ممکن تھا کہ قید سلاطین سے اظفری جیسا ہوش مند اور جہاں دیدہ شخص فرار ہو جائے اور شاہ عالم مطمئن ہو۔ اس کے فرار نے نہ صرف محل میں بلکہ شہر بھر میں کہرام مچا دیا۔ وہ تو خیر تھی کہ جو خط اظفری لکھ کر دے گئے تھے وہ فرار کے دوسرے روز بادشاہ کے حضور پہنچا۔ اس وقت اظفری کہیں سے کہیں پہنچ چکے تھے۔ ورنہ شاہ عالم نے تلاش میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ دہلی کا ناظم خود تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ گلی گلی، کوچہ کوچہ چھان مارا اظفری وہاں ہوتا تو ملتا۔ ہرکارے دوڑے اور تلاش میں پرسرو کی گڑھی تک جا پہنچے مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

شاہ عالم کا خیال غلط بھی نہ تھا کہ اظفری جے پور پہنچے گا۔ فوراً گرفتاری کا فرمان جاری کیا۔ مگر بقولے ؎

سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم (تاریخ داؤدی)

راجپوتوں پر بادشاہ کے فرمان کا کیا اثر ہوتا۔ یوں بھی اظفری ان سے پہلے ہی سے ساز باز کر چکے تھے۔ خوب خوب تواضع ہوئی۔ تخت رواں پیش کیا مگر اظفری نے قبول نہ کیا۔ استقبال کے لیے راجہ کے بخشی مٹھا لال اور ان کے بھائی گنگا بشن پہنچے۔ راجہ طبعاً عیاش طبیعت تھا۔ اظفری واقعات میں تحریر کرتے ہیں کہ وہ تمام رات رقص و سرود، عیش و طرب میں مشغول رہتا۔ یہی وقت دربار کا تھا۔

آخر شب سوتا اور تمام دن سوتا رهتا ۔ اس کے محل کا نام هوا محل تھا جسے راجه کے مذاق کے مطابق سجایا گیا تھا ۔ اظفری کا یہاں دل نہ لگا ۔ هر چند راجه نے خاطر داری میں کمی نہ کی اور اسے علیحدہ محل بنام مادھو بلاس ، رهنے کے لیے دیا ۔ مگر اظفری کا دل اُٹھ چکا تھا ۔ چنانچہ راجه نے مہاراجه راج راجیشر بجے سنگھ کے پاس جودھپور جانے کے لیے عرض کیا اور کہا که وہ بھی میری طرح آپ کا خدمت گذار ہے ۔ اظفری نے روانگی کی تیاری کی اور بیش قیمت تحائف نذر راجه کیے ۔ راجه نے بھی اپنے بخشی کو شہزادے کے همرکاب کیا اور الوداع کہا ۔

اظفری شہر جے پور کی صفائی اور قطع شہر کی بہت تعریف کرتے ہیں ۔ کہتے هیں لکھنؤ کے قریب ایک اصفہانی ملا ، جس نے جے پور دیکھا تھا ۔ پوچھا تمہیں دونوں شہروں میں بلحاظ صفائی و ترتیب عمارات کون سا شہر پسند ہے ۔ اصفہان یا جے پور ۔ کہا ، جے پور ، اصفہان سے بدرجہا بہتر ہے ۔

جودھپور کا قیام :

کوچ کی صبح راجه جے پور نے اظفری کے پاس دس گھوڑے ایک زنجیر فیل ، چار اونٹ ، کچھ رتھ ، خیمه اور اسلحه نیز چند هزار روپیه نقد دیا که مسافرت میں کام آئے ۔ ایک خط والئی جودھپور کے نام علحدہ دیا ، تاکه وہ بھی حق نمک ادا کرے ۔ اس کے علاوہ ایک تخت رواں راجه کی طرف سے بخشی مٹھا لال نے پیش کیا مگر اظفری نے تخت رواں پر بیٹھنے سے انکار کر دیا اور اسے پالکی میں تبدیل کر لیا ۔ راجه کو جب معلوم هوا که شہزادہ تخت رواں پر بیٹھنے سے منکر ہے تو دوبارہ بخشی کو اظفری کے پاس روانه کیا ۔ بخشی نے علیحدگی میں لے جا کر کہا

کہ حضور ایک مثل اگر اجازت ہو تو عرض کروں۔ اطہری نے اجازت دی تو بخشی بولا حضور کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ نے عالم انبساط میں بھرے دربار کے روبرو اپنے وزیر سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ میں ایسی کیا چیز دیکھی کہ تجھے وزیر بنا دیا۔ وزیر نے جواب دیا جہاں پناہ! باری تعالیٰ ہر شخص کو اس کے ظرف کے مطابق دیتا ہے، کیونکہ اس نے مجھ میں باریک بینی اور ملکی معاملات کو سلجھانے کی صلاحیت دیکھی عہدہ وزارت سے سرفراز فرما دیا۔ بادشاہ نے یہی سوال بخشی سے کیا۔ اس نے جواب دیا، کیونکہ حق تعالیٰ نے اس ناچیز میں جرأت شجاعت اور تہور کے علامات دیکھے ملک کی حفاظت کو میرے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد کوتوال سے پوچھا، اس نے جواب دیا کیونکہ مجھ میں بیداری، ہوشیاری اور پاسداری دوسروں کی بہ نسبت زیادہ تھی مجھے اس کام پر مامور کیا۔ غرض بادشاہ ہر ایک سے سوال کرتا اور معقول جواب پاتا۔ جب بادشاہ خاموش ہوا تو درباری دست بستہ کھڑے ہو گئے اور عرض کی۔ اگر جان کی امان پائیں تو عرض کریں۔ بادشاہ نے امان بخشی۔ وزیر نے کہا، حضور! خداوند کریم نے آپ میں وہ کونسی چیز دیکھی تھی جو مالک تخت و تاج و سلطنت قرار دے دیا۔ بادشاہ اس سوال پر بہت متبسم ہوا، اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب مجھے کسی کام کے لائق نہ دیکھا تو بادشاہ بنا دیا۔ یہ مثل سنا کر بخشی اطہری کے روبرو کھڑا ہو گیا اور دست بستہ عرض کیا کہ قصور معاف! آپ کی ذات گرامی قدر، سوائے بادشاہ بننے کے اور کسی کام کو زیب نہیں دیتی اگر آپ بادشاہ بننا بھی قبول نہیں فرماتے تو یہ غلام اور کیا خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اطہری نے جواب دیا، مجھے یہ گوارا نہیں کہ اپنے حظ نفس کے لیے میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کو دشمنوں

کے پنجہ میں پھنسا دوں۔ بخشی سے رخصت کے بعد اظفری نے ملازمین کو دوبارہ بخشش و اکرام سے نوازا اور آمادۂ سفر ہوئے۔

اسی اثنا میں دھلی سے سرکاری ڈاک پہنچی جس میں اظفری کے چند خطوط نکلے۔ معلوم ہوا کہ اظفری کے فرار ہونے کے بعد ناظم دھلی نے اس کے بھائیوں پر بہت تشدد کیا۔ دروازوں پر قفل ڈال دئے، نان و نفقہ بند کر دیا اور قتل کی دھمکی دی۔ اظفری دھلی کے حالات پر بہت پریشان ہوئے۔ راجہ نے بہت دلاسہ دیا اور اپنے بخشی کو اظفری کے ہمراہ روانہ کیا۔ بخشی اور اس کا بھائی گنگا بشن دونوں نہایت خوش گفتار اور لطیفہ گو تھے۔ اظفری کو تمام راستہ تفکرات سے دور رکھا اور طرح طرح سے بہلاتے رہے۔ یہاں تک کہ عامل سانبھر کی حدود میں داخل ہوئے۔ یہاں کا عامل نہایت خاطر اور مدارت سے پیش آیا۔ اظفری کہتے ھیں کہ سانبھر میں ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ یہاں نمک فروخت نہیں ہوتا تھا۔ اگر کوئی بقال چوری چھپے نمک بیچتا تو عامل کی طرف سے پچاس روپیہ جرمانہ ہوتا۔ شہر کے باہر نمک کے ڈھیر پڑے تھے۔ جو چاھتا حسب ضرورت نمک اٹھا لے جاتا جس کی کوئی پرسش نہ تھی۔ اظفری سانبھر سے آگے بڑھے اور اجمیر ہوتے ہوئے ۳۱ ربیع الثانی کو جودھپور پہنچے۔ پتھریلا علاقہ صحرائے ریگ، ہر طرف وحشت کے آثار تھے، نہ درخت نہ سایہ مگر تمام علاقہ چور اچکوں سے پاک تھا۔ ھو کے عالم میں لق و دق صحرا ریگ میں مسافر اپنا مال و متاع لےکر سر عام سو جاتے اور کوئی اندیشہ نہ ہوتا۔ جودھپور میں زیادہ تر چھکڑا یا اونٹ کی سواری کا رواج تھا۔ مگر رات کے وقت یہ سواریاں بند ہو جاتیں کہ کہیں کسی گاڑی کے نیچے سر راہ سوتا ہوا مسافر نہ آ جائے، اگر راجہ کی رعیت کوئی خون کر دے اور

راجہ کے جاسوس دیکھ لیں تو گیارہ سو روپیہ جرمانہ ادا کریں۔ یہاں جانور کا شکار قطعی ممنوع ہے۔ گوشت خور اپنا انتظام چوری سے گھروں میں کرتے ہیں لیکن بعض امراء کو اس جرم کی سزا سر دربار ملی تھی اور راجہ نے خود دس سال سے گوشت نہ کھایا تھا اور صرف مصروف عبادت تھا۔ چوبیس سال سے اس نے محل کی آرام دہ زندگی ترک کر دی تھی اور جنگل میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ راجہ کے ترک دنیا کا سبب یہ تھا کہ اس کی منسوبہ کے بطن سے ایک لڑکا فوت ہو گیا تھا، جس کے غم میں اس کی ماں پاگل ہو گئی اور جنگل و بیابان کو نکل گئی۔ راجہ بھی تاج و تخت چھوڑ کر اس کی تلاش میں جانا چاہتا تھا مگر بصد مشکل امراء نے روکا، مگر اب وہ عیش و آرام کی زندگی سے دست کش جنگلوں میں دن گزار رہا تھا۔

اطہری خوشپور کے ایک باغ کی بہت تعریف کرتے ہیں جس میں انار بڑے اور ولایتی اناروں کی طرح خوش دانہ تھے۔ مگر اس باغ کے آم اور انار سب مندروں کی نذر ہوتے تھے ایک دانہ بھی نہ کھایا جا سکتا تھا نہ فروخت ہوتا تھا۔ اس باغ میں طرح طرح کی قد آدم تصاویر اور نقش و نگار تھے جو راجہ کے ذوق حسن و آراستگی کے شاہد تھے۔

خوشپور پہنچ کر اطہری نے تالاب سکھاوت پر قیام کیا۔ مہاراجہ کی طرف سے منشی چھبت رائے تحائف لے کر حاضر ہوئے اور بعد نقدی، نہایت انکساری کے ساتھ نذر کی۔ اطہری نے منشی کو گوشوارے پہنا دئے اور اپنی دوشالہ اس کی کمر پر ڈال دی۔ چند روز بعد مہاراج عیسی بھیم راج خوب چند سنگھوی، لال جیو مہتہ، منشی چھبت رائے برگ بھان وکیل راج راجندر سوامی، ربات سنگھ اور حقداد خان وکیل

اسمعیل بیگ ہمدانی کے ہمراہ اطہری کی خدمت میں پہنچے ۔ اور عرض کی کہ تالاب سکھانوں سے اٹھ کر بارہ دری میں تشریف لے چلیں ۔ یہ بارہ دری مہاراجہ کے خیموں کے بالکل سامنے تھی ۔ اطہری نے ہر ایک سردار کو اس کے مرتبے کے مطابق خلعت دے کر رخصت کیا ۔ چند ہفتہ اسی طرح گزرے ۔ ایک دن اطلاع ملی کہ مہاراجہ راج راجندر سوائے پرتاب سنگھ والیٔ جودھپور تشریف لائے ہیں ۔ ہمراہ ۲۰ ہزار فوج ہے ۔ اطہری نے حیثیت کے مطابق استقبال کیا ۔ مہاراجہ خوب رعب و دبدبہ کا مالک تھا ۔ قریب ۶۲ سال عمر تھی ۔ راجپوتی لباس میں دیدہ زیب نظر آ رہا تھا ۔ گفتگو کے دوران میں مشکل یہ پیش آئی کہ نہ اطہری مہاراج کی زبان سمجھتا تھا نہ مہاراج اطہری کی ۔ لہذا منشی چھبو رائے کو مترجم کی حیثیت سے پاس بٹھایا ۔ مہاراج نے اطہری کو روپیہ اور فوج دینے کا وعدہ کیا کہ وہ سلطنت مغلیہ حاصل کرنے کی کوشش کرے اور مرہٹوں کو دارالسلطنت سے نکال باہر کرے ، مگر اطہری نے قبول نہ کیا ۔

اسی اثنا میں اطہری کو افتخارالدولہ محمد بیگ ہمدانی کے بھائی احتشام الدولہ اسماعیل بیگ خاں فیروز جنگ کا خط ملا جس میں اطلاعاً لکھا گیا تھا کہ اطہری کے بھائیوں کو قلعہ مبارک سے نکال کر حویلی اسمعیل خاں میں قید کر دیا گیا ہے ۔ اس تباہ حالی کا احوال مہاراجہ جے پور کے پاس بھی پہنچا تھا ۔ چنانچہ اس نے اور بخشی مٹھا لال نے علیحدہ علیحدہ اطہری کو دلاسہ کا خط لکھا اور درخواست کی کہ وہ اپنے حق کے لیے تلوار اٹھائے ، مگر اطہری نے خاموشی میں بہتری سمجھی ۔ اس کے عمر کے تیس برس قید میں گزرے تھے ، جہاں وہ زمانے کی گرم و سرد سے نا واقف تھا ، نہ دوست کی پہچان تھی نہ دشمن کی ۔ قدم قدم

پر ٹھٹھکتا تھا - کسی پر بھروسہ کرتا کسی پر نہ کرتا - اس زمانے میں اس کے مشیروں میں سے امداد خان افغان اور منشی اشرف تھے - جن پر اظفری کو کامل بھروسہ تھا، مگر دونوں نمک حرام ثابت ہوئے اور شہزادے کو دغا دے گئے - اس سانحہ پر اظفری نے یہ قطعہ کہا :

اظفری عمر اشاعت و ملک ابود حمر کسب اخذ امور

ایمہ ناداں خود و معدودی ور بدا نوبت زدانش دور

چند روز بعد اظفری کو شیخ رحمت اللہ نامی خاں ساماں محمد عارف خاں عباسی، پسر شاہ نواز خان عباسی والیٔ سندھ (جو دراں ایام جودھپور میں مقیم تھے) کا خط ملا - جس میں چند نصیحتیں تھیں مگر اظفری دل برداشتہ ہو چکے تھے - ان کا دل جودھپور سے بھی اٹھ گیا، اور ارادہ کیا تیمور شاہ بن احمد شاہ درانی والیٔ کابل کے پاس چلا جانا چاہیے - اس علاقہ کے بہت سے رؤساء اظفری کے دوست تھے، اور ان سے خط و کتابت تھی - ان میں تیمور شاہ والیٔ ہرات، شاہنواز خاں عباسی والیٔ سندھ، بہاول خاں ناظم بہاول پور اور عماد الملک غازی الدین خان قابل ذکر ہیں - مؤخرالذکر عالمگیر ثانی کے زمانے میں دہلی کے وزیر تھے - شاہ عالم ثانی انہی کے ڈر سے دہلی چھوڑ کر بنگال بھاگے تھے مگر ۱۷۶۱ء میں جب دہلی پر احمد شاہ درانی نے قبضہ کیا تو افغان بادشاہ کے خوف سے عماد الملک دہلی چھوڑ بھاگے اور اب سندھ میں داؤد پوتوں کے پاس مقیم تھے - اظفری اور عماد الملک کی زمانہ دہلی سے دوستی تھی - اکثر ایک دوسرے کو خطوط اور اپنا کلام بھیجتے رہتے تھے -

جودھپور سے کوچ کر کے ایک منزل ہی طے کی تھی کہ امداد خان اور منشی اشرف نے مشورہ دیا کہ اجمیر چلنا چاہیے - وہ دونوں نمک حرام راجہ جے پور کو مشورہ دے چکے تھے کہ اظفری جیسے

ھی جے پور پہنچیں انہیں گرفتار کر لیا جائے۔ اطہری کو ہر وقت سازش کی اطلاع ہو گئی اور دونوں کو بہت برا بھلا کہا۔ حکیم حسین رضا خان نے اطہری کو علیحدہ لے جا کر کہا کہ حضور گستاخی معاف! بہتر یہی ہے کہ آپ جودھپور میں قیام رکھیں۔ لیکن اطہری نہ مانے۔ اسی منزل پر عمادالملک غازی الدین کا تہنیت نامہ اور غزل دعائیہ[1] وصول ہوئی۔ جس میں اطہری کو قید سے رہائی پر مبارکباد دی تھی اور اطہری کو آخر میں مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنا تخلص غمخور کی بجائے کچھ اور رکھے۔ چنانچہ عمادالملک کے مشورے سے اطہری نے اپنا نام ہی بطور تخلص اپنا لیا۔

(۱) غزل دعائیہ مندرجہ ذیل ہے:

اے شاہ احباب کے فرش تیری دعا ہو — شامل تیرے تا دور زماں فضل خدا ہو
جس طرح ہو خورشید شعاع سے جہانگیر — لے شرق سے تا غرب تیرا دست رسا ہو
قوس و قزح و مہر جہانتاب کی مانند — عالم میں علاوہ تیرا تیغ و لوا ہو
چوں سرو سر افروختہ کس میں جہانگیر — اے نخل ثمر پاس تجھے نشو و نما ہو
ہر شاہ فلک رتبہ و ہر خسرو جم قدر — محتاج تیرے در پہ صدا مثل گدا ہو
احکام تیرا ہووے روا تا آہو و ماہی — تابع تیرے فرماں کی ارض و سما ہو
شربت سے تیرے فیض کے سو کام ہو شیریں — ہر بندہ محتاج کا تو کام روا ہو
صیقل دہ دل سرمہ کش دیدہ عبرت — اے رشک مہ و مہر تیری صبح و مسا ہو
تجھکو ہو بقا تا بہ ابد ملک جہاں میں — اور تیرے بد اندیش کی قسمت میں فنا ہو
ساغر تیرے اقبال کا اب دور میں آوے — وہ کام ہو دور اسے کہ سب دور تیرا ہو
بلبل بھی اگر باغ میں ہو تیری ثنا خواں — تجھ سے زر گل پاکی و نا برگ و نوا ہو
تجھ بن جو کوئی نام (۲) تو ہے بیجا — تو جائے کرے اس پہ تو یہ باب عطا ہو
تیری تو جبلت میں سراسر ہے بھلائی — تو سرور عالم ہو تو عالم کا بھلا ہو
وہ دولت وافر کہ نہ ہو اس سے زیادہ — گنجینہ لاریب ہے سو تجھ کو عطا ہو
ہو تاج سری سر پہ کف لطف الٰہی — سایہ تیرے دامن کا نہ ارظل ہما ہوا
ہر ایک نظر تیری کلید دل بستہ — اور ناخن ابرو ھی تیرا عقدہ کشا ہو
محبوب ہو دشمن کا تیری کوکب طالع — اور تیرا ھی اقبال تیرا جلوہ نما ہو

قادر ہے سبھی چیز پہ خلاق دو عالم
کر غرض نظام اتنی وہ بس لیوے تو کیا ہو

یکم رمضان ۱۲۰۳ھ کو اظفری اودے پور کی جانب روانہ ہوئے۔ مہاراجہ ناخوش تھا لہذا کسی کو اظفری کی رفاقت میں روانہ نہ کیا۔ صعوبات راہ سے اور کچھ شدت گرمی کے تحت ایک ہاتھی دم توڑ گیا۔ ناموافقت اندیش ہمراہیوں کے سبب راستے میں اس قدر کوفت ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ اظفری نے اپنی پریشانی ایک قطعہ فارسی اور مطلع ریختہ میں کہی ہے:

قطعہ

اظفری دوستان نادان تکرار دشمنی زبان کردند

کہ جدائی ز یار کی ناداں ضرر ایدون بہ دشمناں کردند

مطلع ریختہ:

عشق تصویر میں تیری میں تماشا دیکھا

ہم نے کچھ ایسا بھلا آپ تماشا دیکھا

اظفری چاہتے تھے کہ اودے پور سے ہوتے ہوئے دکن میں نواب نظام الدولہ آصف جاہ کے پاس یا امیرالہند والا جاہ محمد علی کے پاس پہنچ جائیں مگر راستے کی خرابی کے سبب سفر دشواری بھی ممکن نہ تھی۔ دوسرے قوم بھیل کہ جودھپور کی پہاڑیوں کے عقب میں آباد تھی، آتے جاتے قافلوں کو لوٹتی تھی، اظفری کے قافلہ پر بھی حملہ آور ہوئی مگر اس کے ہمراہیوں نے بعض کو تہ تیغ کیا اور باقی افراد کو مسخر کرکے کچھ کو ہمراہ سامان اٹھانے پر رکھ لیا۔ لڑائی کے دوران میں اظفری کے بازو پر زخم آگیا تھا۔ چنانچہ کہاروں کے کاندھوں پر پالکی میں سوار بائیس رمضان سال مذکور کو وارد اودے پور ہوئے۔

اودے پور کا قیام:

اظفری نے اودے پور کو نہایت خستہ حالت میں دیکھا۔ جگہ جگہ

ئوں کی تباہ کاری کے نشانات ملتے تھے۔ یہاں کی عورتیں اپنے
دوں کو باپ جی کہتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ مہاراجہ پرتاب سنگھ
ئے کے بعد مہاراجہ جے سنگھ سوائے کی شادی اودے پور کے رانا
ڑکی سے قرار پائی تھی جب لڑکی کی شادی کے بعد سسرال پہنچی اور
عروسی میں مہاراجہ جے سنگھ تشریف لائے تو استقبال کے طور پر
پنے وطن کی رسم کے مطابق دلہن نے آواز دی، "کہا باپ جی"
بسم اللہ تشریف لائیے جب راجہ جے سنگھ نے دلہن کے الفاظ سنے
کمرے سے باہر نکل گئے کہا لاحول ولا قوہ۔ لڑکی کو اس کے
کے گھر بھیج دو۔ محل کے برہمنوں نے سمجھایا کہ لفظ باپ جی
ے پور میں صاحب کے لیے بولا جاتا ہے۔ مگر جے سنگھ نے مغلیہ
رانوں کے ماحول میں پرورش پائی تھی وہ ایسے الفاظ سے مانوس نہ
۔ چنانچہ اس نے خواجہ سراؤں کو حکم دیا کہ پہلے دلہن کی تربیت
ں اور پھر مہاراجہ ان سے ملاقات کریں۔

القصہ اظفری کو اودے پور میں زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ مہارانا
سنگھ کا قاصد (منشی چمن لال) پہنچا اور رانا کی طرف سے عذر خواہی
کہ دارالسلطنت میں بغاوت کا خطرہ ہے اس لیے خود حاضر خدمت
ہو سکے بطور نذر رانا نے نہری سار کے ساتھ چار گھوڑے، اونٹ،
جوڑے، پوشاک اور نقدی روانہ کی۔ اظفری نے منشی کو
الہ بخش دی۔ نیز کنور ظالم سنگھ نے جو اپنے نانا کے پاس
ے پور ہی میں رہتا تھا علیحدہ نذر بھیجی اور ایک خط ارسال کیا
یں ملکی احوال اور نامدار خاں کے متعلق کچھ انکشاف تھے۔ اس
میں اسمعیل بیگ خاں کی پاٹن کے مقام پر شکست کی خبر ملی۔
یہ کہ شہزادہ مرزا احسن بخت بہادر پسر شاہ عالم بادشاہ بھی

اسمعیل بیگ خاں کے پاس اطر بند تھا جو اب تمام حال اجمیر آ رہا تھا۔ اظفری کو جب تحقیق کے بعد اس کی صداقت کا علم ہوا۔ پالکی کو اوٹ پور میں چھوڑا اور بکمال عجلت اجمیر کی جانب روانہ ہوگیا۔ راستہ میں تمام سامان نقد و جنس و اسلحہ و کپڑے وغیرہ قوم بھیل نے چرا لیے۔ بصد مشکلات شاہ پور پہنچے۔ یہاں کا راجہ بھیم سنگھ، راجہ جے پور کا متبنٰی تھا خوب خاطر مدارات سے پیش آیا اور ایک لاکھ روپیہ نذر دیا۔ اظفری نے تین دن یہاں قیام کیا۔ چلتے وقت راجہ بھیم سنگھ نے ایک کٹار جو اس کی اپنی کمر میں بندھی تھی تحفہ دی، وہاں سے کوچ کرکے کشن گڑھ پہنچے۔ یہاں سے اجمیر ایک منزل ہے۔ یہاں کا راجہ بھی نہایت اخلاق و مہربانی سے پیش آیا۔ اپنے مصور کو بلا کر تصویر اتروائی تاکہ یادگار رہے۔ یہاں بھی تین دن قیام کیا۔

کشن گڑھ سے کوچ کرکے اجمیر پہنچے اور دروازے کے باہر اتر پڑے۔ معلوم ہوا کہ شاہزادہ احسن بخت قلعہ میں موجود ہیں۔ وہ رشتے میں اظفری کے چچا تھے اور قلعہ مبارک میں کمال شفقت سے پیش آتے تھے۔ اظفری کو ملاقات کی خواہش تھی کہ عامل اجمیر کا اندرون قلعہ سے خط ملا جس میں شہزادہ احسن بخت کی اظفری کے بارے میں خراب نیت کی طرف اشارہ تھا۔ اظفری نادل نخواستہ یہاں سے بھی روانہ ہوئے اور دوبارہ جے پور کا عزم کیا۔ تمام راستہ موسلا دھار بارش سے پریشان رہے مگر سفر ملتوی نہ کیا۔ والیٔ جے پور کو اظفری کی آمد کا علم ہوا تو گنگا بسن اور مٹھا لال کو پیشوائی کے لیے روانہ کیا اور راستے کی چوری کے سلسلہ میں بھی دریافت کیا۔ راجہ نے کہلوایا کہ ایسا کیا قصور اس سے ہوا تھا کہ شہزادہ

عجلت کے ساتھ جے پور سے رخصت ہو گیا تھا؟ اظفری نہایت شرمندہ ہوئے ۔ معذرت چاہی اور کہا ہماری نیت نواب آصف جاہ نظام الملک کے پاس یا نواب محمد علی خان والا جاہ کی خدمت میں جانے کی ہے ۔ اس دوران میں بادشاہ شہزادہ احسن بخت بھی اجمیر پہنچ گئے ۔ اظفری نے اسی وقت خیریت کی خبر معلوم کرنے کے لیے اپنے منشی شیخ مکھو کو روانہ کیا ۔ جب بادشاہ شہزادے نے اظفری کے منشی کو دیکھا بہت خوش ہوئے اور اظفری کی خیریت دریافت کی اور دعا کہلوائی ۔ راجہ کو خبر ملی تو حق میزبانی بجا لایا مگر بدر کو تحائف خیمہ جات وغیرہ روانہ نہ کیے بلکہ اپنے بخشی کی زبانی کہلوا بھیجا کہ شاہ عالم بادشاہ اپنے ان غلاموں سے خفا ہیں ۔ لہذا ہم حضوری کی جسارت نہیں کر سکتے ۔ آپ پھر کسی وقت تشریف لائیں ۔ بادشاہزادے نے کہلوایا کہ علی بخت اظفری بھی معز الدین عرش آرامگاہ کے نواسوں میں سے ہے اسے کیوں اتنا عزیز سمجھتے ہو کہ گھر میں بٹھاتے ہو اور میں کہ بادشاہ وقت کا بیٹا ہوں مجھ سے یہ سلوک کرتے ہو ۔ راجہ نے جواب دیا کہ آپ اور اظفری میں فرق نہ سہی مگر اظفری یہاں پہلے آئے ہیں ۔ رہیں یا جائیں مختار ہیں مگر آپ کے قیام سے ہمارے دلوں میں وسواس ہے ۔ بادشاہزادہ احسن بخت نے اس کے بعد اظفری کے پاس خواجہ سرا تمکین علی خان نائب ناظر اور فضل علی خان کو بھیجا کہ مصالحت کر لیں اور ایک مرتبہ ساتھ دسترخوان پر بیٹھ جائیں ۔ اظفری نے سادہ دلی سے قبول کر لیا ۔ بادشاہزادے نے شکایت کی کہ تم تخت سلطنت پر بیٹھے ہو اور تمہارے دماغ میں شاہی کی بو ہے ۔ اظفری نے جواب کہلوایا کہ یہ بہتان ہے ' میں ۔ تخت کو پالکی کی صورت میں تبدیل کر لیا تھا ۔ میر شرف الدین اور

میں محب اللہ جو اب بادشاہزادے کے ملازم تھے اس وقت اطمری کے پاس تھے گواہی کے طور پر پیش ہوئے۔ بادشاہزادے نے کہلوایا کہ اگر پالکی پر بھی سوار ہوئے تو غلط اور بلا اجازت تھا کیونکہ اس سواری کے لیے شاہ عالم بادشاہ کی اجازت ضروری تھی۔ لہذا اطمری سزا کے مستوجب ہیں۔ اطمری نے جواب دیا کہ جب حضور بادشاہ ہیں تو اور میں وزیر ہوں جرمانہ ادا کر دوں گا۔ چنانچہ اس تصفیہ کے بعد اطمری چاہتے تھے کہ خدمت بادشاہزادہ میں حاضر ہوں مگر ان کے اہل خواص نے خود اپنی طرف سے بادشاہزادے کو کہہ سنا کہ علی بخت کے دل میں بھر مخالفت نے جاہ پکڑ لی ہے۔ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ جب اطمری نے دیکھا کہ بادشاہزادے کی بے سبب نہیں تو ملاقات کو ٹال گئے۔

اطمری نے راجہ جے پور سے ارادہ رخصت ظاہر کیا اور اجازت چاہی۔ راجہ نے اپنے مصور خاص کو بلا کر اطمری کی تصویر اتروائی کہ یادگار رہے اور بہت سے گھوڑے، اونٹ، خیمہ، پوشاک اور نقد روپیہ دے کر ۴ ربیع الاول ۱۲۰۴ھ کو رخصت کیا۔ اطمری خفیہ طریقہ پر جے پور سے نکلے اور اپنا نام ہر ایک کو مرزا عبداللہ بتایا۔ تین دن کے بعد بادشاہزادہ احسن بخت بھی جے پور چھوڑ کر عازم کابل ہوا اور تیمور شاہ کے پاس جا پہنچا۔

جے پور سے نکل کر اطمری نے آٹھ روز کرولی میں قیام کیا اور پھر رنتھولی سے ہوتے ہوئے بھرت پور مہاراجہ رنجیت سنگھ پسر سورج مل جاٹ کے پاس ہفتہ عشرہ ٹھہرے۔ وہاں سے خفیہ طور پر دریائے جمنا عبور کیا اور رام پور میں داخل ہو گئے۔ آٹھ روز نواب فیض اللہ کے پاس قیام کیا اور پھر بانس بریلی کی طرف چل دیے۔ یہاں کے عامل

میرزا مہدی علی خاں نے حسب حیثیت خدمت کی اور چند روز بعد یہاں سے رخصت ہو کر لکھنؤ پہنچے -

لکھنؤ کا قیام :

رام پور سے لکھنؤ تک کا سفر نہایت عسرت ناک تھا - ہر طرف مرہٹہ گردی، کے اثرات ظاہر تھے - یہ وہ زمانہ تھا کہ شاہ عالم (ثانی) کو مرہٹوں نے دوبارہ تخت مغلیہ پر بٹھا دیا تھا اور سلطنت کو وسیع تر کرنے کے بہانے خود ہر طرف لوٹ مار کرتے پھرتے تھے - تمام راستے مسدود اور پر خطر تھے - بستیاں ویراں تھیں - فصلیں اجڑی ہوئی تھیں، ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا -

اسی عالم میں اظہری نے رام پور سے نواب وزیر اور ان کے نائب کو لکھنؤ میں خط لکھا - نواب وزیر کا جواب ہمت افزا تھا لہذا چل پڑے اور رام پور سے لکھنؤ تک کا سفر دو ماہ چار دن میں طے کیا ۲۹ یا ۳۰ ربیع الثانی ۱۲۰۴ھ کو وارد لکھنؤ ہوئے - اسی وقت مہاراجہ جھاؤ لال نائب نواب وزیر پیشوائی کو تشریف لائے اور خدمت نواب میں لے گئے - محل میں گئو گھاٹ کی طرف اترے - اظہری کہتے ہیں کہ لکھنؤ کے گلی کوچے، عمارات و بازار بالکل جے پور کی طرح تھے - فرق صرف اتنا تھا کہ لکھنؤ تنگ شہر تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ لکھنؤ کی آبادی بہت بڑھی ہوئی تھی اور ہر طرف کے لوگ آ کر یہاں بس گئے تھے- نواب وزیر الملک، آصف الدولہ اور ناظم الملک مرزا حسن رضا خاں نے اظہری کی کچھ ایسی دلداری کی کہ وہیں کے ہو رہے اور لکھنؤ میں سات سال دو ماہ قیام کیا - یہیں نواب وزیر سے تیر اندازی کی مشق بہم پہنچائی -

اظہری نے لکھنؤ میں پہنچ کر قریب چھ ماہ تک نواب مدار الدولہ

سے ملاقات نہ کی۔ یہ نواب وزیر کے ہاں سلطنت مغلیہ کے وکیل تھے
ان کا لقب صمصام جنگ تھا ' رشتہ میں اظفری کے حقیقی دادا کے
دودھ شریک بھائی تھے ' اپنے زمانے کے چیدہ عالموں میں سے گنے جاتے
تھے ' جس کا چرچا دہلی اور لکھنؤ میں عام طور پر ہوتا تھا۔ نواب
وزیر بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ نواب صاحب ' نواب صاحب
کہتے منہ سوکھتا تھا اگر مدار الدولہ کوئی مراسلہ یا تحفہ بھیجتے تو
احتراماً کھڑے ہو جاتے اور پھر مکتوب وغیرہ وصول کرتے۔ اپنے
عہدہ اور جاگیر کے مطابق ہر وقت ان کے دروازے پر ہاتھی جھولتے
رہتے تھے۔ کثیر الاولاد بھی تھے اور منکوحہ ازواج بھی متعدد تھیں۔
اظفری کو مدار الدولہ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ ایک دن
عرض ملاقات جا پہنچے۔ مدار الدولہ اظفری کو دیکھ کر تعظیماً
کھڑے ہو گئے۔ سلام میں سبقت کی اور بغل گیر ہوئے۔ اپنے
مصاحبوں سے فرمایا اظفری ہمارے خاندان کے چشم و چراغ ہیں ' میں
نے ان کے حسن سیرت کی جس قدر تعریف سنی تھی اسی قدر ان سے
ملنے کا اشتیاق تھا۔ فرمایا خدا کا شکر ہے کہ صورت بھی بمطابق
سیرت دیکھی۔ اس کے بعد ہاتھ پکڑ کر اظفری کو اپنی مسند پر
بٹھا دیا اور خود دور بیٹھ گئے اظفری فوراً کھڑے ہوئے اور کہا یہ
نہیں ہو سکتا کہ میں آپ کی مسند پر بیٹھوں اور آپ مثل مصاحب دور
بیٹھ رہیں۔ فرمایا یہ صحیح ہے کہ میں آپ کا بزرگ ہوں لیکن آپ
معز الدین عرش آرام گاہ کے نواسوں میں سے ہیں اور میں نسل تیموری
میں سے نہیں ہوں۔ اس کے بعد لوازم مہمانی بجا لائے اور پھر یہ سلسلہ
ملاقات اور محبت اتنا طویل ہوا کہ جب تک مدار الدولہ اظفری کو
دیکھ نہ لیتے چین نہ آتا۔ اظفری ہی سے مدار الدولہ نے ترکی کے ابتدائی

قاعدے پڑھے - اس سال مدارالدولہ کے لڑکوں کی شادی قرار پائی -

اطہری ' نواب وزیر آصف الدولہ کی خوش گفتاری حاضر جوابی اور اخلاق و ادب سے بے حد متاثر تھے - بہت سے ایسے واقعات کا ذکر کرتے ہیں جن سے نواب وزیر کے کردار پر روشنی پڑتی ہے - میرزا جوان بخت جہان دار شاہ ' شاہ عالم ثانی کا سب سے بڑا لڑکا اور ولی عہد تھا - نہایت ذہین ' ظریف ' شوخ طبع اور رنگین مزاج شہزادہ تھا - شاعر تھا ریختہ اور فارسی زبان میں اس کے دیوان[1] ملتے ہیں - موسیقی سے بھی دلچسپی تھی - اس کے علاوہ ریاضی کا ماہر تھا - اس نے اپنے حالات خود تحریر کیے ہیں جو انگلستان کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں - باپ سے محل کے اخراجات کے سلسلہ میں مخالفت ہوئی ' یہاں تک کہ انہیں قلعہ مبارک میں بند کر دیا گیا - کچھ عرصہ قید رہے ' ایک دن چوری سے نکل بھاگے اور اودھ میں نواب وزیر آصف الدولہ کے پاس پناہ لی - وارن ہسٹنگز گورنر جنرل ایسٹ انڈیا کمپنی کی سفارش پر نواب وزیر کے خزانے سے شہزادے کا پچاس ہزار روپیہ سالانہ خرچ مقرر ہوگیا - کچھ عرصہ بعد نواب وزیر شہزادہ جہاندار سے خفا ہوگئے ایک دن شہزادہ نے مذاقاً ایک دانہ الائچی نواب وزیر کی ہتھیلی میں

۱- نمونہ کلام ریختہ -

تیری جب سے الف کے پالے پڑے ہمیں اپنے جینے کے لالے پڑے
وہاں تیری غیروں سے آنکھیں لڑیں یہاں میری چھاتی پہ بھالے پڑے
پھری ڈھونڈتی پا برہنہ تجھے یہاں تک کے پاؤں میں چھالے پڑے
جہاں دار کس لالہ رو سے ملا تیرے سینے پر داغ کالے پڑے

نمونہ کلام فارسی -

فتاد مشکل دیگر زعشق جان مرا که کس نمیشنود شرح داستان مرا
مروده ایم ضرورت ز عرض بیتابی با این گناه بر آرد کسی زبان مرا
دلم ز سینه برآرید پیش او ببرید رسام ما برسانید این پیام مرا

چھپا کر رکھ دیا ۔ اور کہا " فراموش "۔ نواب وزیر نے جواب دیا
کہ " انشاء اللہ تعالیٰ الحال تا عمر فراموش "۔ شہزادے کو جواب
بہت ناگوار گزرا اور لکھنؤ چھوڑ کر بنارس چلے گئے ۔ بنارس میں
وظیفہ کمپنی کی طرف سے ادا ہوتا تھا ، لہذا نواب وزیر سے قطع تعلق
کر لیا ۔ نواب وزیر کے کردار کی خوبی یا کمزوری یہی تھی کہ جب
کسی پر مہربان ہوتے تو اسے آسمان پر چڑھا دیتے اور جب خفا ہوتے
تو آسمان سے زمین پر دے مارتے ۔

اظفری کہتے ہیں کہ نواب وزیر نہایت خلیق اور با ادب تھے ۔
ایک مرتبہ ہولی کے موقعہ پر نواب وزیر نے اظفری کو بلایا اور
مسند پر اپنے برابر بٹھا لیا ۔ اسی اثناء میں شرف علی خاں آئے اور
اظفری پر رنگ کی دھار ماری ۔ نواب وزیر نے فوراً منع کیا اور کہا
ادب اور لحاظ ہر حال اول اور افضل ہے ۔ اظفری نے جواب دیا ۔
تہوار کے موقع پر اس قسم کے آداب بالائے طاق رکھ دیے جاتے ہیں ۔
نواب وزیر نے پھر منع کیا ۔ اظفری نے جوان سے پچکاری اٹھائی اور
نواب وزیر پر رنگ کی دھار ڈال دی اور کہا ایسے محل میں نے کی ۔
اب ادب کی گنجائش نہیں ۔ لیکن نواب وزیر نہ مانے ۔ فرمایا مجھے
شرم آتی ہے ۔ پھر نواب وزیر دوسروں سے ہولی کھیلتے رہے اور
اظفری تماشا دیکھتے تھے ۔

اسی زمانے میں نواب وزیر نے اپنے متبنیٰ پسر وزیر علی خاں
کی شادی شرف علی خاں کی لڑکی سے کی اور دوسرے سال اپنی
متبنیٰ لڑکی کی شادی اپنی بہن کے لڑکے حیدر علی خاں سے کی ۔ پہلی
شادی پر تقریباً پچاس لاکھ روپیہ صرف آیا اور دوسری پر تقریباً پہلی
سے نصف ۔

لکھنؤ میں شاہ عالم ثانی کے دوسرے شاہزادے میرزا سلیمان شکوہ
بھی مقیم تھے اور اظفری کی قیام گاہ سے قریب بھی ہوے مگر کبھی ان
سے اظفری کا آمنا سامنا نہ ہوا تھا۔ ایک دو مرتبہ سرسری ملاقات
عشرہ محرم الحرام اور عید کے موقعہ پر ہوئی مگر رسمی سلام و دعا کے
بعد دونوں الگ ہوگئے۔ ایک دن گومتی کے کنارے اظفری اپنے بھائی
میرزا جلال الدین کے ہمراہ ہاتھی پر سوار نواب وزیر کے دولت خانہ
کی طرف جا رہے تھے اور میرزا سلیمان شکوہ وزیر کے محل سے لوٹ رہے
تھے کہ ملاقات ہوگئی اور خیریت کے چند کلمے ہر دو نے ادا کیے۔
سلیمان شکوہ، اظفری کے قلعۂ مبارک سے فراری پر ناخوش تھے۔ اب
شہزادے کو مہربان دیکھا تو ایک عریضہ تحریر کیا اور اپنی
غلطیوں کی معافی مانگی۔ میرزا سلیمان شکوہ نے جواباً لکھ بھیجا کہ ان
کا صافی الضمیر بالکل صاف ہے اگر بادشاہ حضور معاف کر دیں تو
میرے دل میں کوئی کدورت نہیں۔

اظفری کے قیام لکھنو کے دوران میں ان کے عزیز و اقربا جنہیں
ناظم دھلی نے قلعہ مبارک سے نکال کر حویلی اسمعیل خان میں مقید
کر دیا تھا، چھٹ کر لکھنؤ پہنچے۔ نواب وزیر نے ہر ایک کا
وظیفہ مقرر کر دیا۔ اظفری کے ایک چچیرے بھائی میرزا ھمایوں بخت
نواب والا جاہ کے پاس مدراس میں تھے جمادی الاول ۱۲۰۱ھ میں ان
کا خط آیا کہ مدراس میں ایک شخص مخبوط الحواس اپنا نام میرزا جنگلی
پسر نواب شجاع الدولہ بتاتا ہے اور روساء دکن کو دھوکہ دے رہا
ہے۔ اظفری نے اصلاحاً دو قطعات روانہ کر دیے جن میں شجاع الدولہ
کے لڑکوں کا ذکر تھا۔

لکھنؤ سے کوچ :

یوں بھی اطہری مدت سے دکن کی سیر کے خواہش مند تھے۔ بہانہ ہاتھ لگا تو فوراً تیار ہو گئے اور ۴ رجب المرجب ۱۲۱۱ھ کو بنارس پہنچے ۔ شہر با رونق تھا اور آبادی بھی بہت تھی ۔ ہر شخص اپنے حال میں مست نظر آتا تھا ۔ دو روز بنارس میں راستے کی تحقیق میں گزرے ۔ خیال یہ تھا کہ مکند پور سے ہوتے ہوئے دکن پہنچ جائیں مگر اس طرف نواب علی بہادر کے قتل نے ایک غدر برپا کر دیا تھا اور تمام راستے مسدود ہو گئے تھے ۔ چنانچہ سہرانو سے ہوتے ہوئے عظیم آباد پہنچے اور راجہ شتاب رائے کے فیض باغ میں دو ماہ سات دن گزارے ۔ پھر دریائے شیرین سے ہوتے ہوئے ۴ ذیقعد کو مقصود آباد (مرشد آباد) پہنچے یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایک شخص مجہول النسب اور جاہل جو شن کو سن کہتا تھا ۔ خود کو اطہری گورگانی ظاہر کرتا تھا ۔ اسی وقت اسے بلوایا اور بطور سزا بارہ روز تک اپنے پاس قید رکھا ۔

بنگال کے رؤساء میں سے اطہری نواب عضد الدولہ ناصر الملک سید میر علی خان بہادر دلیر جنگ ، شمس الدولہ امیر الملک سید احمد علی خاں بہادر ، ذوالفقار جنگ اور نواب حسارت جنگ کا ذکر کرتے ہیں بنگال کی آب و ہوا سے سخت نالاں ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ یہاں بھوک مر جاتی ہے اور مرطوب آب و ہوا سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں ، بالخصوص ریاح کی تکلیف عام ہے ۔ غلہ فراواں اور میوہ جات بکثرت ، خربوزہ نہایت بے مزا ، لیکن آم نہایت عمدہ ۔ اسی طرح کیلا اور سنگترہ بھی نہایت لذیذ ۔ کہتے ہیں کہ یہاں کی عورتیں بہت بیباک ، شوخ طبع ، چالاک ، اپنے شوہروں پر غالب اور شہوانی ہیں ۔

۲۵ ماہ صفر سال مذکور کو مقصود آباد سے چلے اور سات روز بعد ۲ ربیع الاول کو بردوان پہنچے اور ابو رشہید کے مقبرے میں قیام کیا تمام علاقہ فصلوں سے سرسبز تھا ۔ غلہ اور میوہ بکثرت تھے ۔ اظفری کہتے ھیں یہاں کے لوگ نہایت غلیظ اور بد حال تھے ۔ ان کے منہ سے بو آتی تھی ۔ کہتے ھیں اس علاقہ میں تا حال یزید بن معاویہ بن ابو سفیان کی اولاد آباد ھے (واللہ اعلم بالصواب) اور اس پر نہ صرف فخر کرتے بلکہ اپنی لڑکیاں کسی دوسرے خاندان میں نہیں دیتے ۔

۲۵ ماہ مذکور کو بردوان سے کوچ کیا اور پنڈوا (؟) نام کے قصبہ میں پہنچے ۔ یہاں کا کاغذ بہت مشہور تھا ' اور کشمیری کاغذ کا مقابلہ کرتا تھا ۔ دو روز یہاں قیام کیا اور پھر ھگلی کی طرف چل پڑے اور وھاں حاجی محسن[1] کے ھاں قیام کیا ۔ ایک دن اظفری نے

۱- حاجی محسن کے آبا واجداد ایران سے ھجرت کر کے بنگال میں آباد ھوگئے تھے ۔ باپ کے مرنے کے بعد حاجی محسن کو چچا نے پرورش کیا کیونکہ ان کے اپنے گھر میں کوئی اولاد نہ تھی ۔ محسن چچا کی زندگی میں سفر و سیاحت کرتے رھے اور ان کی وفات کے بعد تمام کاروبار اس طرح سنبھال لیا کہ خاندان کا نام روشن کر دیا ۔ بقول اظفری درویشانہ لباس مگر نہایت ذکی ' ذی فہم ' صاحب اخلاق اور بامروت تھے ۔ فلمتراشی کی تیز حرکتوں سے قلم بنا دیتے تھے ۔ شاہ مسکین انہی کے شاگردوں میں سے تھے ۔ ان کے ھاتھ کا تحریر کردہ قرآن مجید ایک ہزار روپیہ ھدیہ وصول کرتا ۔ ہندوق کی ڈاڑھی بال اس طرح سیدھی کرتے کہ کسی آلہ کی ضرورت نہ رھی ۔ ان کے گھر سے قسم قسم کے طعام دن میں تین مرتبہ غرباء میں تقسیم کیے جاتے ۔ کئی ایک عالی شان عمارات تعمیر کرائیں ' ان میں سے ایک امام باڑہ ھے جو اپنی طرز کا نیا ھوا ھے ۔

حاجی محسن خود بھی اولاد سے محروم تھے ۔ چنانچہ انہوں نے اپنی دولت کا نہایت عمدہ مصرف پیدا کر لیا اور کئی ایک مدرسے تعمیر کیے ۔ اس کے علاوہ حاجی محسن نے اپنے سرمایہ سے ایک کروڑ روپیہ پانچ فی صد شرح پر ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیا کہ اس کے منافع کی آمدنی مسلمانان بنگال کی تعلیم پر صرف کی جائے اور انہیں انگریزی تعلیم کے لیے وظائف دئے جائیں ۔ چنانچہ مدرسہ عالیہ جیسے مدارس اسی محسن فنڈ کی بدولت صدیوں چلے اور ان ھی مدارس سے سید امیر علی اور سر عبدالرحیم جیسے لوگ پڑھ کر نکلے ۔

سوال کیا۔ حاجی صاحب عالم جوانی میں آپ نے بھی معاشقہ کیا ہوگا۔ کوئی واقعہ سنائیے۔ فرمایا ، اتنی مہلت ہی نہ تھی کہ ایسی لغو بات میں پھنس سکتا۔ طالب علمی کا زمانہ تھا۔ کھانے پینے کا ہوش نہ تھا۔ معاشقے کا کیا ہوتا[1]۔

۸ ربیع الثانی کو ہگلی سے کوچ کیا اور کروہ کے فاصلہ پر چچرا گاؤں میں حاجی کرلائی کے ہاں قیام ہوا۔ یہیں زبانی اطلاع ملی کہ ۲۸ ربیع الاول کو وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر کا انتقال ہوگیا۔ ۱۰ ربیع الثانی کو وارد کلکتہ ہوئے۔ شہر نہایت وسیع اور پر رونق تھا جگہ جگہ ''خوبصورت'' انگریز دکھائی دیتے تھے جنہیں دیکھ کر دل خوش ہوتا تھا۔ ۷ جمادی الاول کو یہاں سے بھی کوچ کیا اور مدنہ پور پہنچے۔ یہاں کا دودھ نہایت لذیذ تھا۔ مدنہ پور صوبہ اڑیسہ میں واقع تھا۔ یہاں تفریحاً اطہری اڑیسہ کی طوائفوں کا گانا سنے اور ناچ دیکھنے گئے۔ پھر آگے بڑھے۔ نرکھونٹہ کے مقام پر چوکی والوں نے تاجر سمجھ کر روک لیا۔ ان کی سرزنش کی نوبت تلواروں تک پہنچی۔ لیکن بالآخر قصہ رفع دفع ہوگیا[2]۔ نرکھونٹہ کی گھاٹی اس قدر تنگ تھی کہ ایک آدمی کا راستہ سے گزرنا محال تھا۔ خار دار جھاڑیوں سے ہاتھ منہ پر خراشیں آ گئی تھیں۔ ۷ جمادی الثانی

۱۔ اطہری نے واقعات میں اس موقعہ پر بھی ایک قطعہ بند لکھا ہے:

اطہری ہاں عمرداں ہرگز　　　نکشائی لب ارادت خویش
قسمت خویشتن ہمیں پندار　　　طلب ہرچہ آمد لذت پیش

۲۔ اطہری کہتے ہیں کہ لڑنا انسان کی فطرت ہے جس طرح پروانہ کو جلنا اور ماہی گیر کے بچوں کو تیرنا کوئی نہیں سکھاتا اسی طرح انسان لڑنا بھی فطری طور پر جانتا ہے۔

اسی موقعہ پر قطعہ میں کہتے ہیں۔

اطہری عادت رجال اینست　　　کشتن خویش کشتہ گردیدن
آنکہ در کیع عاقبت نگرند　　　ہمچو سواں بدانش فہمیدن

کو بروز سوموار کٹک پہنچے ۔ دمودر رائے پسر دیوان کچھ تحائف اور نذر پیش لائے ۔ اس کے علاوہ کھول رام راجہ ناگ پور کے منشی معہ تیغ کمال محمد وغیرہ راجہ مذکور کی طرف سے نذر پیش کرنے کی غرض سے حاضر ہوئے ۔ سب کو مناسب عطایات سے نوازا اور رخصت کیا ۔ اس علاقہ میں یوں تو غذا اور پھل بکثرت اور نہایت لذیذ تھے مگر ہر چیز ریت ، گرد و غبار مل جانے سے خراب تھی[1] ، یوں بھی ہر طرف مرہٹہ گردی کے اثرات نمایاں تھے ۔ اس علاقہ میں کھ وڑہ کی افراط تھی ۔ اس کے پتے گھر کا ایندھن اور تنہ ، گھر کے ستون وغیرہ میں استعمال ہوتا تھا ۔ ایام قحط میں اس کا پھل بھی کھایا جاتا تھا جو سرخ اور اناس سے ملتا جلتا ہوتا تھا ۔

کٹک سے باربرداری کا انتظام کرکے ۲۸ ماہ مذکور کو پوری جگن ناتھ کی طرف روانہ ہوئے ۔ ۲۹ تاریخ کو یہاں سے بھی کوچ کیا اور نالہ چوکی گھاٹ ، جو کہ اہل ہنود کی بڑی زیارت گاہ ہے پہنچے ۔ اہل ہنود دور دور سے یہاں بغرض زیارت پہنچتے ہیں مگر یہاں کے حارس انہیں خوب پیٹتے ہیں ، قید کر دیتے ہیں ، دان و نفقہ بند کر دیتے ہیں مگر ان کے شوق زیارت میں کمی نہیں آتی ۔ اظفری کے ہمراہ بہت سے ہندو تھے جو اشتیاق زیارت میں پوری جگن ناتھ[2] پہنچے تھے ۔ ان لوگوں سے کسی نے پرسش نہیں کی اور خاطر خواہ زیارت کر گئے ۔

بتاریخ ۳ رجب المرجب مانک پٹن کے عامل نے استقبال کیا ۔

۱۔ اظفری اس کی وجہ تحریر نہیں کرتے ۔ شاید شدید ہوا کی وجہ سے اشیاء خوردنی ریتلی ہو جاتی ہوں ۔

۲۔ سمندر کے کنارے پر واقع ہے ۔ اظفری ایک روز سمندر کے کنارے گھوڑے پر سوار تھے ۔ لہروں کی تھپیڑوں کے آواز پر گھوڑے کے کان کھڑے تھے ۔ اظفری نے فی البدیہہ کہا ؎

قلزم کہ تابِ زلفِ ترا یاد میکند　　پیچد بجوشش و نالہ و فریاد میکند

تو گھاٹ پہونچ گئے - یہ تمام علاقہ نہایت وحشت زدہ اور ریگستانی تھا - یہاں سمندر سے ایک نہر نکالی گئی تھی جو چودہ کروہ کے فاصلہ تک چلی گئی تھی - اس علاقہ میں ہرن کثرت ملتے تھے، اور کہیں کہیں دیو جانب کا سمرا بھی تھا[1] جو رات کو مسافروں کو پکڑ لے اور قتل کر دیتے - الغرض یہ علاقہ نہایت خوفناک تھا - بقول اطہری :

دھاڑے ہے سمندر ایک طرف ایک طرف جلکا ہے
جو راس دو بات میں رات چلے مضبوط دل کا ہے

۹ رجب کو کھمام کی سرحد میں داخل ہوئے اور ایک دھرم شالہ میں قیام کیا - شہر نہایت غلیظ، آدمی سیاہ فام، زبان عجیب، عجب شہر تھا - ۱۲ تاریخ کو سنکاکل کی طرف کوچ کیا - ابھی چلے ہی تھے کہ اطہری کو پیچش کی شکایت ہوگئی اور مرض کی شدت یہ تھی کہ آنکھوں سے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا - اسی حالت میں ملازمین کو آواز دی کہ گھوڑے سے اتار لیں - کچھ دیر اسی طرح پڑے رہے - طبیعت سنبھلی تو پھر سوار ہوئے اور جانب منزل چلے - ایک مقام پر دلدل میں جا پھنسے - گھوڑا کمر تک دھنستا چلا گیا - مگر اطہری اسی طرح گھوڑے پر چپکے بیٹھے رہے - ملازموں کی مدد سے اس آفت سے بھی نجات ملی - گھوڑے کا وزن کم ہوا تو وہ بھی جست مار کر دلدل سے باہر آگیا - آگے چلے تو راستہ بھول گئے اور غلط راہ پر جا پڑے - اس علاقہ کے زمیندار نہایت مفسد اور بدکار تھے - انہیں تاجر سمجھ کر راہداری مانگتے اور ان کے انکار پر خونریزی پر

۱- معلوم ہوتا ہے کہ ویرانے کے سبب اطہری کو چند ایک مقام آسیب زدہ نظر آئے - یا وہ خود خوف کھا گئے جس سے انہیں یہ شک ہوا -

آمادہ ہو جائے ۔ دوسری بڑی مشکل ، زبان کی ، تھی جو قطعاً نہ سمجھ آتی ۔ رات کے وقت ملازموں کو تاکید تھی کہ ہوشیار رہیں ۔ مبادا تاریکی سے مفسد فائدہ اٹھائیں[1] ۔ ۲۳ ماہ رجب کو سیکاکل میں داخل ہوئے ۔ نہایت بارونق شہر تھا ۔ لوگ نہایت خوش لباس تھے ۔ اتفاقاً جس روز اطہری شہر میں داخل ہوئے یہ ہندوؤں کی عید کا دن تھا ۔ ایک میلہ لگا ہوا تھا ۔ ہر شخص گائے کو آراستہ کیے لیے جا رہا تھا ۔ بیشمار مشعلیں تھیں جن سے ہر طرف اجالا تھا ۔ یہاں ایک انگریز نے اطہری کو ایک گھوڑا نذر کیا ۔ ۲۶ رجب کو یہاں سے کوچ کیا اور ۲۸ رجب کو ابجانگر پہنچے ۔ یہاں کا پانی بالکل سرخ تھا جیسے صوبہ اڑیسہ کی مٹی ۔ لیکن ذائقہ نہایت شیرین تھا ، اور لوگ بلا خوف استعمال کرتے تھے ۔ یہاں کچھ لوگوں کا گانا سنا ، بہت پسند آیا ۔ یہاں کا سابقہ راجہ رام راج ، اطہری کا معتقد تھا ۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو شاید یہاں اطہری کا قیام طول پکڑتا ، مگر اب کوچ کیا لکھنؤ سے اطہری کے متعلق مختلف خطوط محتشم جنگ بہادر (ظفرالدولہ مبارزالملک ابراہیم خان دھونسہ مرحوم کے منجھلے لڑکے) کی معرفت پہنچ چکے تھے ۔ راجہ مذکور نے چاہا کہ اطہری کا ماہانہ باندھ دے مگر اسی اثناء میں اسے قتل کر دیا گیا ۔ اس کے بھائی سیتا رام راج کا گیارہ سالہ لڑکا بابو رام نرائن راج بہادر اپنی خورد سالی کی وجہ سے اپنے اہل کاروں کے ہاتھ میں بندھا ہوا تھا ۔ مگر جس قدر بھی ہو سکا ان تمام حالات کے باوجود اس نے اطہری کی مہمان نوازی کی ۔ یہاں سے روانہ ہو کر مچھلی بندر کی طرف کوچ کیا اور ۱۹ شعبان کو پداپور میں

۱۔ اس موقعہ پر ایک قطعہ میں کہتے ہیں ؎

اطہری سخت عاقل است انساں مضطرب شد چو دید شدت را
عیب نبود چنیں ز عقلت لیک در نماز و حواس و ہمت را

داخل ہوئے۔ یہاں بھی راجہ نے حتی المقدور خاطر مدارات کی۔

اظفری فرماتے ہیں کہ انجانگر سے بداپور تک لوگ تاڑ کے درخت کے چھلکوں کے مکانات بناتے ہیں اور اس کے پھل کا عرق پیتے اور بیچتے ہیں۔ ۲۲ شعبان کو یہاں سے بھی کوچ کیا اور کہن پلڈی بھارم میں داخل ہوئے جس روز اظفری یہاں پہنچے اتفاقاً اس دن ہندوؤں کا جاتری کا میلہ تھا۔ تلنگی عورتوں کا خوب رقص و سرود دیکھا۔ ۳۰ شعبان کو رات کے وقت مچھلی بندر پہنچے اور قطب الملک، مبارک الدولہ، حسن علی خاں بہادر مبارک جنگ کے باغ میں ٹھہرے، نواب مذکور نے اسی وقت ماحضر پیش کیا۔ چند روز بعد خود بھی شرف باریابی حاصل کیا۔ رمضان المبارک اسی باغ میں گزرا اور نہایت عمدہ افطاری پہنچتی رہی۔ عیدالفطر کے چند روز بعد اتفاقاً نواب قطب الملک سے ملاقات ہوگئی۔ اظفری نے ان کے بھائی اور عزیزوں کی خدمت میں نذرانے پیش کئے۔ نواب کے سر پر دستار باندھی، گوشوارے عنایت کیے۔ دوشالہ کاندھے پر تھا وہ بھی دے دیا۔ اسی روز شام کو نواب نے اظفری کی محل میں دعوت کی اور بعد طعام رقص و سرود سے دل بہلایا۔ اس کے بعد اظفری کو راہداری کا خط مرحمت فرمایا اور رخصت کیا۔ چلتے وقت ایک انگریزی پالکی اور نذر کی۔ اس دوران میں مالک سندھ ہلی راجہ ناگیشور سردیمکھ جو ان دنوں معزول تھے حاضر خدمت ہوئے اور ایک مغل جھالر دار پالکی نذر کی۔

۲۲ شوال کو یہاں سے کوچ کیا۔ نواب مذکور بطریق تشیع ساتھ ساتھ باہمرکاب تھے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ سنگلاخ زمین اور سخت تپش ہے۔ پھر بھی ہر طرف جنگلی پھول کھلے تھے جو گلزار کا نمونہ پیش کرتے تھے۔ اظفری نے یہیں امیرالمومنین علی ابن ابی

طالب کی شان میں چند اشعار کہے جو عربی میں تھے -

تغرب من الاوطان فی طلب العلا و سافر فی الاسفار خمس الفواید

فمرج غم و اکتساب معیث و علم و ادب و صحبت ماجد

فان القیل فی الاسفار دل و محنت و قطع الفیاف و ارتکاب شدائد

فموت الفتی خیره بن مقام بدارھوان بین واش و حاسد

مچھلی بندر سے ۲ یا ۳ دن کے بعد کوچ کیا اور اسی جگہ نواب عمدۃالامراء کا مکتوب ملا ' جس میں اظفری کو بڑی خواہش سے بلایا تھا - آخر شوال بروز منگل ونکول میں وارد ہوئے - پیشوائی کے لیے نواب والا جاہ مرحوم کے بھانجے تشریف لائے - اور نہایت تواضع سے پیش آئے - نائر بیٹھ پہنچ کر اظفری نے نواب عمدۃ الامراء[1] کو اپنے پہنچنے کی اطلاع دی اور نذر کے لیے اپنا اردو ' فارسی اور ترکی کلام روانہ کیا - نواب صاحب نے جواب میں خوب خوب اشتیاق ملاقات کا اظہار کیا - نیز تنخواہ بھی مقرر فرما دی جس کی اطلاع اظفری کو اسی خط کے ذریعے دی - انہوں نے بھی فوراً شکریہ کا خط تحریر کیا

۱- نواب عمدہ الامراء ' غلام حسین محمد علی والا جاہ کے لڑکے تھے - باپ کے انتقال کے بعد ۱۷۹۵ء میں تخت نشین ہوئے اور سات سال حکومت کر کے ۱۸۰۱ء میں راہی ملک عدم ہوئے - بہت خلیق اور بادوق انسان تھے - ممتاز تخلص تھا فارسی اور اردو ہر دو زبان میں شعر کہتے تھے - اظفری کی قدر اس لیے کرتے تھے کہ خانوادہ تیموری کے چشم و چراغ تھے - اظفری خود بھی نواب صاحب کا احترام کرتے تھے ان کا کلام واقعات میں درج کیا ہے -

میں بچاتے ہوئے اس دل کو لیے پھرتا ہوں
آہ کیا عقدہ مشکل کو لیے پھرتا ہوں

ہم کو منظور یہاں قصر اعل کی تعمیر
عمر جوں سایہ دیوار ڈھلی جاتی ہے

دامن کو تیرے کھینچ کے چھوڑے ہر آن دل
باعث لنک کے چلنے کا تیرے نہ جان دل

اور اسی وقت روانہ کر دیا - ١٦ دیقعد کو چھتری میں آترے جو چیناپٹن سے دو چار کوس ہے - رات کے وقت اطہری کے بھتیجے مرزا شمس الدین الملقب مرزا سکندر شکوہ ملنے آئے اور نذر پیش کی - یہاں بھی عمدۃ الامراء کے چند خطوط پہنچے جن سے اشتیاق ملاقات ظاہر تھا - ٢٢ دیقعد کو ایک دوسرا خط اطہری کے پاس نواب موصوف کی طرف سے پہنچا - چنانچہ حسب الارشاد اطہری نے چناپٹن کا رخ کیا -

مدراس کا قیام :

٢٣ ماہ مذکور کو چیناپٹن میں داخل ہوئے اور باغ ماس کلس میں قیام کیا - اسی روز اطہری کے بھتیجے مرزا سکندر شکوہ اور نواب موصوف کے صاحبزادے سراج الملک بہادر ملنے کے لیے پہنچے - نواب سلطان النساء بیگم معہ اراکین اور نہایت شان و شوکت کے ساتھ تشریف لائیں - اطہری نے حسب توفیق خاطر تواضع کی - خلعت فاخرہ پیش کئے - ان سب کے ساتھ بعد میں نواب والا جاہ کے محل کی طرف چلے - نواب موصوف نے باہر کے دروازے پر استقبال کیا - گلے سے لگا لیا - نواب صاحب نہایت نیک صورت و نیک سیرت بزرگ تھے - خوش گفتاری کا یہ عالم تھا کہ اطہری سفر کی تمام کوفت بھول گئے - محل میں پہنچے تو اطہری کے چھوٹی مرزا ہمایوں بخت سے ملاقات ہوئی - فوراً بغل گیر ہوئے - بچھڑے ہوئے سات یا آٹھ سال ہو گئے تھے ' دیکھ کر دل خوش ہوگیا - اطہری کو بھائی سے کچھ شکایات تھیں مگر نواب موصوف نے ایک لفظ بھی نہ کہنے دیا اورگذشتہ را صلوات کہی - نواب صاحب کی شان میں اطہری کہتے ہیں کہ انہیں ہر علم میں دسترس تھی - تحریر مسیحایانہ تھی - فارسی اور ریختہ کا کلام خصوصاً

٢- مدراس کا پرانا نام -

ح و بلیغ ہوتا تھا ۔ نمونہ کے طور پر ان کے کلام کے چند اشعار
ں کرتے ہیں :

محو وحدت کے تئیں پوشاک کیا درکار ہے
چوں حباب اس کو تو جو سر ہے وہی دستار ہے

یاد اس شوخ کی مجھ دل میں بھری رہتی ہے[1]
لوگ کہتے ہیں کہ اس دل میں پری رہتی ہے

بتے دیدم خدایا نادلم بے مہر سنگینی
کہ بہر عاشقان آورد حادث دین و آئینی
تہی از کاوریها نیز نبود چین پیشانی
گرہ دارد دو صد دل ایں بت چینم بہر چینی

اطفری کہتے ہیں کہ نواب موصوف کا انداز گفتگو دہلی کے
زادوں کی طرح تھا ، کرناٹیکوں کی طرح نہ تھا ۔ الغرض ضیافت کے
تحفہ تحائف کا سلسلہ پھر چلا ۔ رخصت ہو کر اطفری اپنی
ی بڑی بہن فیض النساء بیگم ، جو مرزا ہمایوں بخت کے گھر میں تھیں ،
ملنے کے لیے گئے ۔ وہ اطفری پر شروع ہی سے مہربان تھیں اور بہت
، رکھتی تھیں ۔ نواب صاحب نے سواری کا بندوبست کیا اور خود

۱۔ اطفری نے اس مطلع پر غزل کہی جسے واقعات میں درج کرتے ہیں ۔
آنکھ میں زلف کی تصویر دھری رہتی ہے
طن مردم ہے کہ سرمہ سے بھری رہتی ہے
گاہ ہم دھن اور گاہ کمر کا ہے خیال
عاشقوں کو بھی عجب درد سری رہتی ہے
نہیں معلوم کدھر کو نگہ لطف پڑے
اس طرف آپ کی کچھ کم نظری رہتی ہے
اطفری دل میں ہمارے ہے خیال مختار
لوگ کہتے ہیں کہ اس دل میں پری رہتی ہے

یا کی تک چھوڑنے آئے۔ حافظ احمد خاں بہادر اور ان کے بڑے بھائی
بہرام جنگ بہادر کو بعد فوج اور دولت کے ہمراہ میلاپور تک بھیجا
کہ ان کی بہن کے گھر تک پہنچا آئیں۔ چلتے چلتے تاکید کی کہ اطہری
واپسی پر باغ حسینی میں ٹھہریں، جو خاص ان کے لیے نواب موصوف نے
آراستہ کرایا تھا۔ چلتے چلتے نواب صاحب درمیان میں آ گئے اور
اطہری اور ان کے بہنوئی سے فرمایا۔ "بندہ اب دونوں صاحبوں کی پناہ
میں آ گیا ہے۔" اطہری نے فوراً جواب دیا۔ "نہیں بلکہ آپ ہم دونوں
کے دستگیر ہوئے" نواب صاحب کچھ دیر توقف کے بعد بولے
"گستاخی معاف! آپ کچھ دن قلعہ مبارک میں قید رہے، اب بندہ قید
در رکھے۔ اور کہیں جانے نہ دے گا۔" اطہری نے جواب دیا۔
"جاں بسپ ع کے دام فکندی تو کہ ما صید نہ گشتیم۔" نواب صاحب بولے۔
"نہیں، بلکہ آپ نے بندے کو اپنا اسیر اخلاق کیا۔" الغرض نواب
صاحب سے رخصت ہوئے اور میلاپور کا رخ کیا۔ اطہری کی قلعہ
مبارک سے فرار کے وقت یہ سب اسی قلعہ میں محبوس تھے۔ بعد میں
جب سلاطین کو فضول سمجھ کر تمام شہزادوں کو رہا کر دیا گیا جو
دہلی سے باہر نہ گئے، اسمعیل خاں کی حویلی میں مقیم رہے۔ بہن سے
مل کر اطہری اپنے بعد کے دہلی کے احوال پوچھتے رہے اور پھر رہائی
کے بعد کے اپنے حالات دہرائے۔ میلا پور سے واپسی پر حسب وعدہ
باغ حسینی میں قیام کیا۔ یہ باغ نواب صاحب موصوف کی بڑی بہن
کا تھا جن کا نام نواب سلطان النساء بیگم تھا۔ اطہری نے انہیں بہن
بنا لیا تھا۔ وہ بھی ان کی بڑی قدر کرتی تھیں اور تمام ضروریات کا
نہایت مناسب بندوبست کیا تھا۔ شام کے وقت اطہری کے لیے میزبان کی

۱۔ بقول محوی میلا پور مدراس کا ایک مشہور محلّہ ہے۔

طرف سے کھانا لگ کر آیا۔ اسی وقت مرزا ہمایوں بخت اپنے صاحب زادے کے ہمراہ تشریف لائے اور اطہری نے ان کی خاطر تواضع کی۔ مرزا ہمایوں چلتے چلتے اطہری کو اگلے دن کے لیے کھانے پر بلا گئے۔ بہن نے خوب خاطریں کیں رقص و سرود کا انتظام بھی تھا۔ آدھی رات کے بعد وہاں سے رخصت ہوئے اور نماز سحر کے وقت گھر پہنچے۔ کئی دن تک نواب سلطان النساء بیگم نے حق میزبانی ادا کیا۔ صبح و شام دستر خوان انہی کی طرف سے بچھتا تھا۔ کبھی کبھی نواب عمدۃ الامرا سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ ایک دن نواب موصوف کے حقیقی چھوٹے بھائی حسام الملک کو دیکھا۔ بھائی کی طرح نہایت خوش اخلاق اور با ذوق آدمی تھے۔ ۲۲ محرم الحرام ۱۲۱۳ھ کو اظفری کی بہن، بہنوئی اور ان کے صاحب زادے مرزا سکندر شکوہ ملنے کے لیے آئے۔

کچھ عرصہ کے بعد نواب سلطان النساء بیگم نے اطہری کے پاس پانچ ہزار روپیہ روانہ کیا کہ وہ لکھنؤ سے اپنے اہل و عیال کو طلب کر لیں۔ چنانچہ اطہری کے دیوان بھگوان داس کو سمندری جہاز کے ذریعہ روانہ کیا گیا۔ دل میں اپنی منہ بولی بہن کی بہت قدر ہوئی۔ بر جستہ کہا۔

پئے حجت خدا از قدرت خویش مع التعریف کرزن سازش آراست
سزد اورا شہی عالم زن نام خواہر مابے کم و کاست

نصیر الدولہ عبدالوہاب خان کے انتقال کے بعد باغ برحداس ان کے لڑکوں سے لے کر اظہری کے نام کر دیا اور یہ ۹ جمادی الثانی ۱۲۱۲ھ کو باغ حسینی سے اٹھ کر یہاں آ ٹھہرے۔ ۵ ربیع الثانی ۱۲۱۴ھ کو قطب الملک حسن علی خان بہادر مبارک جنگ کا خط

مچھلی بندر سے وصول ہوا کہ اظفری کے اہل و عیال وہاں پہنچ گئے ہیں۔
۱۱ جمادی الاول کو برابستہ خشکی اظفری کی والدہ معہ مرزا امین الدین
عرف مرزا مانی، برادر علاتی اور اظفری کی بیگم، جو نہایت صحیح
النسب اور سیدانی تھیں، پہنچیں۔ ان کے ساتھ ان کی بڑی لڑکی سعیدہ
النساء بیگم اور چھوٹی لڑکی وحیدہ النسا بیگم بھی تھیں۔ بڑی لڑکی قلعہ
مبارک میں پیدا ہوئی تھی اور چھوٹی لکھنؤ میں۔ مدراس پہنچتے ہی
نواب موصوف کی طرف سے سب کا ماہانہ مقرر ہو گیا جو اظفری کے
ہمراہ ملتا تھا۔

بھگوان داس کے ہمراہ بادشاہزادہ سلیمان شکوہ نے ایک خط
اظفری کے نام ارسال کیا۔ اس کے ہمراہ ایک خط نواب عمدہ الامراء
کے نام تھا۔ ایک خط نواب اشرف خاں نبیرۂ خان دوراں خاں مرحوم
کے لیے تھا، دوسرا محمد حسین خاں بن نواب اشرف خان کے لیے بردواں سے
تھا جس میں اظفری کی خیریت دریافت کی تھی۔ اظفری نے بھی بادشاہ اور
ولی عہد بہادر کو عرضیں بھیجیں جن کے جوابات وصول ہوتے رہے۔

۱۲۱۰ھ ماہ ذی الحج مرزا تاج الدین اظفری کے چچا زاد بھائی
بھی مدراس پہنچ گیے۔ اس زمانے میں نواب عمدہ الامراء مرض موت میں
مبتلا تھے، چنانچہ امیرالدولہ امیر جنگ کے ذریعہ کچھ ماہانہ ان کے
لیے مقرر ہوا۔ نواب موصوف کے انتقال کے بعد جب حکومت پر
انگریزی حکومت نے قبضہ کیا تو اسی سند پر خزانہ انگریزی سے
سب کو وظائف ماہ بہ ماہ پہنچتے رہے۔ اس اثناء میں خبر پہنچی کہ
نواب عماد الملک غازی الدین فیروز جنگ کا کالپی کے نواح میں
انتقال ہوا۔

اسی سال بقرعید پر نواب عمدہ الامراء نے اظفری کی دعوت

کی ' اور بادشاہزادوں کے خطوط سامنے رکھ کر فرمایا۔ "میں انشاء اللہ بہت جلد کچھ نذر اور سوغات شاہزادوں کی خدمت میں روانہ کروں گا"۔[1] اطہری رخصت لے کر گھر آ گیے۔ اگلے روز بعد دوپہر پھر طلب کیا اور ڈیوڑھی پر استقبال کیا۔ ہاتھ پکڑ کر اندرون خانہ لے گیے۔ وہاں تاج الامراء ان کے بیٹے اور سید شجاعت علی موجود تھے۔ اطہری کو وہ تمام سوغات دکھائیں جو نذر بادشاہ زادہ کی تھیں ' فرمایا۔ "یہ تو معلوم ہے کہ یہ حقیر سی نذر بادشاہ زادوں کے لائق نہیں لیکن حسب حیثیت ہے۔ چاہتا ہوں کہ آپ اپنی معرفت روانہ فرمائیں"۔ چنانچہ پھر بھگوان داس کو سفر خرچ دے کر جہاز پر سوار کیا۔ ۳ ماہ ربیع الاول ۱۲۱٦ھ کو نواب موصوف کا بھی انتقال ہوگیا۔[2]

انگریزی حکومت نے ان کے بیٹے کو اس لیے تسلیم نہیں کیا کہ وہ ان کی اجازت کے بغیر مسند نشین ہوگیے تھے۔ چنانچہ عمدہ الامراء کے بھتیجے نواب عظیم الدولہ کو مسند نشیں کیا ' اور ان کے وظائف وغیرہ مقرر کر کے ریاست کی اجارہ داری خود اپنے ہاتھ میں لے لی۔ والا جاہ خاندان کے ساتھ مغلیہ شاہزادوں کے وظیفے بھی مقرر ہوئے۔ خود نواب عظیم الدولہ بھی اطہری سے بہت تعظیم

(۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادوں کے وہ خطوط جو عمدہ الامراء کے نام آتے رہے تھے مالی امداد کے سلسلہ میں ہوں گے۔

(۲) اطہری نے ان کی تاریخ وفات کہی ہے جو مندرجہ ذیل ہے۔

فغاں وداع جہاں کرد عمدہ الامراء
دگر عروس دکن ہمچو او نیابد جفت
بہ خلق ہا ہمہ خلق مہدی میداشت
کہ بود کز دل او گردغم ز رحم نہ رفت
غریب پرور مہماں نواز بود و کریم
مُحمد شاہ و گدا بود آشکار و نہفت
چہار شنبہ و سویم ربیع الاول بود
کہ از سریر ریاست بہ تخت میّت خفت
جو جست اطہری تاریخ این غم عمدہ
خرد ز روی تحیّر چراغ بود بگفت
۱۲۱٦

اور اکرام سے پیش آتے اور اکثر امداد کرتے رہتے ۔ ہر تہوار اور جشن کے موقعہ پر بلاتے اور اپنی مسند پر برابر بٹھاتے ۔ اسی اثناء میں اطہری کے ہاں ایک لڑکی ۱۰ جمادی الاول کو پیدا ہوئی اور اسی سال اطلاع ملی کہ لکھنؤ میں ناظم الملک مرزا حسن رضا کا انتقال ہوا ۔ اسی سال ۲۲ شوال کو اطہری کی والدہ کا انتقال ہوا اور انھیں باغ میاں قاسم میں دفنایا ۔

مرزا مغل اور طغل ابھی تک دھلی میں تھے اور اکثر اطہری کو خطوط لکھتے رہتے تھے ۔ ان کا ایک خط آیا جس میں اطہری کے دیوان قدیم سے کچھ اشعار نقل تھے :

گر کبھی دل گر کوئیں میں، پھر کسے اکراہ ہے
لوگ دیوانے کہیں کچھ باولی یہ چاہ ہے

تجھ میں جس دم دھیان جاتا ہے
ہوش آیا اس آن چاہتا ہے
دل میرا گم ہوا صنم واللہ
تجھ پہ میرا گمان جاتا ہے
تیرے مژگاں کی کیا کروں تعریف
تیر یہ بے کمان جاتا ہے
ہائے ظالم، ہوں نیم جان کہ دیکھ
ہاتھ سے اک جوان جاتا ہے

سیہ مستاں چشمت کار کردند
بہ چشمک عالمے بیمار کردند

شود خورشید چون طالع من از روی تواندیشم
هلالم کر نظر آید رابروی تواندیسم
دهدارهمچم از دورح نترسم رآنس هجرت
ز حست گر رود دگری من ار کوئی تواندیشم

برد آن ماه دگر صبر و قرارم امسب
ار فلک میگزرد نالۂ رارم امشب

کلکتہ کا سفر

نواب عظیم الدولہ بہادر کے عہد میں اطہری کو اپنے چھوٹے بھائی مرزا جلال الدین سے ملنے کا خیال آیا - یہ ان دنوں مرشد آباد میں مقیم تھے - اطہری مدراس کے گورنر سے ۲ سال کی رخصت لے کر اور اہل و عیال کو نواب صاحب اور دیگر اعراء کی نگرانی میں چھوڑ کر کلکتہ روانہ ہوگیے - وہاں مرشد آباد کے لیے گورنر بہادر سے پھر اجازت طلب کی اور بھائی سے ملنے چلے - ابھی زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ بیمار بھائی نے بمصائے قدرت رحلت کی - یہ داغ اٹھانا پڑا اور اپنے بھتیجے ایزد بخش کو ہمراہ لے کر واپس مدراس پہنچے - دوسرے روز نواب عظیم الدولہ بہادر کے پاس اشتیاق خدمت کا مراسلہ بھیجا - آخر حافظ احمد خان کی معرفت بلوائے گیے - اور نواب صاحب کی سفارش پر مرزا ایزد بخش کا چار سو روپیہ ماہوار گذارا مقرر ہوا -

مدراس اور اہل مدراس

مدراس کے موسم ، آب و ہوا اور لوگوں کی اطوار و عادات پر

---

(۱) یہ حالات سوانحات ممتاز سے اخذ ہیں - یہ کہنا مشکل ہے کہ ۱۲۲۱ھ کے بعد کے حالات ہیں یا نہیں - لیکن واقعات میں اطہری اپنے کلکتہ کا سفر درج نہیں کرتے - دیکھیں رسالہ "اردو" اپریل ۱۹۳۰ع ص ۱۹۹ -

اطهری کی نظر پڑی گہری تھی - کہتے ہیں کہ اس علاقہ میں سردی زیادہ ہوتی ہے - بارش نہ زیادہ اور نہ کم - ہوا تند ہے اور نظام دہ، مگر موسم گرما لکھنؤ کے مقابلہ میں خوشگوار ہے - آب و ہوا مرطوب ہے، مگر صحت مند نہیں - لوگ اکثر بیمار رہتے ہیں - اطباء کا یہ حال ہے کہ ان کی تشخیص عموماً غلط ہوتی ہے، بلکہ اکثر ان کا علاج مریض کو ہلاکت انگیز بیماریوں میں مبتلا کر دیتا ہے - یہ لوگ طب یونانی سے قطعی ناواقف ہیں - اکثر نسخے یونانی، انگریزی اور تلنگی ادویات کا مرکب ہوتے ہیں -

اہل مدراس نہایت کریہہ شکل اور گندے ہیں - عموماً مرد عورت ایک دوسرے سے بے تکلف ہیں - عورتیں زیورات پہنتی ہیں لیکن ان میں نفاست نام کو نہیں ہوتی - کھانے میں گندم کی روٹی دستیاب نہیں - پھلوں میں سنگترہ، نارنج، میٹھا اور لیموں دکھائی نہیں دیتا - الغرض اچھا لباس اور اچھی خوراک دونوں مفقود ہیں - مرد ہر دوسرے تیسرے مہینے سر منڈوا لیتے ہیں - وہ لوگ جو شمالی ہندوستان سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے وہ بھی مثل خربوزہ رنگ پلٹ گیے - ہولی، دیوالی، دسہرہ اور نوروز جیسے تہوار یہاں سننے میں نہیں آتے - البتہ محرم الحرام میں یوم عاشورہ پر بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہولی کا تہوار ہو -[1] لوگ مردم بیزار ہیں - محفلوں کا ذوق مفقود ہے - لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، سخن فہمی، تفنن طبع، شعر خوانی اور

---

(۱) یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اطہری نے عاشورہ کو ہولی سے تشبیہ کیوں دی ہے - عاشورہ یوم غم ہے اور ہولی خوشی کا دن - ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ شیعہ حکومت کے سبب سینہ کوبی یا زنجیر زنی کا بھی زور ہو اور خون آلود کپڑے ایسے ہی لگتے ہوں جیسے ہولی میں رنگ ڈالنے سے ہوتے ہیں - لیکن یہ مثال بد مذاقی کی دلیل ہے اور اطہری سے اس کی توقع نہیں -

راگ فہمی سب عنقا ہیں ۔ رقص و سرود میں نہ قرینہ ہے نہ سلیقہ ۔ خصوصاً وہ راگ جو احمد شاہ بن محمد شاہ بادشاہ یا شاہ جہاں ثانی بن شاہ زادہ محی السنہ یا شاہ زادہ محمد جام بخش بن محمد کام بخش بن عالمگیر اورنگ زیب سے سنے تھے ۔ وہ اب کہیں سننے میں نہیں آتے ۔

آخری زندگی اور وفات

اظفری کے بیان کے مطابق نواب عمدہ الامراء کے انتقال کے بعد اظفری اور ان کے عزیزوں کا ماہانہ خزانۂ انگریزی سے مقرر ہوگیا تھا ۔ مگر کچھ عمر کا تقاضہ اور کچھ محتاجگی ' جوں جوں دن گزرتے تھے اظفری اس عالم ناپائندار سے بیزار ہوتے جاتے تھے ۔ کہتے ہیں "اب اس فانی زندگی کا لمحہ لمحہ شمار کرتا ہوں کہ جلد اجل آئے اور میں اسے لبیک کہوں اور عالم بقا کو روانہ ہوں ۔" پریشان حالی کے سبب لکھنے لکھانے کا کام بھی جاری نہ رہ سکا ۔ فرماتے ہیں "راقم نے ۱۲۰۱ھ تک کے حالات تحریر کیے ہیں مگر اب کچھ ذاتی پریشانی اور ذہنی پراگندگی کے سبب تصنیف و تالیف کے کام کو چھوڑ دیا ہے ۔ اگر زندگی نے پھر کبھی مہلت دی اور تائید غیبی ہوئی تو ان تمام واقعات کو تفصیل کے ساتھ دوبارہ لکھوں گا ۔"

صاحب تذکرہ گلزار اعظم کہتے ہیں کہ اظفری نے ۱۲۳۴ھ میں ۶۴ برس کی عمر میں وفات پائی ۔ کسی تذکرہ نگار نے بھی اس غریب الدیار شہزادے کے بارے میں یہ تحریر نہیں کیا کہ دفن کہاں ہیں اور ان کے بعد ان کی اولاد اور دیگر عزیزوں پر کیا گذری ؟

اولاد :

اطہری کی دو صاحبزادیاں اس بیوی سے تھیں جنہیں فرار کے بعد قلعہ مبارک میں چھوڑ آئے تھے۔ مدراس پہنچ کر جب تنہائی نے پریشان کیا تو ۱۲۱۲ھ میں ایک شادی اور کی جس کا ذکر صاحب تذکرہ گلزار اعظم کرتے ہیں۔ دوسری بیوی سے پہلا لڑکا ۱۲۱۳ھ میں ہوا جس کا نام والا نجب رکھا۔ سال بھر بعد ایک لڑکی ہوئی۔ ۱۲۱۶ھ میں دوسری لڑکی پیدا ہوئی۔ دو سال بعد ایک لڑکا اور ہوا جس کا نام اعلیٰ بخت تھا۔ یہ بچہ بقول اطہری کے خود ان سے مشابہ تھا اور بشرے سے سعادت کے آثار ظاہر تھے۔ سال بھر بعد یعنی ۱۲۱۹ھ میں اطہری نے اپنی بڑی لڑکی سعیدہ النساء کا عقد امیر الدولہ بہادر امیر جنگ سے کر دیا۔ نہایت شان و شوکت سے شادی ہوئی۔ کئی ماہ جشن جاری رہے اور محفلوں کا سلسلہ لگا رہا۔ سال بھر بعد اطہری کے نواسے پیدا ہوئے جس کا نام انہوں نے تائید الدین محمد اکبر رکھا۔ باقی لڑکیوں کی طرف سے بھی فکر دامن گیر تھی۔ لکھتے ہیں ” یہ جانے دوسرے لڑکے اور لڑکیوں کی شادی پر کیا ہو کہاں ہو اور راقم سے کیا ہو سکے “ ؟

اطہری کا کردار :

واقعات سے اجمالی طور پر اطہری کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ ہر چند ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اطہری صورت و شکل کے ایسے تھے ویسے نہ تھے یا قد کے بہت لامبے تھے پست قد نہ تھے ، وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے سراپے ان کی اپنی تصنیف میں آ ہی نہ سکتے تھے۔ اطہری کے بارے میں ایسا نسخہ کوئی دوسرا بھی ہاتھ نہیں آیا جس میں اس کے متعلق تفصیلات درج ہوں۔ چند ایک تصاویر جو اطہری کی راجہ

جے پور وغیرہ کے ذریعہ ہم تک پہنچ سکتی تھیں لا پتہ ہیں اور کسی
کتب خانہ کی فہرست میں ان کا ذکر نہیں ملتا ۔ ان کی اپنی تحریر کے
حوالوں سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ قبول صورت تھے ۔ اگر قد
بہت لامبا نہ بھی رہا ہوگا تو درمیانہ ضرور ہوگا ورنہ فرار کے وقت
عقب کی دیوار سے کودنے کی بجائے ماشکی کی پیٹھ پر آسانی سے سوار
ہو جاتے ۔ قلعہ مبارک میں ان کا ہر ایک سے برتاؤ ظاہر کرتا ہے
کہ نہایت خوش اخلاق تھے ۔ کسی کو اذیت دینا نہ چاہتے تھے ۔
ہر ایک کی تعلیم کا ذمہ لینے پر رضا مند تھے ۔ اکثر قلعہ مبارک میں
علاج بھی کرتے تھے ۔ نہ صرف اہل قلعہ بلکہ خود شاہ عالم ثانی اور
شہزادہ اکبر بھی ان سے خوش تھے ۔ غلام قادر کے فتنہ کے دوران میں
جب عالم تمنا نفسی تھا اظفری نے حتی المقدور نانی ستم سے اہل
قلعہ کو بچانے کی کوشش کی ۔ اس کی خدمات کو سب نے سراہا مگر
شاہ عالم ثانی نے ان سے اپنا وعدہ پورا نہ کیا ۔

اظفری جیسا انسان ، جو نہ صرف جوان ہمت ہی ہو بلکہ جوان
خون میں جولانی بھی رکھتا ہو قید کی پابندیوں کا خوگر کیسے ہوتا ؟
جب بادشاہ نے وعدہ ایفا نہ کیا تو فرار کی ٹھانی ۔ ہر ایک کو برضا و
رغبت اپنے ساتھ ملایا ۔ اگر اس وقت اظفری ہر دل عزیز نہ ہوتے تو
شاید ان کے فرار کی کوئی صورت نہ بنتی ۔

رہائی کے بعد بھی اظفری نے جدھر کا رخ کیا ان کی عزت و تکریم
ہوئی ، ہر طرف سے نذرین اور تحائف ملتے تھے ۔ راجہ جے پور اور جودھپور
کی طرف سے تخت سلطنت کی پیش کش ہوئی ، مگر اظفری کم ظرف نہ
تھے کہ قبول کر لیتے ۔ نہایت خندہ پیشانی سے انکار کر دیا ۔ اپنے فرار
کو حق جانتے ہوئے بھی بعد میں بادشاہ اور ولی عہد سے معافی

مانگ لی -

اطہری پورے واقعات میں صرف دو ملازمین کا ذکر برائی سے کرتے ہیں جو اطہری کو دھوکہ سے مرہٹوں کے جال میں پھنسانا چاہتے تھے - ان کے علاوہ وہ ہر شخص کی تعریف کرتے ہیں -

دہلی سے مدراس تک کا سفر ان کی دشوار گزار منزلوں سے گذرا ہے - یہ اطہری کا دل جانتا ہے - کہیں ڈر اور خوف تھا کہ شاہی ہرکارے پہچان نہ لیں، کہیں پرخطر وادیاں تھیں - کبھی تاجر سمجھ کر روکے جاتے تھے اور نوبت تلواروں تک پہنچتی تھی - کبھی دلدل میں پھنستے تھے، مگر تحریر سے کہیں یہ عیاں نہیں ہوتا کہ اطہری کے دل پر کہیں ملال آیا ہو یا طبیعت ہراساں ہوئی ہو اور پھر لطف یہ کہ دماغ کو جہاں سکون ملا فوراً ذہن شاعری کی طرف پلٹا - جگہ جگہ بہ موقع فی البدیہہ اشعار کہے - تحریر میں ان کی وسیع النظری کا احساس واقعات پڑھنے والے کو ہوتا ہے - متقی اور پرہیزگار بھی تھے - نماز و وظیفہ کے پابند بھی تھے مگر طبیعت میں رندانہ خو بھی تھی - بنگال کی حدود سے نکلے تو پہلا کام یہ کیا کہ بازار حسن میں رقص و سرود سے دل بہلایا - گانے کا شوق ایسا تھا کہ مدراس میں جس کے ہاں مدعو ہوتے تھے ہمراہ ضرور ہوتا یا اگر خود کسی کو بلاتے تب بھی نغمہ و سرود کی محفل جمتی -

یوں صاحب قلم بھی تھے اور صاحب تلوار بھی - قلم کی تیزی تلوار کی تیزی سے بڑھی ہوئی تھی - تقریباً سولہ (١٦) کتابوں کے مصنف ہیں، اور کتابیں کئی فنون لطیفہ میں اطہری کی دسترس پر شاہد ہیں -

اظفری کا کلام اور اس کی خصوصیات :

اظفری زبان دان بھی تھے اور اہل زبان بھی - اگر انہیں قلعہ معلیٰ کی زبان پر عبور تھا تو یہ تعجب خیز بات نہیں بلکہ تعجب اس وقت ہوتا اگر اظفری اس ذوق سے محروم ہوتے۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ادب کے بیش بہا خزانے روز پیدا ہو رہے تھے جس زمانے نے میر، سودا اور مصحفی جیسے اساتذہ پیش کیے۔ لیکن زبان کے اعتبار سے میر اور سودا کا وہ مقام تھا نہ ہو سکتا تھا جو اظفری یا اس گھرانے کا تھا جو خود قلعہ معلیٰ سے منسوب نہ تھے بلکہ قلعہ معلیٰ ان سے منسوب تھا ادب کی وہ کون سی صنف تھی جس میں اظفری کو دسترس نہ تھی اور پھر اظفری کے ادبی گوہر پارے صرف ریختہ ہی نہیں بلکہ فارسی میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ترکی زبان میں دخل بھی ورثہ میں ملا تھا - لہذا شعر کہنے کی ملکہ اس زبان میں بھی تھی۔ اظفری کا ترکی زبان کا دیوان دستیاب نہیں ہو سکا لیکن کہیں کہیں قطعات واقعات میں البتہ نظر آتے ہیں۔ فارسی کلام جستہ جستہ واقعات میں بھی ملتا ہے اور مدراس کے تذکرہ نویس بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ دیوان جدید میں بھی ایک غزل فارسی کی موجود ہے، جو دیوان جدید کے ساتھ ہی شائع کی جا رہی ہے۔ محمد حسین محوی صدیقی صاحب کچھ کلام فارسی اپنے مضمون میں نقل کرتے ہیں :

اظفری نیست داغ سینۂ ما این چراغ است بر دفینۂ ما
نوح وقتیم کز بکائے شدید غرق خوناب شد سفینۂ ما

گر بعزم سفر آن یار رجا برخیزد
لشکر دل شدگان ہم بہ قضا برخیزد

شگفند عقدۂ دل‌ہار نسیمش دم صبح
این گل اندام چو وا بند قبا برخیزد

برقع از ماہ رخ خویش ہمگیں چند ے
یک دانی کہ در آن فتنہ چہا برخیزد

گر بفرمائی فدائے سرو پایت عاشق
دل چہ چیز از سر من ہر دو سرا برخیزد

ہائے بندم در سر زلف پریشاں کسے
لال گشتم از لعل در افشاں کسے

پیروی گیرم این قدر شمع و شمعتانم کجا
شعلہ خویا بستہ امشب چہ مہماں کسے

سنبہ ود این دل بدید گل رخاں آندار
عرق گردیدہ است در چاہ زنخداں کسے

اظفری ، در دامنش این چاک بے معنی بود
گشت داس گیر او چاک گریباں کسے

نواب غازی الدین خان عماد الملک سے خط و کتابت اور عمدہ الامراء والا جاہ کی صحبت کے ذیل میں اظفری کا کچھ فارسی کلام مندرجہ بالا پیش کیا جا چکا ہے پر وہ قطعات و اشعار جو سفر کے دوران میں اظفری حسب حال فی البدیہہ کہتے رہے وہ بھی واقعات کے ضمن میں آئے ہیں ۔

اظفری کا دیوان ریختہ مدراس میں مرتب ہوا تھا ۔ بقول اظفری یہ محنت بلا مقصد نہ تھی اور اہل مدراس جنہیں اردو زبان سے شغف تھا اور بول چال میں غلطی کرتے تھے ان کی اصلاح کے لیے بیگانی الفاظ ، اصطلاحات، کنایات اور استعارات کا صحیح استعمال کے ساتھ یک

جا مرتب دینا نہایت اہم تھا چنانچہ یہ مقصد اظہری کے دیوان جدید سے
حاصل ہوا - ان کے خصوصیات کلام کے ذیل میں محوی فرماتے ہیں :

''اظہری کی اردو کے متعلق کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے - ان
کی زبان قلعہ مبارک کی ٹکسالی زبان اور ان کی اردو اس زمانے کی نہایت
مستند فصیح و صحیح ، نہایت شیریں اور خالص اردو ہے - اس میں بڑا
لوچ اور گھلاوٹ ہے - کس کی مجال ہے جو ان کی زبان پر انگلی اٹھائے -
اشعار میں میٹھی میٹھی باتیں ہیں - روزمرہ اور بول چال کا پورا لطف
ہے - بیگمات دھلی کا انداز گفتگو ہے - محاورے ، استعارے ، اشارے ،
کنائے ، چوچلے سب قلعہ مبارک کے ٹکسالی ہیں - یہی وجہ ہے کہ
مدراس میں اردو زبان کے مسلم الثبوت استاد مانے جاتے تھے - وہ بیگموں
کی گودوں میں کھیلے اور چونچال ہوئے تھے ، ان سے زیادہ ماہر زبان
اور مستند کون ہو سکتا تھا - مدراس پر کیا موقوف ہے ، وہ جہاں
رہتے استاد مانے جاتے اور ان کی عزت اور توقیر کی جاتی - صاحب تذکرہ
گلزار اعظم نواب غلام غوث خان کا یہ بیان بالکل صحیح ہے کہ '' او در
زبان ریختہ علم استادی افراشت '' اس میں کوئی مبالغہ نہیں - البتہ
اتنا کہنا ضروری ہے کہ ان کی اردو وہی ہے جو آج سے ایک سو تیس
برس پہلے کی تھی - اس وقت کے لحاظ سے بہت سے الفاظ اب متروک اور
غیر فصیح ہو چکے ہیں - بہت سے ترکیبیں اور محاورے ترک
ہو چکے ہیں - بہت سے الفاظ کے املاء اور تذکیر و تانیث میں تغیر آ گیا
ہے - بہت سے الفاظ کے حرکات و سکنات اور اعراب میں اس زمانے کے
شاعر تصرف کر دیا کرتے تھے ، مگر اب جائز نہیں ہے - بہت سی
چیزیں اس فتویٰ کی بنا پر کہ لیجوز للشاعر مالا یجوز لیغیرہ؟ کبھی جائز
تھیں مگر اب خلاف تہذیب یا معیوب ہیں ، مذاق سلیم کے لحاظ سے

رنگ اور اخلاق سے گری ہوئی ہیں۔ سب سے بڑی بات جو ہمارے لیے مانوس کن اور باعث بے کیفی ہے، وہ یہ ہے کہ کلام اطہری زیادہ تر روح شاعری سے خالی ہے۔ جسم ہے آراستہ پیراستہ مگر بے جان۔ تخیل کی بلندی۔ مذاق کی نفاست، اثر عم، اور سوز و گداز جو دلی کا خاص رنگ شاعری ہے تقریباً مفقود ہے۔ اطہری کے اس کلام میں اپنے استاد میر تقی کا ذرا بھی رنگ نہیں بلکہ اس دور کی شاعری کی خصوصیات سے یکسر خالی ہے۔ اس چیز کو خود انھوں نے بھی محسوس کیا ہے اور اس کا سبب غالباً وہی ہے جو انھوں نے لکھا ہے۔

اطہری کے کلام کے سلسلہ میں محوی کے دو اعتراض ہیں۔ اولاً ابتذال دوئم، فقدان مضمون۔ پہلے اعتراض کے متعلق اپنے مضمون میں انھوں نے کوئی مثال نہیں دی مگر اطہری کا کلام جس سے ابتذال کی بو آتی ہے کچھ اس قسم کے ہیں۔

دے جاؤ بھوگ ہم کو جتنے کہ چاہو
ہے مٹھی سہالی سے بہتر یہ گالی

متوالی آپ اپنی کچھ بھی سمھالتی ہیں
کس کس کے گھر کو دیکھیں جا جا کہ گھالتی ہیں
کاکل نہیں لٹکتی کچھ ان کی چھاتیوں پر
چوگاں سے یہ کھلنڈری گیندیں اچھالتی ہیں

شرط تھی ماں کی جو مانگوگے تم
نام بوسہ سنتے ہی کچھ تل گئے
دیکھا خربوزہ تیری فالیز کا
پک چکا ہے بلکہ اب ہلنے لگا

تم پہ تھا جب وہ عالم تجرید
ان دنوں میں بھی ان بیاھا تھا
دیکھیے پر ذری سے یہ پھوں پہاں
تھوک دو غصہ جانی جانے دو

اس میں شک نہیں کہ آج کل کے ادب میں "جانی" "بوسہ" چھاتیوں وغیرہ وغیرہ جیسے الفاظ مستعمل نہیں۔ بلکہ ہر وہ خیال جن سے عریانیت ٹپکتی ہو بازاری اور غیر معیاری متصور ہوتے ہیں۔ مگر ہر زمانے کا معیار ادب کبھی یکساں نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ مختلف زمانوں کے اقدار کا باھم مقابلہ کیا جا سکے۔ جس زمانے کا ذکر یہاں ہے وہ اخلاقی اعتبار سے کچھ زیادہ بلند نہ تھا۔ صاحبان اقتدار ھمیشہ دوسروں کے لیے نمونہ ہوتے ہیں۔ مثل مشہور ہے جیسا راجہ ویسی پرجہ۔ شاہان مغلیہ کے دل یوں بھی صنف نازک کی طرف کچھ زیادہ مائل تھے مگر اورنگ زیب کے انتقال کے بعد یہ کمزوری بڑھتی چلی گئی۔ جہاندار شاہ کے زمانے میں یہ عالم تھا کہ بادشاہ، لال کنور کی آغوش میں ہو اور کوئی مصاحب اتفاقیہ چلا آئے تو بادشاہ مسکرا کر سر جھکا لیتا تھا۔ شرم اور غیرت اٹھ چکی تھی۔ شاھی محل میں اب خاندانی بیگمات کم اور طوائفیں زیادہ تھیں۔ اس لیے شادی بیاہ کے موقعہ پر نہایت بے ہودہ مذاق اور فحش گالیاں ایک دوسرے کو دی جاتیں، بلکہ سمدھی سمدھن ایک دوسرے کا نام لے کر اس قسم کی گالیاں دیتے۔ نادرات شاھی، شاہ عالم آفتاب کا دیوان جو رامپور (بھارت) سے تصحیح کے ساتھ امتیاز علی خاں عرشی نے شائع کیا ہے اس قسم کی لغویات سے بھرپور ہے اور ابتذال کی

صحیح تصویر ہے۔ لیکن واضح رہے کہ اس زمانے میں سٹھنی جزو ادب تھا۔ نمونہ کے طور پر کچھ اشعار درج ذیل ہیں :

سمدھن ملک زمانی نے کہوئے رات پکار
سمدھی بس کر اب مجھے پھولن گیند نہ مار

سمدھن صاحب محل جب بولی کیوں تم ہم کو چھیڑا
وھیں ھاتھ سمدھی نے پکڑا منہ میں ڈالا بیڑا[1]

سمدھن تیری ناک بہت ہے سندر سگڑ انوٹھی
انگری جاب نہیں ہے وا میں ایسی لال انگوٹھی[2]

اساتذہ کی سٹھنیوں کے یہ اشعار قابل تحریر بھی ہیں لیکن بہت سے ایسے ہیں جنہیں ہر زبان پڑھ بھی نہیں سکتی - ظاہر ہے ایسے ماحول میں اگر استاد یہ نہ دیں کہ :

رکھتا ہے ھوس بوسے کی تیرے منہ عالم[3]
پاوے گا بہت تیرے اس انعام سے لذت

تو یہ شعر اس زمانے کے اعتبار سے حیطہ ابتذال میں نہ آئے گا۔

نحوی کا دوسرا اعتراض بالکل غلط ہے۔ قطع نظر اس کے کہ دیوان جدید ایک خاص نظریے کے تحت کہا گیا تھا۔ اظفری نے روز مرہ بول چال کے محاوروں کو نہایت عمدہ پیرائے میں نت نئے مضامین کے ساتھ باندھا ہے - یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اظفری پر ان کے استاد (میر تقی میر) کا اثر نہ تھا۔ ان کے کلام کی ایک بڑی خوبی یہی

---

(۱) نادرات شاہی رامپور ص ۵۲ -
(۲) ایضاً ص ۵۲ -
(۳) نادرات شاہی رامپور ص ۲-

ہے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ زمانے کی بو آتی ہے، بلکہ لوگوں کے طور اطوار و خصائل کا پتہ چلتا ہے۔ ایک غزل میں فرماتے ہیں :

عیار دل میں بھرا کر، کرے سلام علیک
ہے کس کے کام کی یہ ظاہری سلام علیک

تلون ایسا ان ابنائے روزگار میں ہے
کہ صبح ملئے تو ہے چڑ چڑی سلام علیک

(ف)

جو شام دیکھو تو پھر ان تلوں میں تیل نہیں
چرائی آنکھیں ہیں بھوں پھری سلام علیک

ظفری کا رنگ تغزل بھی مضامین سے خالی نہیں :

تو جلا دے تو جیوں تو ہی جو مارے تو مروں
تجھ سوا مجھ کو تو دارین میں کچھ آس نہیں

باغ کیا جس میں کہ برگ و ثمر و تاک نہیں
جس زمیں پر نہیں یہ چھاؤں وہاں خاک نہیں

اور پھر یہ بھی نہیں کہ پوری پوری غزل میں ایک آدھ شعر جاندار ہو اور باقی سب مہمل۔ اس غزل کے دوسرے اشعار ملاحظہ ہوں۔ ان میں تخیل کی بلندی نہ سہی پستی بھی نہیں۔

اپنی جان تک ہے جہاں، جب تئیں دم ہے ہم غم ہے
بعد مرنے کے الٹ جاؤ جہاں باک نہیں

بیغمی ترک علائق ہے سنا ظفریا
جس کو دنیا سے علاقہ نہیں غمناک نہیں

ہ حورو تجھے کہہ سکتے ہیں نہ مہر نہ ماہ
عجب گھڑی یہ قدرت نے کچھ تیری تصویر
جہاں پڑا تیرا سایہ وہاں اگا گلزار
قدم دھرا ہے تو حسر جا جائے مشک و عبیر

دیکھو اس میری یاد کو اور وہ مجھ پہ کرتا نہیں نظر بھولے
ہم فراموش کے فراموشے اور تم یاد عمر بھر بھولے
مشکل قوافی اور ردیف میں اشعار کی بندش اس زمانے کی خصوصیات
میں سے ہے۔ اظفری اس میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں :
سوں میں تیری سیا رات جو کھٹکا ہے کا
سر کو تکیہ سے اٹھا پٹی پہ دے دے پٹکا
دل لیا ، تاب و تواں لے چکا ، جان بھی لے لے
پاک کر ڈال بکھیڑا یہ سبھی جھنجٹ کا
شمع و پروانہ کے مضامین فارسی ادب سے میراث ملے تھے اور پھر
فارسی ادب اظفری کے لیے غیر بھی نہ تھا ۔ خوب مضمون باندھا ہے :
پونچھنے کو دوڑا پروانہ جب اشک
شمع کے رخسار پر ڈھلنے لگا
زبان کے اشعار کی بھی اظفری کے ہاں کمی نہیں ۔ فرماتے ہیں :
لکھ چکی جو اسے نہیں تبدیل ہے تو تقدیر کی قلم اچھی
اسی جانہ خراب کے ہاتھوں نہ کٹی زیست کوئی دم اچھی
دید کا اپنے فیض جاری رکھ ہے یہ خو صاحب کرم اچھی

مولوی صاحب کے اعتراضات میں سے تخیل کی بلندی اور مضامین

کے فقدان کے سلسلہ میں مزید کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں۔ البتہ دو چیزیں بحث طلب ہیں یعنی ''روح شعری'' اور ''اثر غم'' اور سوز و گداز دھلی۔ اول الذکر کے بارے میں یہ کہہ دینا غلط نہ ہوگا کہ شعر کی روح وہ انفرادی ذوق ہے جو اس کے اثر کی صورت میں کہنے والے یا سننے والے پر ہوتا ہے، اور پھر یہ ضروری نہیں کہ ایک شعر کا اثر ہر شخص پر یکساں ہو۔ اشعار غم سے ہر آنکھ نہیں روتی۔ نہ اشعار انبساط ہر طبیعت کو خوش کرتے ہیں۔ سودا کے لیے تقریباً ناممکن تھا کہ کہتے :

سرھانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

نہ وہ کسی حکب سیٹھ کے ملازم تھے نہ عسرت سے بسر ہوتی تھی۔ آج آصف جاہ کا قصیدہ کہا، وظیفہ پہنچ گیا۔ کل عمدہ الامراء کی مدح لکھ بھیجی، کچھ ان کے توسل سے مل گیا۔ پھر یہ کیوں نہ کہتے کہ :

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت
خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

خدام کا تصور اس وقت تک ممکن نہیں جب تک خدام گھر میں موجود نہ ہوں۔ یہی دلیل، اثر غم اور سوز و گداز کے لیے پیش کی جا سکتی ہے۔ اظفری لاکھ قید سے بھاگے پھرتے تھے پھر بھی شہزادے تھے، جہاں جاتے تھے سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا۔ لوگ تعظیم و اکرام سے پیش آتے تھے، نذریں پیش ہوتی تھیں، ملازمیں اور مصاحب همراہ تھے۔ سفر کی تکلیف سے قطع نظر اظفری کی زندگی قید سے رهائی کے بعد نہایت آسودہ تھی۔ چنانچہ اگر ان کا کلام میر جیسے سوز و گداز سے خالی ہے تو باعث تعجب نہیں۔

یہ کہنا بھی سراسر غلط ہوگا کہ اظفری کا دیوان جدید خامیوں سے بالکل مبرا ہے - یہ ریختہ کے مسلم الثبوت استاد ضرور تھے مگر ان کے شاگردوں[1] میں سے کسی کا ریختہ کلام دستیاب نہیں - اس سے یہ نتیجہ نکالنا ' ممکن ہے کسی حد تک صحیح ہو کہ اظفری اصلاح صرف فارسی کلام میں دیتے تھے پھر ان کا اپنا فارسی کلام بلا شبہ ریختہ سے بلند پایہ اور پختہ تھا -

تصانیف

واقعات اظفری سے قطع نظر اظفری کی تصانیف کا سلسلہ کافی وسیع ہے - تالیف کی ابتداء قلعہ مبارک ہی میں ہوئی تھی - رہائی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رکھا - ان تمام تالیفات کا ذکر واقعات میں موجود ہے :

(۱) فوائد المبتدی - زبان اردو کا آمد نامہ - فی زمانہ تدریس فارسی کے لیے جس قدر فارسی آمد نامہ لازم ہے محتاج بیان نہیں - اردو اٹھارھویں صدی میں چنداں ایسے ہی دور سے گذر رہی تھی کہ اردو کے آمد نامہ کی ضرورت محسوس ہوئی تھی - یہ کتاب تا حال دستیاب نہیں -

(۲) دیوان اردو - فارسی ' ترکی ' زیادہ تر غزلیات پر مبنی تھا - دستیاب نہیں -

---

(۱) اظفری کے شاگردوں کا احوال اختصار کے ساتھ کچھ واقعات میں درج ہے - اس کے علاوہ تذکرہ گلزار اعظم صبح وطن ' تذکرہ اشارات بینش ' تذکرہ شعرا بیان ' مثنوی رشک قمر و مہ جبین ' میں بھی کچھ حالات ملتے ہیں - مجوی صاحب اپنے مضمون میں جن کا تذکرہ کرتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں - غلام محی الدین شائق علی خان شائق محمد معروف خان عالم خان بہادر فاروق ' سید معین الدین منور رقم خان منور اور نادر -

(۲) عروض زادہ ۔ اصول شاعری ، قلعہ مبارک ھی میں اطفری نے اصلاح وغیرہ کا کام شروع کیا تھا ۔ غالباً اسی سبب سے عروض زادہ کی ضرورت محسوس ہوئی ۔

(۳) فوائد الاطفال ۔ یہ کتاب بھی قلعہ مبارک کی تصنیف ہے ۔ مقید سلاطین کے لیے جہاندار شاہ کے زمانے سے شاھی طبیب مقرر تھے ۔ مگر وقت بے وقت اطباء کا دستیاب ہونا دشوار تھا ۔ اطفری فن طبابت میں اچھی خاصی دسترس رکھتے تھے ۔ شاید اسی ضرورت کے ماتحت " فوائد الاطفال " کی تالیف ہوئی ہو ۔

(۵) لغات ترکی یا فرہنگ اطفری ۔ یہ ترکی مصادر، محاورے اور ترکیبوں کا مجموعہ ہے جسمیں نہایت سہل طریقہ پر سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے ۔ یہ لکھنؤ کے سال بھر کے قیام کا نتیجہ تھا ۔ اس کا ایک نسخہ انگلستان میں انڈیا آفس لائبریری میں ملتا ہے ، جس کا تذکرہ اس کتب خانہ کی فہرست میں ڈاکٹر ایتھے[1] نے کیا ہے ۔ ڈاکٹر ایتھے اسے معروف اللغات کے عنوان سے تحریر کرتے ھیں ۔ حالانکہ اس کے دیباچہ میں صحیح نام فرہنگ اطفری ملتا ہے ۔ ڈاکٹر ایتھے اس نسخہ کی تعریف میں تحریر کرتے ھیں کہ " یہ فارسی زبان میں ترکی الفاظ کی بسط لغات ہے ۔"

(۶) ترجمہ محبوب القلوب ۔ اصل کتاب ترکی زبان میں میر نظام الدین علی شیر نوائی کی تالیف ہے ۔ اس کا ذکر صاحب تذکرہ گلزار اعظم نے بھی کیا ہے ۔

---

(۱) جلد اول مطبوعہ ۱۹۰۲ء کالم ۱۳۱۵ اور نمبر شمار ۲۳۳۹ ۔

(۷) نصاب ترکی۔ صنعت مقلوبات میں تقریباً دو سو بیس شعر ہیں۔

(۸) تنکری تاری۔ امیر خسرو کی تالیف خالق باری کے جواب میں زبان ترکی و ہندی ہے۔ تقریباً چھ سو پچاس شعر ہیں۔

(۹) ترجمۂ رسالۂ نبریہ۔ اصول طب میں۔ اصل کتاب حکیم بقراط کی تصنیف ہے۔ اپنے ایک ملازم کی استدعا پر منظوم ترجمہ کیا۔

(۱۰) سوانحات اظفری۔ واقعات اظفری کے بعد لکھنا شروع کیا تھا۔ اس میں نصائح اور سیہات ہیں، لیکن یہ کتاب دستیاب نہیں۔

(۱۱) نصاب ترکی چغتائی۔ یہ کتاب عظیم آباد کی تالیف ہے۔ اپنے ایک ملازم رائے بنکا رام کی فرمائش پر تحریر کی تھی۔ رائے موصوف خود بھی بادوق انسان تھے۔ راجہ دیا رام کشمیری کے علاقائی بھائی تھے۔ اظفری کے موروثی خانہ زاد تھے۔ خود بھی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ہندو تھے مگر مذہب اثنا عشریہ سے بہت متاثر تھے۔ دُرِ مکنون، صاحب الامر کی تولد پر انہی کی تصنیف ہے۔[1]

(۱۲) دیوان غزلیات اُردو قدیم۔ یہ دیوان قلعہ مبارک میں تالیف ہوگیا تھا مگر دستیاب نہیں۔

(۱۳) میزان ترکی۔ اس کا ذکر واقعات میں نہیں لیکن اس نسخہ کا ذکر مجوی اپنے مضمون میں کرتے ہیں۔ قلمی کتب خانہ مدراس میں موجود ہے۔ قواعد زبان ترکی سے متعلق ہے۔

---

(۱) ان کی دیگر تصانیف مثنوی والہ، سلطان، مثنوی پرس رام اور دلا رام۔ دیوان غزلیات اور رسالہ درعروض و قوافی مشہور ہیں۔

(۱۴) عروض زادہ نظم و نثر۔ یہ دو رسالہ جو نظم اور نثر کی علحدہ تحریریں ہیں کتب خانہ سرکار رشید الدولہ میں تھے۔ ان کا ماخذ فن عروض کا وہ رسالہ ہے۔ جو بابر بادشاہ نے بہ زبان ترکی تالیف کیا تھا۔ یہ نسخہ شاہ جہاں کے زمانے سے قلعہ مبارک کے کتب خانہ میں محفوظ تھا، جس سے اظفری نے استفادہ کیا۔

(۱۵) دیوان اردو جدید۔ پیش ناظرین ہے۔

اورینٹل کالج میگزین

مئی ۱۹۶۳ء

۴۰ عدد ۳

عدد مسلسل ۱۵۳

اڈیٹر :

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

باہتمام مسٹر احسان الحق ، ہیڈ کلرک ، یونیورسٹی اورینٹل کالج ، لاہور
پرنٹر و پبلشر اورینٹل کالج ، میگزین ، جدید اردو ٹائپ پریس ، لاہور
میں طبع ہوکر اورینٹل کالج ، لاہور سے شائع ہوا

سالانہ چندہ : چار روپے

ترتیب مضامین

تعارف

منظورالحق صدیقی
ایم - اے ' بی - ٹی
استاد ریاضیات
کیڈٹ کالج ' حسن ابدال (مغربی پاکستان)

ملک ذوالفقار علی
ایم - اے (عربی و اسلامیات)
استاد عربی ' اوریئنٹل کالج ' لاہور

پیرزادہ محمد حسین عارف سہمی ۱۸۵۶–۱۹۲۸ء

پیر زادہ محمد حسین عارف

ولادت : ۱۰ محرم ۱۲۷۳ھ ۱۰ ستمبر ۱۸۵۶ء سہم ضلع رھتک

وفات : ۷ شوال ۱۳۴۶ھ ۳۰ مارچ ۱۹۲۸ء دھلی

پنجاب یونیورسٹی کے پہلے ایم۔اے فارسی، خان بہادر پیرزادہ محمد حسین ایم۔اے، سی۔آئی۔ای مشرقی تہذیب و شرافت کے ایک قابل تقلید نمونہ ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ پایہ کے مترجم، قانون دان، ریاضی داں، ماھر فلسفہ اور پاکیزہ گو شاعر تھے۔ دھلی دربار رپورٹ ۱۹۱۱ع کے صفحہ ۳۸۱ پر آپ کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے۔ ترجمہ :

"پیرزادہ محمد حسین خان صاحب (۱۸۹۷ع)، خان بہادر (۱۹۱۰ع) پنجاب یونیورسٹی کے ایم۔اے (۱۸۹۳ع)، ڈویژنل اینڈ سیشن جج حصار۔ آپ سہم ضلع رھتک کے قدیم اور معزز قریشی خاندان سے ھیں۔ دھلی کے پٹھان سلاطین اور مغل شاھنشاھوں کے ماتحت اس خاندان کے متعدد افراد اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ھیں۔ اضلاع حصار، رھتک، گوڑگاؤں کے مسلم راجپوتوں کو حلقہ بگوش اسلام کرنے میں اور ان کی اصلاح کرنے میں اس خاندان نے نمایاں کام کیا ہے۔ پیرزادہ محمد حسین خان کئی کتابوں کے مصنف ھیں۔ آپ نے علم ھیئت، علم سکون سیالات، اصول قانون، دستور، معاشیات اور فلسفہ کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرکے اردو ادب کو مالا مال کر دیا ہے"۔

خاندان | زبدۃ الاولیا حضرت قاضی قوام الدین حجیری ثم رھتکی ھندوستان میں آپ کے جد اعلیٰ تھے۔ ۱۲۸۷ع میں سلطان معز الدین کیقباد نے حضرت قوام الدین کے فرزند اصغر مولانا کبیر الدین اور

ہوتے قاضی عماد الدین بن مولانا افتخار الدین کے پرگنہ سہم کی خدمات خطابت، نوابت، قضا، افتا اور احتساب سپرد کرکے ان چچا بھتیجوں کو سہم بھیجا۔ سہم اب ضلع رہتک کا ایک قصبہ ہے رہتک سے بیس میل اور دہلی سے چونسٹھ میل کے فاصلہ پر۔ مسلم عہد حکومت کے اختتام ۱۸۰۹ع تک یہ خدمات اسی خاندان میں رہیں۔ یہ خاندان سہم اور رہتک میں اپنے بنائے ہوئے قلعوں میں رہتا تھا۔ اس خاندان سے ایک بزرگ مفتی فضل اللہ عرف ماھرو شاہنشاہ ہمایوں کے دبیر تھے۔ ایک اور بزرگ مفتی عزیز اللہ شہید ۱۶۶۲ع شاہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دبیر تھے۔ مفتی شہید کا مدرسۂ عزیزیہ دہلی میں اپنے وقت میں تعلیم قران کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے والد بزرگوار شیخ عبدالرحیم کا مدرسہ رحیمیہ بعد میں قائم ہوا۔ اسی خانوادے کے تین بزرگ شاہ رزق اللہ الملقب بحافظ عالم خان متوفی ۱۷۷۰ء، ان کے فرزند شاہ نجم اللہؒ الملقب بحافظ عالم خان ثانی (۱۷۰۱ - ۱۷۷۴ع) اور شاہ نجم اللہؒ کے بھتیجے شاہ سلام اللہؒ قلعہ معلیٰ دہلی میں شہزادوں اور شہزادیوں کی تعلیم پر مامور رہے۔ ۱۸۰۳ع میں انگریز سپہ سالار لارڈ لیک نے دہلی فتح کیا۔ اس نے پیش قدمی کرکے سکھوں سے ٹکر لینا خلاف مصلحت سمجھا اور دہلی سے پٹیالہ تک کا علاقہ اپنے وفاداروں میں تقسیم کر دیا۔ اس نے جھجر سے ھانسی تک کے علاقہ کی پیشکش اس خاندان کے ایک سربرآوردہ بزرگ مستقیم الدولہ محمد احسان خان بہادر نصرت جنگ صدیقی الہمی کو کی جس کے قبول کرنے سے انہوں نے معذرت کی تو یہ علاقہ نانی ریاست دوجانہ نواب عبدالصمد خان کو دے دیا۔

ان مناصب کے علاوہ اس خاندان کی شہرت ان علما و مشائخ کی

وجہ سے تھی جنہوں نے ہریانہ، سودر، میوات وغیرہ میں اشاعت و تبلیغ اسلام کی - ان محترم ہستیوں میں سے صاحب مثنوی جنون المجانین حضرت شاہ نصراللہ المتخلص بنصرتی المولد ۱۶۶۶ع، شاہ اوحد مولوی بدر الدین (۱۷۰۳ - ۱۷۹۱ع)، شاہ غلام جیلانی رہتکی (۱۷۵ - ۱۸۲۰ع) شاہ کمال اللہ المتوفی ۱۷۴۲ع، شاہ عبدالحکیم صدیقی المہمی (۱۷۰۹ - ۱۷۷۳ع)، ہادی ہریانہ حضرت شاہ محمد رمضان شہید (۱۷۶۹ - ۱۸۲۵ع) رحم اللہ ہا کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پیرزادہ محمد حسین صدیقی المہمی کے والد ابو الحسن مولوی سیف الرحمان اور دادا شاہ محمد اسمعیل مہمی کو ۱۸۵۷ع کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں پھانسی دی گئی - پڑدادا شاہ عبد العظیم متوفی ۱۸۲۸ع مجذوب تھے - شاہ عبد العظیم کے والد شاہ عبد الحکیم مہمی اپنے عہد کے مشائخ کبار میں سے تھے اور ہریانی زبان کے ابتدائی مصنفین میں تھے - ان کے والد شاہ لطف اللہ الملقب بعطا محمد خان سہ ہزاری اور نائب گورنر لاہور تھے - عہد محمد شاہ میں مستعفی ہو کر خرقہ درویشی اختیار کیا - شاہ لطف اللہؒ کے برادر بزرگ حضرت شاہ کمال اللہؒ پنج ہزاری اور کسب خانہ شاہی لاہور کے ناظم تھے - ایک درویش میر ایوب بدخشی کے زیر اثر اپنے منصب کو چھوڑ کر فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کی -

بچپن | پیر زادہ محمد حسین چار بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے - ایک سال کے تھے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی فوج نے محلہ کا محاصرہ کر لیا - خواتین کو حکم ہوا کہ ایک مکان میں جمع ہو جائیں سامان اور مکان قرق کیے جائیں گے - آپ کی والدہ ماجدہ گھبراہٹ میں آپ کو چارپائی پر لیٹا چھوڑ گئیں - راستہ میں خالی گود کا احساس ہوا

تو آدمی بھیج کر آپ کو سکوایا ۔ فوج نے گھر کا توا، چمٹا تک نیلام کر دیا ۔ خاندان کے ایک درجن سر برآوردہ افراد کو پھانسی دی گئی جن میں آپ کے والد اور جلیل القدر دادا بھی تھے ۔ آپ کا بچپن ایسی عسرت میں گزرا جہاں فاقوں کا شمار مشکل ہے ۔

تعلیم | پیرزادہ محمد حسین اپنے خاندان سے پہلے فرد ہیں جنہوں نے ڈھنگ میں پڑھ کر باقاعدہ اعلیٰ تعلیم پائی ۔ حصول تعلیم کے مدارج یہ ہیں :

(۱) پنجاب انٹرنس امتحان ۱۸۷۱ع میں شروع ہوا آپ کے وطن میں صرف ایک پرائمری سکول تھا ۔ ۱۸۷۵ع میں آپ نے دھلی سے انٹرنس کا امتحان دیا ۔ اس وقت دھلی پنجاب کا حصہ تھا ۔ پورے پنجاب میں ۱۰۹ امیدواروں میں سے ۸۷ پاس ہوئے جن میں دو مسلمان تھے ۔ کامیاب امیدواروں میں آپ پانچویں نمبر پر تھے اور مسلمانوں میں سرفہرست ۔

(۲) امتحان انٹرنس پاس کرکے آپ لاھور چلے آئے اور لگاتار یہاں بارہ سال مقیم رھے ۔ گورنمنٹ کالج لاھور میں داخل ھوکر آپ نے ۱۸۷۹ع میں کلکتہ یونیورسٹی سے ریاضی اور فلاسفی میں بی ۔ اے کیا ۔ ابھی تک پنجاب یونیورسٹی کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا مگر لاھور میں جو کالج تھا اسے پنجاب یونیورسٹی کالج کہتے تھے ۔ اس کالج سے آپ نے ۱۸۷۹ع ھی میں ھائی پروفیشنسی ان آرٹس کا امتحان پاس کیا ۔ اس امتحان میں صرف چار امیدوار کامیاب ھوئے جن میں سر فہرست آپ تھے ۔ باقی تین بہال چند، ارجن سنگھ اور چرت سنگھ تھے ۔ اس امتحان میں اول آنے والے کو اسی روپے ماھانہ وظیفہ ملا

کرتا تھا جسے فلر ایگزی بیشن کہا کرتے تھے ۔ اس سال یہ
وظیفہ آپ کو ملا ۔ آپ سے پہلے یہ وظیفہ صرف نرائن داس،
لال چند اور ایشور داس کو ملا تھا ۔

(۳) ۱۸۸۰ع کے آنرز ان آرٹس کے امتحان میں آپ واحد کامیاب
امیدوار تھے ۔ اس کامیابی پر آپ کو دو اعزاز ملے ۔ ایک
مالیر کوٹلہ میکلوڈ میڈل اور دوسرا میکلوڈ پنجاب عربک فیلو
شپ ۔ میکلوڈ میڈل اسے ملتا تھا جو آرٹس، لاء، میڈیسن اور
انجینیرنگ میں سے کسی ایک کا آنرز ہو اور سب مضامین
میں کامیاب ہونے والوں میں بہترین ہو ۔ ۱۸۸۰ع میں یہ
تمغہ آپ کو ملا ۔ آپ سے پہلے صرف بابو پنچ نند مکرجی،
نرائن داس، لال چند، ایشور داس اور مولراج کو ملا تھا ۔
میکلوڈ عربک فیلو شپ کی صورت میں جو اعزاز ملا اس کی
صورت یہ تھی کہ فیلو شپ ہولڈر اورینٹل کالج لاہور میں
اسسٹنٹ پروفیسر ہوتا تھا ۔ اسے سو روپے ماہانہ ملتے ۔ اس
کے سپرد شعبۂ ترجمہ ہوتا ۔ نیز یونیورسٹی کالج کی طرف سے
کتابیں اس کی نگرانی میں طبع ہوتیں ۔ آپ سے پہلے یہ اعزاز
دو دو سال کے لیے لالہ مدن گوپال، بدری پرشاد اور لالہ ایشور
داس کو ملا ۔ آپ کے سپرد یہ خدمت ۱۸۸۰ سے ۱۸۸۵ع
تک رہی ۔

(۴) ۱۸۸۲ع میں پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی ۔ پہلے سال تین
حضرات نے ایم ۔ اے کا امتحان پاس کیا ۔ جیالوجی میں
امراؤ سنگھ (سکنہ ریواڑی) نے فرسٹ کلاس میں، سنسکرت
میں پنڈت ہرکشن نے تھرڈ کلاس میں اور انگریزی میں

خواجہ محمد شفیع نے تھرڈ کلاس میں۔ اگلے سال ۱۸۸۳ء میں ایم۔ اے کے امتحانوں میں بھی تین امیدوار کامیاب ہوئے۔ تاریخ میں چنی لال پلیڈر گورداسپور اور ارجن سنگھ ٹیچر گجرات اور فارسی میں پیرزادہ محمد حسین۔ تینوں فرسٹ کلاس میں پاس ہوئے۔

۱۸۶۷ء میں انجمن پنجاب نے ایک سکول کھولا تھا جسے ۱۸۷۰ء میں پنجاب یونیورسٹی کالج نے اپنی تحویل میں لیکر اورینٹل کالج لاہور بنا دیا۔ ۱۸۸۱ء میں پیرزادہ صاحب اس کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو مقرر ہوئے۔ دو سال بعد آپ یہاں ریاضی اور فلسفہ پڑھانے لگے۔ ان دنوں ڈاکٹر لائٹنر ایم۔ اے، پی ایچ ڈی۔ ایل ایل ڈی اس کالج کے پرنسپل تھے مگر اس زمانہ میں پرنسپل کو سپرانٹنڈنٹ کہتے تھے۔

آپ پنجاب کی جماعت قانونی کے بھی رکن تھے اور اخبار انجمن پنجاب کے ایڈیٹر بھی۔ یہ امر اکثر حضرات کی دلچسپی کا باعث ہوگا کہ پیرزادہ صاحب پنجاب یونیورسٹی سے اولیں ایم۔ اے فارسی تھے مگر شعبۂ اردو کے صدر تھے اور ریاضی و فلاسفی پڑھایا کرتے تھے۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد صرف دو سال کے عرصہ میں آپ نے اسٹرونومی، ہائڈروسٹے ٹکس، جورس پروڈنس، کنسٹی ٹیوشنل لا، پولٹیکل اکانومی اور فلاسفی پر متعدد کتابیں ترجمہ کیں جن کی تفصیل کچھ دیر بعد پیش کی جائے گی۔

ملازمت | آپ کی قابلیت سے متاثر ہوکر ڈاکٹر لائٹنر نے آپ کا نام ای۔ اے۔ سی کے مقابلہ کے امتحان کے لیے بھیج دیا جس میں آپ نے امتیاز حاصل کیا اور ۱۸۸۵ء سے بطور ای۔ اے۔ سی کام شروع کردیا

۱۸۹۰ء میں آپ ڈسٹرکٹ جج (موجودہ سنئیر سب جج) ہو گئے ۔ اس حیثیت میں سولہ سال تک حصار ، لاہور ، ملتان ، گورداسپور ، دہلی ، گجرات ، فیروزپور اور سون میں رہے ۔ اس دوران کچھ عرصہ عارضی سیشن جج بھی رہے ۔ ۱۹۰۶ء میں پنجاب گورنمنٹ سے آپ کی خدمات دربار کشمیر نے مستعار لے لیں ۔ وہاں آپنے نئے ہائی کورٹ کا اجرا کیا جس کے آپ واحد جج تھے ۔ ۴ سال بعد ڈویژنل اور سشنز جج بنا کر حصار بھیج دئے گئے ۔ ۱۹۱۰ء میں آپ کو خان بہادر کا خطاب ملا ۔ دہلی دربار ۱۹۱۱ء میں آپ کو کرسی ملی اور ۱۹۱۲ء کے آخیر میں ریٹائر ہو کر آپ اپنے وطن سہم چلے گئے ۔ مگر قدرت کو آپ سے ابھی بہت سے کام لینے تھے ۔ اس لیے کچھ عرصہ بعد آپ دہلی چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی ۔

شخصیت | قد میانہ ، دوہرا جسم ، بڑا سر ، کشادہ پیشانی ، رنگ گندمی ، ناک ستوان ، آنکھوں میں مرعوب کن چمک تھی ۔ ہمیشہ داڑھی رکھی ۔ صرف سرکاری تقریب کے موقع پر سوٹ پہن لیا کرتے تھے ۔ ایک مرتبہ ایسی ہی ایک تقریب میں جانے کے لیے سوٹ پہن کر گھر سے نکلے آپکے ایک بزرگ ڈپٹی جمیل اللہ صدیقی السہمی (۱۸۳۸ - ۱۹۲۴ء) جو دہلی میں رہتے تھے اور ڈپٹی نذیر احمد کے شریک کار و بار بھے دوسری طرف سے آ رہے تھے ۔ پاس پہنچے تو ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگے " محمد حسین کتا تو ساتھ ہے نہیں " صرف اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے ۔ اس دن کے بعد غالباً آپنے اپنے اس واحد سوٹ کو صندوق سے بھی نہ نکالا ۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر تو قطعی کھدر پوش ہو گئے تھے ۔

پیرزادہ محمد حسین مشرق شرافت و تہذیب کا ایک نمونہ تھے ۔

حدید علم اور انکسار کا شاذ حالتوں میں میل ہوتا ہے مگر یہ میل آپ کی ذات میں بہت نمایاں تھا۔ دھلی سے وطن جاتے تو قصبہ سے باہر ہی سواری سے اتر جاتے۔ راستہ میں جھاؤ نامی سے کی دوکان تھی جو ابتدائی جماعتوں میں آپ کے ساتھ پڑھا تھا۔ یہ بنیا آپ کو دیکھتے ہی فرط مسرت سے لٹ جاتا اور اپنی معمولی سی دکان پر بٹھا کر کھیل بتاشوں یا گڑ سے تواضع کرتا۔ اسی بے تکلفی سے اس معمار سے ملا کرتے تھے جس کی ماں پیر زادہ صاحب کے دور عسرت میں کبھی کبھی آپ کو کھانا کھلا دیا کرتی تھی۔ وطن جا کر رشتہ داروں سے ملنے کے لیے گھر گھر جاتے اور بڑی بوڑھیوں کی دعائیں لیتے۔ صلہ رحمی کا بڑا خیال رکھتے۔ ریٹائر ہو کر چار سو سولہ روپے پنسن ملتی تھی، سو روپے بھارت انشورنس کمپنی کی ڈائریکٹری کے مل جاتے، تین سو پچاس روپے طبیہ کالج دھلی میں کام کرنے کے مل جاتے، جہاں آپ اسسٹنٹ سکریٹری تھے۔ علاوہ ازیں عدالتیں آپ کے پاس ثالثی کے لیے مقدمات بھیجدیتیں جس کی فیس سے معقول آمدنی تھی۔ اس آمدنی میں سے آپ اپنے بعض غریب اقربا کو گھر بیٹھے وظیفہ پہنچاتے رہے۔ خاندان کے بیسیوں بچوں کو مختلف اوقات میں اپنے پاس رکھ کر آپ نے تعلیم دلائی۔

تعمیری کام / ملازمت کے دوران آپ کا جو شعار رہا ہے اس کی ایک جھلک آپ کے ان اشعار میں ملتی ہے:

یاد رکھ کافی ہے یہ قول سی
جائیگے دوزخ میں راشی مرتشی

عدل کی کرسی پہ تو بیٹھے اگر
رکھ نہ اپنی کوئی شے پیش نظر

دوستی اور رشتہ رکھ بالائے طاق
کیسا ہے؟ کیوں ؟ یہ نہ گزرے تجھ پہ شاق

دیکھو گے ایسے بھی تم حاکم کئی
جو نہیں ہیں در حقیقت مرتشی

لینا رشوت کا سمجھتے ہیں حرام
پر سفارش سے بنا دیتے ہیں کام

با طبیعت کے ہیں ضدی اس قدر
بیٹھ جائے بات اک دل میں اگر

یا نکل جائے زبان سے ناگہاں
اس سے ہٹنے کو وہ سمجھیں کسر شاں

عرش پر اپنا سمجھتے ہیں مقام
رکھتے ہیں انصاف کو بالائے بام

ان میں جو ہوتے ہیں بعض ایسے عزیز
کرتے ہیں ہندو مسلماں میں تمیز

وہ غرض یہ کہتے ہیں ہم ہیں دیندار
یا دھرم پر جان ہے اپنی نثار

ہے بڑا بزدل فلاں اور نا سپاس
اپنے مذہب کا نہیں ہے اس کو پاس

اور پڑھا ہے بعض نے الٹا سبق
ڈرتے ہیں اپنوں کو دیتے ان کا حق

بے لگاؤ تا کہ لوگ ان کو کہیں
منہ کے آگے وصف تا ان کا کریں

ہیں یہ ظالم مرتشی گرچہ بہیں
مرتشی ہے ان سے سو بہتر کہیں

آپ ایک جامع الصفات بزرگ تھے - بچپن میں حوادث کے جو پیہم تھپیڑے کھائے تھے انہوں نے آپ میں بے پناہ استقلال اور قوت عمل پیدا کر دی تھی - علمی ذوق اور اصلاحی طبیعت ورثہ میں پائی تھی - جہاں رہے وہاں اپنی ایک نہ ایک یادگار چھوڑی - ملتان کی عید گاہ پر پیر زادہ صاحب کے نام کا پتھر لگا ہوا ہے - یہ عید گاہ سکھ انگریز لڑائی میں مسمار ہو گئی تھی - آپ نے لوگوں سے روپیہ جمع کرکے اسے پھر سے تعمیر کرایا - میہم میں محلہ کی مسجد کے سامنے کے حصہ پر اپنے خرچ سے خوبصورت ملتانی ٹائلیں لگوائیں - کشمیر گئے تو وہاں کے عوام اور بالخصوص مسلمانوں کی حالت کو ناگفتہ بہ پایا - یہاں ذبیحہ گاؤ اور قتل انسانی ایک ہی نوعیت کے جرم تھے - اس بارے میں آپ کے معرکتہ الآرا مگر مدلل و دل نشین فیصلوں سے دربار کشمیر ہراساں ہو گیا - پھر کشمیر میں شرح سود پچیس فیصد تھی - آپ کے پاس جو اپیلیں آئیں آپ چھ فیصد سے زیادہ کی اجازت نہ دیتے - آپ نے سری نگر کی ایک برباد شدہ مسجد کی تعمیر و مرمت کرائی - وہاں جمعہ کی نماز بھی ہونے لگی - کشمیر کے محکمہ انصاف میں اگر کہیں اکا دکا مسلمان بھی تھا تو وہ چپراسی تھا - آپ نے کئی مسلمانوں کو ملازم رکھا اور رکھوایا - ہمارے محترم دوست قائد کشمیر چودھری غلام عباس راوی ہیں کہ انکے والد کو بھی پیر زادہ صاحب نے ہی ہائی کورٹ میں اہلمد رکھا اور ان پر اس قدر شفقت کرتے تھے کہ کشمیر سے جاتے وقت ایک بڑے پنجرے میں انہیں کوئی خوبصورت پرندہ دے گئے جس سے چودھری صاحب اپنے بچپن میں کھیلا کرتے تھے - چودھری صاحب موصوف کے علاوہ کئی

سربرآوردہ معمر کشمیری حضرات نے راقم کو بتایا کہ بعد میں اہل کشمیر نے جو آزادی کی تحریک چلائی اس کے محرک بعید بھی پیر زادہ صاحب تھے۔ اپنے چار سالہ قیام کشمیر میں آپ نے وہاں کے مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ اگر وہ متحد ہو جائیں اور تعلیم حاصل کریں تو جابر سے جابر حاکم بھی انہیں ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ کشمیر میں آپ نے اپنی معرکتہ الآرا نظم "آئینہ کشمیر" لکھی جو اس زمانہ میں ہر پڑھے لکھے کشمیری کی زبان پر تھی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔ آخر ایک سرکاری ملازم کشمیر میں بیٹھ کر اس سے بڑھ کر اور کیا کہہ سکتا تھا:

اگرچہ ہر جگہ افلاس کا غلبہ ہے خطہ میں
مسلمانوں کا لیکن حال یاں بالکل برا دیکھا
نہ ان میں علم اور دولت نہ عزت اور حکومت ہے
تجارت کے اصولوں سے انہیں نا آشنا دیکھا
اگر حرفت سے آدھا پیٹ بھر لیتے چند ان میں
تو اس پر بھی حریفوں کا دھان آزوا دیکھا
نہ ہے دربار میں ان کی رسائی اور نہ لشکر میں
مگر ہاں کفش برداروں میں اک دو کو کھڑا دیکھا
دفاتر اور مدارس اور عدالت میں ہیں وہ عنقا
ہوا کیا پانچ دس کے جو گلے میں پر تلا دیکھا
قصور انکا ہے کچھ اور کچھ ہے دوسروں کا بھی
بیاں کرنا بتفصیل اس کو میں نے ناروا دیکھا
علاج اس ذلت و افلاس کا پوچھو اگر مجھ سے
تو چلتا نسخہ اس کے واسطے تعلیم کا دیکھا

اگر ہو اتفاق اس کثرت تعداد کے ہمراہ
تو یہ جانوں کہ تم نے کام سب اپنا سا دیکھا
فقط ہے اتفاق اور کوشش کی کمی ورنہ
ذہانت میں نہ میں نے کوئی تم سا دوسرا دیکھا
تمہارے بھائی بھی پنجاب کے دیں گے مدد تمکو
کہ ایسے وقت میں کب بھائی کو دیتے دغا دیکھا

ملازمت سے ریٹائر ہو کر آپ دہلی میں مقیم ہوگئے اور عمر کے بقایا سولہ سال علمی مشاغل اور قومی کاموں میں گزارے۔ آپ بیک وقت تعلیمی، علمی و ادبی، تبلیغی، سیاسی اور انتظامی کاموں میں منہمک ہوگئے۔ آپ بلدیہ دہلی کے نائب صدر بنے، صدر خود ڈپٹی کمشنر دہلی باعتبار عہدہ ہوا کرتا تھا۔ دہلی کی جامع مسجد اور مسجد فتح پوری کی ملکیت کروڑوں روپے کی جائیداد ہے۔ ایک مدت تک آپ ان دونوں مسجدوں کی کمیٹیوں کے سکریٹری رہے۔ اینگلو عربک کالج کمیٹی دہلی کے سکریٹری بھی رہے۔ گویا آپ ان تینوں اداروں کی روح رواں رہے جن کے سپرد دہلی کے مسلمانوں کی جدید اور دینی تعلیم کا کام تھا۔ دہلی یونیورسٹی ۱۹۲۳ء میں قائم ہوئی آپ شروع ہی سے یونیورسٹی کورٹ، ایگزکٹو کونسل اور فیکلٹی آف لا کے رکن تھے۔ نیز اس یونیورسٹی کی لائبریری کے آنریری لائبریرین بھی وفات تک رہے۔ آپ نے اس یونیورسٹی کو بہت سی نایاب کتابیں بھی تحفتہً دیں۔ دہلی یونیورسٹی نے آپ کو ایم اے کی اعزازی (Ad eundem) ڈگری بھی دی۔

طبیہ کالج کے تذکرہ کے بغیر آپ کے تعمیری کاموں کا بیان نامکمل رہے گا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خان آپ کے عزیز ترین اور

بے تکلف دوست تھے۔ یہ صرف پیرزادہ صاحب کا اثر تھا کہ مسیح الملک اپنے روزانہ مشاغل اور سیاست میں انہماک کے باوجود اس عظیم ادارہ کے قیام پر آمادہ ہوئے۔ پیرزادہ صاحب نے پوری سکیم تیار کی اور اسے عملی جامہ پہنانے کا ذمہ لیا۔ طبیہ کالج کمیٹی قائم ہوئی جس کے سکریٹری مسیح الملک حکیم اجمل خان تھے اور جائنٹ سیکریٹری آپ۔ آپ کی نگرانی میں چندہ جمع ہوا اور کالج کی عمارات تعمیر ہوئیں اور جب طب مشرق کا یہ عالیشان ادارہ چلا تو اس کا انتظام درو بست آپ کے ہاتھ میں تھا۔ یہ تعلق مرنے کے بعد بھی قائم رہا چنانچہ آپ کو اس کالج کے احاطہ میں ایک ممتاز جگہ پر دفن کیا گیا۔

بنیادی طور پر آپ پر سیاست کا جامہ راست نہیں آ سکتا تھا۔ مگر یہ ممکن نہ تھا کہ دہلی کے مسلمانوں کا کوئی اجتماعی کام ہو اور آپ اس میں شرکت نہ کریں چنانچہ آپ دہلی مسلم لیگ کے صدر بھی تھے۔ آپ کے ملی درد کا اندازہ اس تضمین سے ہوتا ہے جو آپ نے علامہ شبلی نعمانی کی مشہور ملی نظم ''وفد انصاری'' پر کی۔ کل ستائیس بند ہیں۔ پوری تضمین پڑھنے کے قابل ہے۔ جگہ کی قلت کی وجہ سے یہاں صرف سات بند نقل کئے جاتے ہیں:

کریگی شکر کیا اس کا زباں انساں کی بیچاری
مگر ہے فرض بندے کا رہے ذکر خدا جاری
جبیں کو خاک پر رکھ کر بصد عجز و بصد زاری
ادا کرتے ہیں ہم شکر جناب حضرت باری
کہ آئے خیریت سے ممبران وفد انصاری

سہی آہ بتیاں اور طیاری میں عجلت کی
نہ آسائش کی پرواہ کی نہ زر کی اور نہ شہرت کی

سمندر پار کرکے غازیاں دیں کی نصرت کی
ہزاروں کوس جا کر بھائیوں کی اپنے خدمت کی
یہی تھا درد اسلامی یہی تھی رسم غم خواری

کسی عابد کو تم سی یہ عبادت مل نہیں سکتی
کسی زاہد کو تم سی یہ ریاضت مل نہیں سکتی
کسی صوفی کو تم سی استقامت مل نہیں سکتی
کسی کو خواب میں بھی یہ سعادت مل نہیں سکتی
مریضوں کے لیے وہ آپ کی راتوں کی بیداری

جریح تشنہ کو تلوار کا پانی پلا دینا
بلکتے بچے کو گولی کا تر لقمہ بنا دینا
بلانا باپ کو بیٹی کی بے شرمی دکھا دینا
گھروں کو لوٹنے کے بعد رندوں کو جلا دینا
نئی تہذیب کے تم نے نئے قانون بھی دیکھے ہیں

عجب کیا ہے جمعیت کا اگر چشمہ ابل آئے
عجب کیا شوکت اسلام کا نعم البدل آئے
عجب کیا ہے کوئی فاروق بھی ہم میں نکل آئے
عجب کیا ہے ! کہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

کوئی بھی بات عاجز کی اگر جاتی ہے واں مانی
پہنچتی ہے اگر واں تک صدائے آہ انسانی
اگر ریش سفید پیر پر ہے فضل ربانی
دعائے کہنہ سالاں ہے اگر مقبول یزدانی
تو اب دست دعا ہے اور یہ شبلی نعمانی

کشمیر کے مسلمانوں کے بارے میں آپ کی نظم آئینہ کشمیر سے بعض شعر پیش کیے جا چکے ہیں۔ مثنوی عقد گوہر سے انگریزوں کے بارے میں کچھ ابیات سن لیجیے۔ پیش نظر رہے کہ یہ نظم اس وقت کہی گئی جب آپ "عارضی" سیشن جج تھے اور خطاب یافتہ بھی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد جو دارو گیر اور انتقامی کاروائی انگریزوں نے کی اس کا نقشہ کھینچا ہے:

عقل چلدی حاکموں کو کر سلام سر چڑھا ان کے جنون انتقام
دعوی تہذیب سب نکلا دروغ عقل کو غصہ کے آگے کیا فروغ
عقل اور تہذیب جب باقی رہے آدمیت پھر کہاں باقی رہے
حاکموں کی ہوگئیں عقلیں خفیف بے گنہ مارے گئے لاکھوں شریف
ایک مجرم کی جگہ سو بے خطا مار ڈالے پر نہ دل ٹھنڈا ہوا
تھی کسے فرصت بھلا تحقیق کی لگ رہی تھی ملک میں اک آگ سی
تھی یہی کافی انہیں بس ایک دلیل ہے یہ موقع، ہوں بڑے سارے ذلیل
جس کے ہو کھیسے میں اک خالق خدا مصلحت رکھنا نہیں اس کا بجا
ہو جو لالہ زار میں ڈوڈا بلند خود پسندوں کو نہیں آتا پسند

اعتراض ان پر ہے اب کرنا فضول
ہوں یہی شاید حکومت کے اصول

جب آپ کا دھلی میں قیام تھا تو آریہ سماج کی طرف سے شدھی کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ اور مسلمانوں کو ھندو بنایا جارھا تھا۔ اس خطر ناک تحریک کے جواب میں مسلمانان ھند نے کئی تبلیغی انجمنیں بنائیں جن میں غالباً سب سے بڑی مرکزی جمعیت تبلیغ الاسلام تھی۔ آپ اس جمعیت سے وابستہ تھے۔ جمعیت کا سب سے یاد گار جلسہ وہ تھا جو ۱۹۲۷ء میں دھلی میں ھوا۔ اس جلسہ

کے صدر نو مسلم انگریز الحاج لارڈ ہیڈلے فاروق تھے اور مجلس استقبالیہ کے صدر پیر زادہ صاحب ۔ لارڈ ہیڈلے کی سہولت کے لئے آپنے خطبہ استقبالیہ انگریزی میں پڑھا ۔ آپ نے کہا :

" شدھی سبھاؤں کی کارگزاریاں ہمارے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئیں ۔ انہوں نے ہماری توجہ اس تلخ حقیقت کی طرف کرائی کہ مسلمانوں کی اکثریت جاہلیت اور اقتصادی غلامی میں مبتلا ہے اور ہمیں فوری طور پر ان کی حالت بہتر بنانی چاہئے مرکزی جمعیت تبلیغ اسلام ۔ ۔ ۔ کے مقاصد میں غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام ہی نہیں ہے بلکہ بالعموم مسلمانوں کی اخلاقی ، معاشرتی اور اقتصادی بہتری ہے اور خاص طور پر نو مسلموں کی اخلاقی حالت درست کرنا ہے"

(ترجمہ)

کتب خانہ | آپ کا خاندانی کتب خانہ تو ۱۸۵۷ء میں غارت ہو گیا تھا ۔ اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لئے آپ نے متعدد کتابیں جمع کیں جن میں کئی سو قلمی نسخے بھی تھے ۔ حکیم ناصر خسرو کی کتاب زادالمسافرین کا خطی نسخہ چودہ سو روپے میں خریدا ۔ یہ نسخہ ۵۰۲ھ کا کتابت کردہ ہے ۔ اور اس پر امیر الامرا نعمت علی خان کی ۱۱۲۴ھ کی مہر ہے ۔ آپ کو کتابوں سےمحض الماریاں سجانے کا شوق نہ تھا بلکہ آپنے ایک ایک کتاب کا مطالعہ کیا ۔ آپ کے ذخیرۂ کتب کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں قرآن ، تفسیر ، رجال ، حدیث ، علم کلام ، فقہ ، تاریخ و سیر ، شعرو ادب ، تصوف ، اخلاقیات ، سفر نامے ، مکاتیب ، حکمت ، نجوم ، جفر ، موسیقی ، فلکیات ، انگریزی قانون ، ریاضی ، فرہنگ اور قدیم ہندی علوم وغیرہ پر منتخب کتابیں تھیں ۔ آپ کی وفات کے بعد یہ قیمتی ذخیرہ تباہ

ہونے لگا - حریصوں نے قیمتی اور نایاب نسخے اڑوا نے شروع کردئے
سیکڑوں کتابیں کرم خوردہ ہوگئیں۔ ڈاکٹر مولوی میاں محمد شفیع مرحوم
کا مشرقی علوم کے ساتھ شغف آپکو سہم لے گیا اور آپ نے یہ کتب خانہ
دو ہزار تین سو روپے کے عوض پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے لئے
۱۹۲۹ء میں خرید لیا ۔ اب یہ ذخیرہ کتب پنجاب یونیورسٹی
لائبریری میں مجموعہ پیرزادہ کے نام سے تین حصوں پر مشتمل ہے۔
اردو کی مطبوعہ کتب حصہ اردو میں ہیں۔ عربی و فارسی کی مطبوعات
بالائی منزل میں الگ الماریوں میں ہیں ۔ قلمی نسخوں کی تعداد ۱۶۵
ہے اور مطبوعہ کتابیں ۸۰۹ ہیں ۔

مترجم | پیر زادہ صاحب نے جن کتابوں کا ترجمہ کیا ان میں سے
ہمیں مندرجہ ذیل کا علم ہو سکا ہے :

(۱) منطق استقرائی : ۱۶۷ صفحے کی یہ کتاب ۱۸۸۳ء میں انجمن
پنجاب پریس لاہور سے طبع کی ۔ اس کے دیباچہ میں مصنف نے بتایا ہے
کہ یہ کسی خاص کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ فاؤلر ' مل اور جیون
وغیرہ کی ترجمانی ہے ۔ نیز لکھا ہے کہ " یہ حقیر کتابچہ اس ملک
کے رہنے والوں کو پہلی مرتبہ طریق ہائے بیکن اور جدید فلسفہ سے
متعلق معلومات فراہم کریگا اور انہیں پہلی مرتبہ یہ بتائیگا کہ یورپی
سائنسی علم کی بنیاد کیا ہے ۔ کس طریق سے اس کی ترقی ہوئی اور اس
میں کیا کیا نقائص ہیں جن سے اسے پاک ہونا چاہئے" اس کتاب کا
ایک نسخہ ہمارے پاس ہے اور دو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں
س ۱۶۱ حسین اور ۵۲۰ حسین نمبروں پر ہیں ۔

(۲) رسالہ علم سکون سیالات : یہ سیکوڈ بیلو شپ کا پہلا ترجمہ
پنجاب پبلک لائبریری کے نمبر س ۵۳۴ پر موجود ہے ۔

(۳) مفتاح الافلاک یا علم هئیت : ۲۷٦ صفحہ پر مشتمل یہ کتاب پرنسپلز آف پلین اسٹرونومی کا ترجمہ ہے ۔ اسے انجمن پنجاب نے ۱۸۹۳ء میں شائع کیا ۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب پبلک لائبریری میں نمبر ح ۵۲۰ حسین پر ہے ۔

(۴) رسالہ علم سیارات : ہم نے اس رسالہ کا اشتہار کتاب علم ہئیت میں دیکھا ہے ۔

(۵) رسالہ سیاست مدن : اس کا اشتہار رسالہ تشریحات قانونی میں ہے جس کا ذکر نمبر ۷ پر ہوگا ۔

(٦) سر ولیم ہملٹن صاحب کے فلسفہ کا خلاصہ : اس کا اشتہار علم اصول قانون میں دیکھا ہے جس کا ذکر نمبر ۸ پر آئیگا ۔

(۷) تشریحات قوانین انگلستان : بلیکسٹن کی اسی نام کی کتاب کے دیباچہ اور چھ ابواب کا اردو ترجمہ ہے ۔ مطبع گلزار محمدی لاہور میں ۱۸۸۲ء میں طبع ہوا ۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب پبلک لائبریری کے نمبر ۲۴۳ حسین پر ہے ۔

(۸) علم اصول قانون : ای ڈبلیو ہارکر کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے ۔ ۲۵۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مطبع انجمن پنجاب لاہور نے ۱۸۸۴ء میں طبع کی ۔ اس کا ایک نسخہ ہمارے پاس ہے ۔

(۹) اصول قانون : مارکبی کی اس نام کی کتاب کا ترجمہ ہے ۲۴۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب گلزار محمدی پریس لاہور میں طبع ہوئی ۔ اس کتاب کا ایک نسخہ پنجاب پبلک لائبریری میں نمبر س او ۳۴۰ حسین پر ہے ۔

(۱۰) رسالہ اقسام حقیت اراضی و طریق ہائے مالگزاری : مسٹر پویل کی کتاب کا ترجمہ ہے ۔

(١١) سفر نامہ ابن بطوطہ : ابن بطوطہ کے سفر نامہ موسومہ عجائب الاسفار کے اس حصہ کا ترجمہ ہے جو برصغیر پاکستان و ہند سے متعلق ہے - یہ ترجمہ پہلی بار ١٨٩٨ع میں دار الاشاعت پنجاب لاہور سے آپ کے ہم جماعت سید ممتاز علی صاحب نے شائع کیا - اسے دوسری مرتبہ ١٩١٨ء میں شیخ نزیر حسین شریف تاجران کتب محلہ گڑھیا جامع مسجد دھلی نے شائع کیا - دوسرا ایڈیشن ٥٣٢ صفحات پر مشتمل ہے - جن حضرات کو بھی ترجمہ کا تجربہ ہے وہ اس ترجمہ کے دیباچہ میں یہ پڑھکر حیران ہونگے کہ پیر زادہ صاحب عربی کتاب سامنے رکھ کر اس کا ترجمہ لکھواتے گئے - اصل کتاب ادق عربی میں ہے اور ابن بطوطہ نے دوسری زبان کے الفاظ بلا تکلف استعمال کر کے اسے اور بھی مشکل بنا دیا ہے - عجائب الاسفار کے جس قدر ترجمے اب تک انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں ہو چکے ہیں یہ اردو ترجمہ ان میں بہترین ہے - اس ترجمہ کے بارے میں شیخ محمد اکرام سی ایس پی نے آب کوثر میں لکھا ہے :

''اس سفر نامے کا اردو ترجمہ خان بہادر مولوی محمد حسین نے نے بڑے سیر حاصل اور فاضلانہ حواشی اور تشریحات کے ساتھ شائع کیا ہے جس سے ترجمہ کی قدر و قیمت اصل کتاب سے دوچند ہو گئی ہے'' (ص ٣٨٥ مطبوعہ فیروز سنز ١٩٥٢ء بار سوم)

<u>بحیثیت شاعر</u> | پیرزادہ صاحب شعر بھی کہا کرتے تھے - عارف تخلص تھا - گورنمنٹ کالج لاہور میں مولانا محمد حسین آزاد (١٨٢٩ - ١٩١٠ع) کے شاگرد رہ چکے تھے - اس شاگردی اور کسب فیض کا تذکرہ انہی سے سنئے :

آنکھیں تونے دیکھی ہیں، آزاد کی طرز نو کی نظم کے اُستاد کی
نیز جس کی نظم سے موزوں تر نظم جس کی مفخر اہل ہنر
جب ہوا گم ملک سے ذوق سلیم نظم میں کی اس نے اصلاح عظیم
نہ بتایا لکھ کے نیرنگ خیال اس طرح لکھتے ہیں نثر اہل کمال
عصر سے محروم اسکندر رہا قوم کو آب حیات اس نے دیا
عکس کھینچا اکبری دربار کا یہ دیا تاریخ دانوں کو دکھا
شے مورخ کے لیے کیا کیا ضرور جو نہاں اگلوں میں تھیں اور کیا قصور
اس طرح تاریخ اور انشا بہم جمع کر سکتا ہے اک جادو رقم
ہوں وقائع اس میں سب دلچسپ اگر ان سے ہوں الفاظ دل آویز تر
کم نصیبی ہے کہ وہ خورشید فن ہے خسوف ماندیا میں ممتحن
استوا پر شمس عقل آیا نہ تھا
حیف اسے ابر جنوں نے ڈھک لیا

۱۸۹۸ع میں فیروزپور میں تھے کہ میرزا ارشد گورگانی سے تعلقات قائم ہوئے اور ان سے اصلاح بھی لی :

جستجو ہے کیوں کسی استاد کی پاس ہے جب میرزا عبدالغنی
کیوں بہر ارشد نقاد سے جانتا ہے قافیہ کے قاعدے
نظم کر کے کچھ حکایات اے عزیز اس کو دکھلا نظم ہے جس کی کنیز
مستند ہے ہند میں جس کی زباں نقل محمل جس کی ہے طرز بیاں
نظم کے اور قافیہ کے قاعدے وہ بتا دے گا انہیں سب یاد ہیں

آپ نے فن شاعری کا باقاعدہ مطالعہ کیا ۔ خود بڑے ما ضابطہ انسان تھے اس لئے اپنی شعر گوئی کا ضابطہ بھی بنایا ۔ چنانچہ نظم کے شرائط کے تحت لکھتے ہیں :

شرط ہے لیکن کہ آسان ہو کلام
ہو کہیں اغلاق کا اس میں نہ نام

طرز ہو سادہ لغت بھی ہو سلیس
ہو بیاں شستہ مضامیں ہوں نفیس
رشتہ مطلب ہو گم اشعار میں
ڈھونڈتے ہی ربط مضموں کو پھریں
اور نہ ہو وہ مختصر بھی اس قدر
بس مطلب کا ملے پاؤں نہ سر
ہو زباں وہ بولتے ہیں جس کو سب
جس سے ہوں مانوس سب کے گوش و لب
روز مرہ ہو ، مگر ٹکسال کا
جس پہ ہو انگشت رکھنے کی نہ جا
فارسی کی اس میں ترکیبیں ہوں کم
ہو نہ تعقید اور تشبیہیں ہوں کم
ہوں نہ اس میں استعارات بعید
ہوں نہ الفاظ مرادف اور مزید
نظم کو پھیکی کہیں گے بے ہنر
جاہلوں کے طعن کی پروا نہ کر
لفظ ہوتے ہیں معانی کا لباس
ہے وہی اچھا جو ہو سادہ لباس

عارف سہمی کی شاعری کی چار نمایاں خصوصیات ہیں - پہلی یہ کہ ان کی شاعری گل و بلبل کے افسانوں سے اس حد تک پاک ہے کہ ابتدائی مشق کے زمانہ میں بھی آپ نے ایک شعر بھی رواجی طرز میں نہیں کہا - دوسری خصوصیت سادگی ہے - کسی بھی سادہ گو شاعر کا کلام پڑھ جائیے سینکڑوں الفاظ ایسے پائیں گے کہ ایک

عام قاری کو لغت کی ضرورت پیش آئے گی اور یہ بھی ممکن ہے کسی بھی اردو لغت میں ان میں سے بعض الفاظ کے معنی نہ ملیں۔ عارف مہمی کے ہاں مروجہ اصطلاحات کے علاوہ جن کا استعمال ناگریز تھا شاید ہی کوئی لفظ ایسا ہو جو ایک معمولی استعداد کا قاری نہ سمجھ سکے۔ تیسری خصوصیت وہ ہے جو شاید آپ کو تمام اردو شعرا میں ممتاز کرتی ہے کہ رندی اور ہوسناکی کی لغت کے جو الفاظ اور ترکیبیں صوفی شعرا نے پاکیزہ جذبات و واردات قلبی کے اظہار کے لئے استعمال کیں اور اس طرح وہ ہمارے ادب کا جزو لاینفک بن گئیں انہیں بھی پیر زادہ صاحب نے استعمال نہیں کیا۔ چوتھی خوبی یہ ہے کہ عارف کا کلام ان کے تفکر و جذبات کا ہی اظہار نہیں کرتا بلکہ ان کی اپنی بے داغ عملی زندگی کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ یہ مختصر سا کلام مشرقی شریفانہ معیار زندگی پر ہر طرح پورا اترتا ہے۔ کلام میں سادگی پیر زادہ صاحب کی سلجھی ہوئی زندگی کی نمائندگی کرتی ہے۔ ناصحانہ انداز بیان عارف کی اپنی اصلاحی طبیعت کا آئینہ دار ہے۔ موضوعات کا تنوع شاعر کی جامع الصفاتی کا مظہر ہے۔ آپ کی حسب ذیل مثنویاں اور نظمیں شائع ہو چکی ہیں :

(۱) عقد گوہر موسوم بہ موتیوں کا ہار : ۱۳۲۶ اشعار پر مشتمل ہے۔ مثنوی مولانا روم کی سو حکایات کا اسی بحر میں ترجمہ ہے۔ ہر حکایت بیان کرنے کے بعد جناب عارف نے اس سے نتیجہ اخذ کیا ہے۔ کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ اس پر علامہ اقبال نے قطعات تاریخ لکھے۔

(۲) حکایات لقمان

(۳) خون کا پیاسا

(۴) قصیدہ بانت سعاد : عربی قصیدہ کا منظوم ترجمہ ہے۔

(۵) قصیدہ بردہ : عربی قصیدہ کا منظوم ترجمہ ہے۔

(۶) ذکر العارفین : تین سو دس شعروں میں خاکی کی نظم ورودالمریدین (۹۹۱ھ) کا ترجمہ ۱۳۲۹ھ میں کیا۔

(۷) منظوم ترجمہ آیت الکرسی :

(۸) تضمین "وفد الضاری" : علامہ شبلی کی نظم پر تضمین ہے۔

(۹) یاد حق : عراقی کی نظم پر آٹھ بندوں میں تضمین ہے۔

(۱۰) امید مغفرت

(۱۱) خیر مقدم

(۱۲) عدل اور قوم

(۱۳) زاہد خشک

(۱۴) پیر مغاں

(۱۵) شرابی اور اس کی بیوی

(۱۶) خدا خود میر ساماں ہے ہر اک بے برگ و ساماں کا

(۱۷) عروس دنیا

(۱۸) تیں قطعات

(۱۹) فضل خدا

(۲۰) مینڈک اور شہزادی کا قصہ

(۲۱) آئینہ کشمیر : ۱۶۵ اشعار ہیں

(۲۲) جوان بیٹے کو باپ کی وصیت : ایک سو بائیس شعر کی نظم ہے۔ اپنے فرزند بشیر احمد بار ایٹ لا کو نصائح کی ہیں۔ پیر زادہ بشیر احمد اسی جہاز سے یورپ گئے تھے جس سے علامہ اقبال نے سفر کیا۔ دونوں نے ساتھ

تعلیم پائی ۔ اس وصیت نامہ کا اسلوب نہایت ھی دلکش ھے ۔ ایک معمر فاضل باپ اپنے جوان تعلیم یافتہ بیٹے کے لئے دستور العمل تیار کر رھا ھے ۔ مگر الفاظ اتنے سادہ ھیں گویا روزمرہ کے پیار بھرے لفظوں میں نصیحت کی جا رھی ھے ۔ آغاز یوں ھوتا ھے :

جواں تو اور میں پیر کہن سال — مرا جانا ترا آنا ھے اقبال
ھوا مجھ سے نہ کوئی کام کا کام — پریشانی ھوا آخر کو انجام
گناھوں میں گنوائی عمر رفتہ — گزاری یونہی سال و ماہ و ھفتہ
کوئی نخل عمل ایسا لگاتا — کہ جس کے پھل کو میں اسوقت کھاتا
مگر ھے فائدہ افسوس سے کیا — کہ پچھتانے نہیں اب کام بنتا
جو اوقات عمل تھے کھو دئے سب — جگہ پھولوں کے کانٹے بو دئے سب
تری مٹھی میں ھے سرمایہ خیر — تیرے سر پر ھے چتر سایہ خیر

پھر کچھ آگے چل کر حصول تعلیم پر زور دیتے ھیں ۔ مگر فرماتے ھیں کہ تعلیم صرف سکول اور کالجوں کی چار دیواری تک محدود نہیں ۔ یہ لگن دم آخرین تک لگی رھنی چاھئے :

تعلم کا مگر رکھ شوق دائم — حواس خمسہ ھیں جب تک کہ قائم
نہ چھوڑو علم کو چاھے کہیں ھو — ورنگ اس کا ھو معدن یا کہ چین ھو

ساتھ ھی یہ تنبیہ کر دی ھے کہ محض کتابی کیڑے احدی ھوتے ھیں :

عمل کراسپہ جو تو نے پڑھا ھے — کہ علم بے عمل قہر خدا ھے

اور اس عملی زندگی کی غائت بتائی ھے :

عمل کا جل چکے خلعت تو پھر کر
اسے اخلاص کی بو سے معطر

خدا کی ہے اگر تجھ پہ عنایت
تری ہر کام میں ہو گی یہ غایت
کہ خوش ہو تجھ سے تیرا حق تعالیٰ
یہی مقصد ہے ہر مقصد سے اعلیٰ
غرض تیری نہ کوئی درمیاں ہو
ریا کا بھی نہ اس میں کچھ نشاں ہو
رہے گا اپنی ہر کوشش میں ناکام
اگر تو چاہتا ہے کام میں نام
مقصد اپنے لئے بھی جان اسی کو
کہ جس میں بہتری کل قوم کی ہو
نہیں جس دل میں درد قوم پنہاں
نہ دیکھو گے نشاں اخلاص کا واں
جو کام اخلاص سے ہوتا ہے عاری
اسے کہتے ہیں دانا خام کاری
مگر یہ یاد رکھنا اے مری جان
نہیں ہرگز نہیں، اخلاص آسان
بہت سی مشکلیں آئیں گی در پیش
کہ سد راہ ہوں گے غیر اور خویش
جو اس رستہ میں رکھتا ہے قدم کو
تو وقف قوم کر دے اپنا دم تو

غریب اور بے کسوں سے تعلق رکھنے کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

عدد کے صفر کو دائیں لگائیں　　تو دہ چند اپنی عزت کو بڑھائیں

ایک سے زیادہ شادیوں سے متعلق فرمایا :

نہیں گر کوئی امر سخت مانع   تو رہنا ایک ہی بیوی پہ قانع
کبھی بھی دوسری شادی نہ کرنا   اور اپنی خانہ بربادی نہ کرنا

مندرجہ بالا نظموں میں سے آخری اٹھارہ یکجا "خزینہ عارف یعنی مجموعہ نظم عارف" کے نام سے رحمانی پریس میں طبع کرا کے محمد نذیر حسین حافظ محمد شریف حسین تاجران کتب دہلی نے شائع کیں - یہ مطبوعہ نسخہ ہمارے پیش نظر ہے -

منظور الحق صدیقی ' ایم - اے
کیڈٹ کالج ' حسن ابدال

امام ابن قیم الجوزیۃ

حالات زندگی اور مصنفات

ہر دور میں جب بھی فکر و عمل کی دنیا میں کوئی بگاڑ پیدا ہوا اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کبری ایسے اشخاص کو جنم دیتی رہی جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو سر انجام دیں اور حق و صداقت کے جھنڈوں کو سر بلند رکھیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہزارہا آزمائشوں کے باوجود اسلام آج زندہ ہے اور اس کے ماخذ ایسے روشن، اس کا طریق ایسا واضح اور اس کے اصول و تفصیلات کا نقشہ اس قدر جانا بوجھا اور متعارف ہے کہ اس میں کہیں بھی التباس کی گنجائش نہیں ۔

آٹھویں صدی ہجری کے اوائل کا زمانہ تاریخ اسلام میں نہایت تاریک اور ابتلائی دور تھا ۔ خلافت بغداد کا شیرازہ بکھر چکا تھا ۔ ملک میں طوائف الملوکی کی گرم بازاری تھی ۔ باہمی آویزش اور خانہ جنگی کی وجہ سے ہر طرف فتنے پیدا ہو رہے تھے ۔ ہر قسم کے علمی و عملی مفاسد اپنے کمال و بلوغ کو پہنچ گئے تھے ۔ باہمی تعصب و تفرقہ کی آگ بھڑکنی شروع ہو گئی تھی ۔ حتیٰکہ جن چھوٹے چھوٹے اختلافات کو پہلے عوام نے کبھی اہمیت نہ دی تھی ان کی بنا پر اب خواص و فقہا ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کرنے لگ گئے تھے ۔ علم و عمل کی وہ ساری بدعتیں جو آج اہل اسلام کے رگ و پے میں سرایت کی ہوئی ہیں اگرچہ ان کا شیوع اس سے پہلے ہو چکا تھا مگر حقیقی جماؤ اسی زمانہ میں ہوا ۔ تاتاریوں نے مشرق سے عربی خلافت کا خاتمہ کرکے اور

کئی لاکھ مسلمانوں کو تلوار کے گھاٹ آتار کر ملک کو بے غیرت اور بزدل بنا دیا تھا۔ غرضیکہ عالم اسلام پر بلحاظ علم و عمل مردنی چھائی ہوئی تھی۔

ایسے پر آشوب اور نازک زمانے کی اصلاح و ھدایت کا فریضہ ابو العباس ابن تیمیہ اور اُن کے شاگرد رشید حافظ ابن القیم کو سونپا گیا۔ استاد و شاگرد نے ایک ھی وقت میں ملت کی احیاء و تجدید کا کام بھی لیا اور قرآن حکیم بلکہ جملہ اسلامی علوم کے غیر مفتوح دروازے بھی کھول دئے۔ بدعات و محدثات کے خلاف بھی قولاً و عملاً صدا بلند کی۔ ذیل کے صفحات میں امام ابن تیمیہ کی دعوت و تحریک کے داعی خاص اور اُن کے سب سے نامور شاگرد حافظ ابن القیم کے حالات زندگی اور اُن کی مصنفات پر تبصرہ کیا جاتا ھے۔

نام نسب اور ولادت

آپ کا پورا نام شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر بن ایوب بن سعد بن حریز الزرعی[1] تھا۔ ۶۹۱ھ[2] میں دمشق میں پیدا ہوئے۔

---

(۱) قال السخاوی فی الانساب من کتابہ الضوء اللامع: الزُرعی نسبة لزرع قرية من حوران و الذی رایتہ بعد البحث ان ھذہ القريہ ھی التی تسمی الان ازرع وکان اسمها فی القدیم زُرّا و ربما سمیت زُرہ - قال یاقوت فی معجم البلدان ما ملخصہ: (زُرا) قال الحافظ ابو القاسم الدمشقی: ابو الحسن الجھنی الزُرعی من اھل زرا التی تدعی الیوم زرّع و قال فی موضع آخر: العریہ قریہ من اعمال زُرع من نواحی حوران و قال ایضاً: (نمر) بالضم اسم قریہ من اعمال حوران من اراضی دمشق بموضع یقال لہ اللجا (کذا ولعلہ اللجاہ) و ھو صعب المسلک الی جنب زرہ التی تسمیھا العامہ زُرع ویقال ان فیھا بئر لیسع النبی السلام زُرع تدعی الان ازرع (روضہ المحبین ص ع)

(۲) الدرر الکامنہ ۳: ۴۰۰، البدر الطالع ۲: ۱۴۳، جلاء العینین ۲۰، طبقات الحنابلہ، بغیہ الوعاہ ۲۵، النجوم الزاہرہ ۵: ۱۰۵، شذرات الذھب ۶: ۱۶۸۔

آپ کے والد دمشق کے مدرسہ الجوزیہ[۳] کے قیم (نگران) تھے اسی بنا پر ابتداء میں آپ کو ابن قیم الجوزیہ کہا جاتا تھا ۔ بعد میں صرف ابن القیم کے نام سے مشہور ہوئے ۔

تحصیل علم

آپ کے والد ابوبکر بن ایوب اپنے دور کے جلیل القدر علماء میں سے تھے ۔ علم میراث میں آپھیں خاص طور پر مہارت حاصل تھی ۔[۱] چنانچہ ابن القیم نے علم میراث اپنے والد سے ھی پڑھا اور ایک مدت تک جمیع اصناف علوم و فنون میں اپنے زمانے کے مشہور شیوخ سے تکمیل کی ۔ امام ابن تیمیہ کے علاوہ آپ کے دیگر اساتذہ کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ھیں :

(۱) قاضی تقی الدین سلیمان ۔ (۲) ابوبکر بن عبدالدائم ۔ (۳) اسماعیل بن مکتوم ۔ (۴) علی بن ابی الفتح ۔ (۵) المجد التونسی ۔ (۶) ابن الشیرازی ۔ (۷) فاطمۃ بنت جوھر ۔ (۸) المجد الحرانی ۔ (۹) صفی الھندی ۔ (۱۰) الشھاب النابلسی ۔ (۱۱) عیسی المطعم[۲] ۔

عربی زبان فاطمہ بنت جوھر سے سیکھی ، فقہ مجد حرانی سے اور اصول کی کتابیں صفی الھندی سے پڑھیں ۔ حافظ ابن القیم کے یہ سارے اساتذہ آسمان علم کے درخشندہ ستارے تھے اور اپنے اپنے فن میں آپھیں

---

(۳) کرد علی اپنی کتاب خطط الشام میں مدرسہ الجوزیہ کے متعلق لکھتے ھیں :

الجوزیہ فی البزوریہ کانت فی عہدنا محکمہ شرعیہ ثم جعلتھا جمعیہ الاسعاف الخیری مدرسہ للایتام ، ثم حرقت فی الثورہ ، انشاء محی الدین بن جمال الدین ابن الجوزی ۔ خطط الشام ۶ : ۹۸ ۔

(۱) الدرر الکامنہ ۳ : ۴۰۱ ، طبقات الحنابلہ (مخطوطہ)

(۲) بغیہ الوعاہ ۲۵ ، الدرر الکامنہ ۳ : ۴۰۰ ، ۴۰۱ ، طبقات الحنابلہ (مخطوطہ)

کمال حاصل تھا ان اساتذہ کے فیضان صحبت کا اثر تھا کہ اصول، تفسیر، فقہ، فرائض، حدیث منطق، معانی، لغت، بیان، بدائع، فلسفہ، جدل، کلام، ادب، نحو، تصوف اور اسرار و حکم دین وغیرہ جملہ علوم میں آپ کو کامل مہارت اور پوری پوری دسترس حاصل ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے جو علم خاص آپ کو عطا فرمایا تھا وہ قرانی معارف اور اسرار شریعت کا علم تھا اور یہی علم آن کے لیے باعث عزت و شرف ہے۔ دنیا میں صرف چند ہستیاں ایسی ہوئی ہیں جنہیں جملہ علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہونے کا شرف حاصل ہوا ہو۔ یہ سعادت علمی دنیا میں امام ابن تیمیہ اور آن کے شاگرد رشید حافظ ابن القیم یا اخیر زمانہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی کو نصیب ہوئی۔

امام ابن تیمیہ کی صحبت و اثر

حافظ ابن القیم کو اپنے شیخ و استاد امام ابن تیمیہ کے ساتھ بے پناہ عقیدت و محبت تھی۔ ۷۱۲ھ میں جب ابن تیمیہ مصر سے مراجعت فرما کر دمشق میں مقیم ہوئے آپ آن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ۷۲۸ھ تک جبکہ ابن تیمیہ نے وفات پائی آپ متواتر آن کی خدمت میں رہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی آن سے جدا نہیں ہوئے اور نہ آن کی مفارقت گوارا کی[۱]۔ اس طویل صحبت کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام ابن تیمیہ کا رنگ آپ پر غالب آ گیا اور دیگر اساتذہ کا اثر محو ہو گیا۔ آپ اپنے استاد شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کے صحیح جانشین اور آن کے علوم کے صحیح طور پر حامل تھے۔ اپنی جملہ تصانیف میں اپنے شیخ امام ابن تیمیہ کے اقوال کی ہی تائید کرتے[۲] ہیں اور آن کا نام نہایت احترام کے

---

(۱) الدرر الکامنہ ۳ : ۴۰۱، البدایہ و النہایہ ۱۴ : ۲۳۴۔

(۲) الدرر الکامنہ ۳ : ۴۰۱، Encylopaedia of Islam V II p 392

ساتھ شیخ الاسلام کے لقب سے لیتے ھیں ۔ امام ابن تیمیہ کی وفات کے بعد اُن کی کتابوں کی تہذیب و تبویب اور نشر اشاعت آپ ھی کی بدولت ھوئی ۔[1]

ابتلاء و محن

قاضی تقی الدین سبکی مسئلہ زیارہ قبور و طلاق کی وجہ سے امام ابن تیمیہ کے نامور مخالفین میں سے تھے ۔ ان دونوں مسائل میں امام ابن تیمیہ کی رائے جمہور علماء سے مختلف تھی ۔ علمائے وقت نے ان مسائل کی بنا پر کئی دفعہ ان کے خلاف فتنے کھڑے کیے اور کئی دفعہ انھیں قید خانوں میں محبوس ھونا پڑا ۔ سب سے آخری بار ۷۲۶ھ میں امام ابن تیمیہ کو دمشق کے قلعہ میں قید کر دیا گیا ۔ اس قید میں حافظ ابن القیم اور کچھ اور شاگرد بھی امام صاحب کے همراہ تھے ۔ حافظ ابن القیم چونکہ امام موصوف کے خاص الخاص شاگرد تھے اس لیے انھیں خاص طور پر نشانہ ستم بنایا گیا ۔ آپ کو دروں کے ساتھ پیٹا گیا اور اس کے بعد اونٹ پر سوار کرکے سارے شہر میں مشتہر کیا گیا ۔ بعد ازاں قلعہ دمشق میں ھی شیخ سے علیحدہ قید کر دیا گیا ۔[2] آپ نے قید و بند کی معیاد قرآن پاک کے تدبر و تفکر میں گذاری ۔ اسی قید خانہ میں اھل معارف کے علوم و حقائق اور دیگر غیبی نعماں کے دروازے آپ پر کھل گئے اور صحیح وجدان اور ذوق سلیم کی دولت آپ کو عطا ھوئی ۔[3] آپ قرآن مجید کو بار بار پڑھتے اور آیات قرآنی پر بار بار غور کرتے تھے ۔ ان کا اپنا بیان ھے کہ مجھے قید کرنے والوں پر خدا رحم

---

(۱) الدرر الکامنہ ۳ : ۴۰۱ ' البدر الطالع ۲ : ۱۵۲ ' طبقات الحنابلہ (مخطوطہ)
- Arabic Literature by Huart 336.

(۲) الدرر الکامنہ ۳ : ۴۰۱ ' البدر الطالع ۲ : ۱۴۳ ۔

(۳) جلاء العینین ۲۰ ' شذرات الذھب ۶ : ۱۶۸ ' ۱۶۹ ' طبقات الحنابلہ ۔

کرے اگر میں ماہر ہوتا تو قرآن کو اس قدر نہ سمجھ سکتا۔[1]

امام ابن تیمیہ کی وفات کے بعد آپ کو اس قید سے رہائی نصیب ہوئی۔ لیکن شیخ کی وفات کے بعد بھی آپ پوری شدت کے ساتھ اُن کے مسلک پر ڈٹے رہے۔ آپ کی یہ خاص خوبی تھی کہ جب ایک دفعہ کتاب و سنت کے دلائل سے کسی مسئلہ میں رائے قائم کر لیتے تو پھر نہایت جرأت اور دلیری سے اُسے ظاہر کرتے اور کوئی ڈر یا خوف اُنہیں اظہار حق سے باز نہ رکھ سکتا۔ چنانچہ مسلک ابن تیمیہ کی تائید و حمایت میں آپ کو دوبارہ پہلے ایسے حالات سے دو چار ہونا پڑا اور پہلی سی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں۔[2]

تدریس و افتاء اور دعوت و ارشاد

جملہ مذاہب کے فقہاء آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور حل مشکلات کرتے۔ جس فن یا علم کے متعلق آپ سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو آپ اس قدر بسیط تقریر فرماتے کہ سننے والے کو گمان ہوتا کہ آپ سوائے اس فن کے اور کسی میں مہارت نہیں رکھتے۔ آپ کے شاگرد ابن رجب[3] فرماتے ہیں کہ میں آپ کی موت سے قبل ایک سال سے زیادہ آپ کی صحبت بابرکت میں رہا۔ آپ کی تصانیف میں سے القصیدۃ النونیہ ایک سال میں میں نے سنا اور دوسری تصانیف سے بھی بہرہ مند ہوا۔ طالبان علم کی ایک کثیر تعداد نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ یہ سلسلہ امام ابن تیمیہ کی زندگی سے ہی جاری تھا۔ اس دور کے جلیل القدر علماء مثلاً ابن عبد الہادی وغیرہ آپ کی بہت تعظیم و تکریم

---

(۱) جلاء العینین ۲۰۔

(۲) الدرر الکامنہ ۳ : ۴۰۱ ' البدر الطالع ۲ : ۱۴۳۔

(۳) طبقات الحنابلہ

کرتے تھے اور مشکل مسائل میں اُن کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ قاضی برھان الدین[1] الزُرعی آپ کی تعریف میں فرماتے ھیں۔ "ماتحت ادیم السماء اوسع علما منه" آپ عرصه درازتک مدرسه الصدریه[2] میں اُستاد کی اور مدرسه الجوزیه میں امام کی خدمات سر انجام دیتے رھے۔[3]

آپ کے مشہور شاگردوں کے اسماء درج ذیل ھیں۔

(۱) الحافظ زین الدین ابوالفرج عبدالرحمان صاحب طبقات الحنابله

(۲) حافظ ابن کثیر صاحب البدایه و النهایه۔

(۳) شمس الدین محمد بن عبدالقادر النابلسی صاحب مختصر طبقات الحنابله لابی یعلی۔

(۴) آپ کے فرزند عبداللہ جو آپ کی وفات کے بعد صدریه میں آپ کے جا نشین بنے۔

(۵) آپ کے دوسرے فرزند الحافظ ابراھیم۔

مناقب و فضائل

آپ حد درجه کے عابد و متقی تھے۔ دن رات درس و تدریس، ذکر، تلاوت قران اور تہجد میں گذارتے۔ تواضع، انکسار، حسن خلق اور شفقت علی الخلق میں آپ کو بہرہ وافر ملا ھوا تھا۔ کسی سے حسد اور کینه نہیں رکھتے تھے۔ نماز میں اُن کو خاص لطف آتا تھا۔ رکوع و سجود بہت دراز کیا کرتے تھے۔ حافظ ابن کثیر اپنی کتاب البدایة و النهایة میں لکھتے ھیں۔

---

(۱) طبقات الحنابله۔

(۲) مدرسه کانت بدرب یقال لها درب الریحان و قد محیت اثارها و صارت دوراً (روضه المحبین ص ف، ص) و اقفها صدر الدین اسعد بن المنجاه بن برکات بن مئومل التنوخی المعری الدمشقی الحنبلی (البدایه و النهایه ۱۳ : ۲۱۶۔

(۳) شذرات الذھب ۶ : ۱۶۹، جلاء العینین ۲۰۔

و کم من اصحب الناس لہ واحب الناس الیہ ولا اعرف فی ھذا العالم فی زماننا اکثر عبادہ منہ ، و کانت لہ طریقہ فی الصلوٰۃ یطیلھا جدا ویمد رکوعھا و سجودھا ، ویلومہ کثیر من اصحابہ فی بعض الاحیان ، فلا یرجع ولا یبرع عن ذلک رحمہ اللہ ۔[1]

صبح کی نماز طویل قرأت سے پڑھتے اور پھر اپنی جگہ بیٹھ کر وظائف مسنونہ اور اوراد ماثورہ سے یہاں تک شغل رکھتے کہ چاشت کا وقت قریب آ جاتا فرماتے : ھذہ غدوتی لولم اتغدھا سقطت قوایای ۔[2] آپ نے بارھا حج کیے ۔ ایک دفعہ برابر ایک سال تک خانہ کعبہ کی مجاورت کی ۔ مکہ والے اپ کی شدت عبادت اور کثرت طواف دیکھ کر حیران ہوا کرتے تھے ۔[3] کتابوں کے جمع کرنے کا آپ کو بہت عشق تھا ۔ ادب ، حدیث ، فقہ ، کلام اور تصوف وغیرہ سے یکساں شغف تھا ۔ ان علوم کی کتابیں ہمیشہ آپ کے مطالعہ میں رہتی تھیں ۔ کتابیں جمع کرنے کے ایسے اسباب و مواقع آپ کو میسر آئے جو دیگر فضلاء کو بہت کم نصیب ہوئے ہیں ۔[4] آپ کا خط نہایت عمدہ تھا اور اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابوں کا ایک خاصہ ذخیرہ بھی آپ کے پاس موجود تھا ۔[5] آپ کی وفات کے بعد آپ کی اولاد ایک طویل مدت تک ان کتابوں میں سے اپنی ضرورت سے زائد کتابوں کو فروخت کرکے بسر اوقات کرتی

---

(۱) البدایہ والنھایہ ۱۴ : ۲۳۴ ، ۲۳۵

(۲) الدرر الکامنہ ۳ : ۴۰۱ ۔
الدر الطالع ۲ : ۱۴۴ ۔
جلاء العینین ۲۰ ۔

(۳) جلاء العینین ۲۰ ۔

(۴) شذرات الذھب ۶ : ۱۶۹ ، الدر الطالع ۲ : ۱۴۴ ۔

(۵) شذرات الذھب ۶ : ۱۶۹ ، الدر الطالع ۲ : ۱۴۴ ۔

رهی ۔[1]

حافظ ابن القیم اپنی مذھبی شدت کے باوجود نہایت منکسر المزاج اور متواضع تھے ۔[2] ہر ایک کے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آتے ۔ علمی و مذھبی اختلافات کے اظہار میں متانت اور سنجیدگی سے کام لیتے تھے ۔ لہجہ کی شدت کی بجائے دلائل کی قوت استعمال کرتے ۔ اسی لیے بڑے بڑے لوگ حافظ ممدوح کی تعظیم کرتے تھے اور خاص و عام ان سے محبت کرتے تھے ۔ ان کی تقریر نہایت مرتب و مربوط اور حشف و زوائد سے پاک ھوا کرتی تھی ۔ ایک ایک مسئلہ کے لیے کئی کئی دلائل پیش کیا کرتے تھے ۔ یہاں تک کہ مخالفین ان کے زور بیان کے سامنے مبہوت رہ جاتے ۔[3]

امام ابن القیم کے بارے میں جلیل القدر علماء کی رائے

حافظ ابن کثیر اپنی کتاب البدایہ و النہایہ میں لکھتے ھیں ۔[4]

و کان حسن القراءۃ و الخلق ، کثیر التودد ، لایحسد احداً ، و لا یؤذیه ، و یحقد علی احد ۔

ملا علی قاری حنفی امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم کے بارے میں فرماتے ھیں :

و من طالع شرح منازل السائرین تبین له انهما کانا من اکابر اهل السنۃ و الجماعۃ و من اولیاء هذه الامۃ ، و هما بریئان مما رما هما اعداؤ هما من التشبیه و التمثیل ۔[5]

---

(۱) البدر الطالع ۲ : ۱۴۴ ، الدرر الکامنه ۳ : ۴۰۲ ۔
(۲) ابن تیمیه حیاته و عصره ص ۵۲۷ ۔
(۳) معارف ۱۹۳۵ ۔
(۴) البدایه و النهایه ۱۴ : ۲۳۷ ۔
(۵) جلاء العینین ۲۵۷ ۔

قاضی برهان الدین الزرعی فرماتے ہیں :

ماتحت اديم السماء اوسع علماً منه ، و درس بالصدرية و ام بالجوزية مده طويله و كتب بخطه مالا يوصف كثرة ۔[1]

ابن حجر العسقلانی ابن القیم کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں :

كان جرى الجنان، واسع العلم ، عارفاً بالخلاف و مذاهب السلف ، غلب عليه حب ابن تيمية حتى كان لا يخرج عن شيئ من اقواله، بل ينتصرله فى جميع ذلك ، و قد هذب كتبه ۔[2]

ابن حجر العسقلانی نے ایک مرتبہ یوں بھی فرمایا :

و لولم يكن للشيخ تقى الدين من المناقب الا تلميذه الشيخ شمس الدين ابن قيم الجوزيه صاحب التصانيف النافعة السائرة التى انتفع بها الموافق و المخالف لكان غاية فى الدلالة على عظمة منزلته ۔[3]

ابن رجب الحنبلی لکھتے ہیں :

شيخنا الامام العلامة لم اشاهد مثله فى العباده ولا رايت اوسع علماً منه ولا اعرف بمعانى القران و السنة و حقائق الايمان منه ۔[4]

حافظ ابن ناصر الدین الشافعی فرماتے ہیں :

الشيخ العلامة شمس الدين ، احد المحققين ، علم المصنفين ، نادره المفسرين له تصانيف الانيقه و التاليف التى فى علوم الشريعه والحقيقه ۔[5]

---

(۱) طبقات الحنابله (مخطوطه) ۔
(۲) الدرر الكامنه ۳ : ۴۰۱ ' ۴۰۲ ' ۴۰۳ ۔
(۳) الرد الوافر ۳۶ ۔
(۴) طبقات الحنابله (مخطوطه) ۔
(۵) مقدمه روضه المحبين ص ر ۔

حافظ سیوطی تحریر کرتے ھیں :

و صار من الائمہ الکبار فی التفسیر و الحدیث و الفروع والا صلین وا العربیہ ۔[1]

قاضی القضاہ عبدالرحمان الحسنی فرماتے ھیں :

تلمیذہ ابن قیم الجوزیہ الذی سارت تصانیفہ فی الافاق و لو لم یکن لہ من آثارہ الا ماتصف بہ تلمیذہ ابن قیم الجوزیہ من العلم لکفی ۔[2]

نواب صدیق حسن خان لکھتے ھیں :

الحبر العظیم الشان، الرفیع المکان ۔[3]

امام ابن القیم کا مذھبی مسلک

جیسا کہ ابن القیم کی کتاب اعلام الموقعین سے ظاھر ھے وہ تقلید شخصی کے سخت خلاف تھے ۔ بہر حال مسائل میں آپ کا میلان اپنے شیخ کی طرح امام احمد ابن حنبل کی طرف تھا ۔ اصول و عقاید میں آپ ضرور حنبلی المذھب تھے لیکن فروع میں آزاد تھے ۔ عبدالحی ابن العماد اپنی کتاب شذرات الذھب میں آپ کو المجتھد المطلق قرار دیتے ھیں[4] ۔ اجتھاد کی جملہ شرائط آپ کی ذات میں پوری تھیں ۔ اس لیے آپ کو کسی امام کی تقلید کی ضرورت بھی نہ تھی ۔ لیکن باین ھمہ آپ نے شیخ امام ابن تیمیہ سے کسی مسئلہ میں اختلاف نہیں کیا ۔ بلکہ اپنی ساری عمر ابن تیمیہ کے مسلک کی تائید و حمایت میں صرف کی ۔

---

(۱) بغیہ الوعاۃ ۔
(۲) مقدمہ روضہ المحبین ص ر ۔
(۳) ابجد العلوم ۔
(۴) شذرات الذھب ٦ : ١٦٨ ۔

آپ کے ملفوظات

(۱) آپ کے کلمات طیبات میں سے ہے "بالصبر و الفقر تنال الامامة فی الدین" -

نیز آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے "لا بد لسالك من همة يسيرة برقيه و علم يبصره و يهديه -"[1]

(۲) آپ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے :

(۱) انا المكدی و ابن المكدی
هكذا كان ابی و جدی[2]

(۲) عوی الذئب فاستانست بالذئب از عوی
و صوت انسان فكدت اطیرا[3]

(۳) و اخرج من بين البيوت لعلی
احدث عنك فی السر خالیا[4]

وفات

یہ نابغہ روزگار اور عجوبة الدهر ہستی اپنی عمر کی ساتھ منزلیں گزارنے کے بعد جمعرات ۱۳ رجب المرجب ۱۵۷ھ عشاء کی اذان کے وقت اس دار فانی سے عالم جاو دانی کی طرف رحلت فرما ہوئی۔ آئندہ روز بعد نماز ظہر جامعہ جراح* میں نماز جنازہ پڑھی گئی[5]۔ آپ کی نماز

---

(۱) الدرر الکامنہ ۳ : ۱۰۴، الدر الطالع ۲ : ۱۴۴ -
(۲) الرد الوافر ۳۶ -
(۳) الرد الوافر ۳۶ -
(۴) الرد الوافر ۳۶ -
(۵) البدایہ و النهایہ ۱۴ : ۲۳۴، طبقات الحنابلہ (مخطوطہ) -
* خارج الباب الصغیر و هو معروف الی الیوم و كان من قبل مسجداً للجنائز (روضہ المحبین ص ف)

جنازہ کے وقت خلقت کا ایک جم غفیر جمع تھا ۔ وقت کے قاضی ، رؤساء صالحین اور عوام کا لا تعداد ھجوم آپ کی نعش مبارک کو اٹھانے اور اس سے تبرک حاصل کرنے کے لیے مسابقت کرتا تھا[1] ۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ھیں " و قد کانت[2] جنازته حافلة " ۔ آپ کو اپنے والد ابوبکر بن ایوب کے پاس ھی باب الصغیر[3] کے مقبرہ میں سپرد خاک کیا گیا ۔ آپ کی علو مرتبت کے بارے میں بہت سے خواب دیکھے گئے ۔ وفات سے کچھ پہلے حافظ ممدوح نے امام ابن تیمیہ کو خواب میں دیکھا اور ان سے اپنے مرتبہ کے بارے میں سوال کیا ۔ علامہ ابن تیمیہ نے بعض اکابر کا نام لے کر کہا " تمہارا درجہ یہاں ان سب سے بڑا ھوا ھے قریب تھا کہ تم ھمارے ساتھ آ ملتے ۔ لیکن اب تم ابن خزیمہ کے طبقے میں ھو ۔ "[4]

ابن حجر العسقلانی اپنی کتاب الدرر الکامنة میں حافظ ابن القیم کا ترجمہ دینے کے بعد اُن کی چند ابیات بھی نقل کرتے ھیں جو اُن کے انکسار ، تواضع اور حسن خلق پر دلالت کرتی ھیں ۔ ان میں سے چند اشعار درج ذیل ھیں ۔

بنی ابی بکر کثیر ذنوبه	فلیس علی من نال من عرضه اثم
بنی ابی بکر غدا متصدرا	تعلم علما و هو لیس له علم
بنی ابی بکر جهول بنفسه	جهول بامر الله انی له العلم
بنی ابی بکر یروم ترقیا	الی جنة الماوی و لیس له عزم
بنی ابی بکر لقد خاب سعیه	اذا لم یکن فی الصالحات له سهم
بنی ابی بکر کما قال ربه	هلوع کنود وصفه الجهل و الظلم

---

(۱) البدایه و النهایه ۱۴ : ۲۳۴ ، طبقات الحنابله ۔
(۲) البدایه و النهایه ۱۴ : ۲۳۴ ، طبقات الحنابله ۔
(۳) البدایة و النهایه ۱۴ : ۲۳۴ ۔
(۴) الدرر الکامنه ۳ : ۴۰۳ ، البدر الطالع ۲ : ۱۴۵ ۔

بی ابی بکر و امثالہ غدت بفتواھم ھذہ الخلیقۃ دائم

ولیس لہ فی العلم باع ولا التقی ولا الزھد والدنیا لدیھم ھی الھم

اولاد

کتب رجال میں امام ابن القیم کے دو صاحبزادوں کے اسماء مذکور ھیں۔ (۱) جمال الدین عبداللہ بن شمس الدین محمد بن ابی بکر۔ (۲) برھان الدین ابراھیم بن شمس الدین محمد بن ابی بکر۔

جمال الدین عبداللہ بن محمد ۷۲۳ھ میں پیدا ھوئے۔[1] اپنے والد اور دیگر فضلاء سے تکمیل کی۔ ذکاوت و فطانت کا یہ عالم تھا کہ سورہ اعراف دو دن ھی میں حفظ کر لی۔[2] آپ نے تمام علوم متداولہ میں مہارت حاصل کی اور والد کی وفات کے بعد مدرسہ صدریہ میں ان کی جگہ مسند تدریس و ارشاد پر بیٹھے اور تازیست نہایت احسن طریقہ سے علمی خدمت سر انجام دی۔[3] آپ شرف الدین عبداللہ کے نام سے بھی مشہور تھے۔ بادی النظر میں تو یوں معلوم ھوتا ھے کہ یہ دو مختلف شخصیتوں کے نام ھیں۔ مگر حقیقت میں آپ ھی ان دو ناموں سے مشہور ھوئے۔ حافظ ابن حجر نے الدرر الکامنۃ میں اس امر کی تصریح کی ھے۔[4] ۱۴ شعبان کو اتوار کے روز ۷۵۶ھ میں وفات پائی۔[5] حافظ ابن کثیر نے بیان کیا ھے کہ امام ابن القیم کی طرح آپ کا جنازہ بھی ایک بہت بڑے جلوس[6] کی مانند تھا۔ اپنے والد کے پاس ھی باب الصغیر کے قبرستان میں مدفون

---

(۱) الدرر الکامنہ ۲ : ۲۹۰، ابجد العلوم ۸۶۲۔
(۲) ابجد العلوم ۸۶۲۔
(۳) البدایہ و النھایہ ۱۴ : ۲۳۵۔
(۴) الدرر الکامنہ ۲ : ۲۹۰۔
(۵) شذرات الذھب ۶ : ۱۸۰۔
(۶) البدایۃ و النھایہ ۱۴ : ۲۵۳۔

ہوئے۔

برہان الدین ابراہیم بن محمد ۷۱۶ھ میں پیدا[1] ہوئے۔ ابن شحنہ، ایوب الکحال اور دیگر علماء سے تعلیم حاصل کی۔ فقہ اور حدیث خاص اپنے والد سے سیکھی۔ صدریہ اور تدمیریہ وغیرہ مدراس میں مدرسی کے فرائض سر انجام دئے۔ اور الفیہ ابن مالک کی شرح بنام ارشاد السالک الی حل الفیہ ابن مالک لکھی۔ ۷۶۷ھ میں جمعہ کے روز ماہ رجب کی آخری تاریخ کو ۴۸ برس کی عمر میں وفات پائی۔ جامعہ جراح اور مدرسہ صدریہ میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور باب الصغیر کے مقبرہ میں سپرد خاک کیا گیا۔[2]

حافظ ابن القیم کے ایک بھائی زین الدین ابوالفرج عبدالرحمان بن ابی بکر بن ایوب بن سعد کے حالات بھی کتب رجال میں ملتے ہیں۔ انہوں نے ابن عبدالدائم اور عیسی المطعم وغیرہ مشائخ سے تعلیم حاصل کی۔ علم و فضل کے اعتبار سے امام وقت تھے۔ ابن رجب صاحب ذیل طبقات الحنابلہ حافظ ابن القیم کی طرح ان کے بھی شاگرد تھے۔ ۷۶۹ھ میں اتوار کی رات کو ۱۸ ذی الحجہ کو وفات پائی۔[3] دوسرے دن صبح کے وقت جامعہ دمشق میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور باب الصغیر کے مقبرہ میں مدفون ہوئے۔[4]

تصانیف امام ابن القیم

امام ابن القیم نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ آن کی اکثر و بیشتر مصنفات دستبرد زمانہ کی بدولت نابود و نادر الوجود ہو چکی ہیں

---

(۱) الدرر الکامنہ ۱ : ۵۸ ' ابجد العلوم ۸۲۸۔
(۲) شذرات الذہب ۶ : ۲۰۸۔
(۳) شذرات الذہب ۶ : ۲۱۶۔
(۴) شذرات الذہب ۶ : ۲۱۶۔

اور اُن کا بہت قلیل حصہ ہم تک پہنچا ہے۔

ابن القیم تصنیف و تالیف کے لحاظ سے اپنے شیخ و استاد امام ابن تیمیہ پر بازی لے گئے۔ رصانت اسلوب، الفاظ و معانی، دلائل کی منطقی ترتیب اور سلاست تعبیر میں آپ کی کتابیں امام ابن تیمیہ کی مصنفات پر بلا شبہ فائق ہیں۔ محمد حامد الفقی التبیان فی اقسام القرآن کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

غیر ان التلمیذ المفلح برز علی شیخہ فی ناحیۃ التالیف و الکتابۃ، فان لہ فیھا من رصانۃ الاسلوب و تھذیب القول و انتقاء الالفاظ و المعانی و ترتیب الحجج و تنقیح المقدمات و سلاسۃ التعبیر غیر ما فی کتب شیخہ، ذلک بان ابن القیم کان یکتب و ھو مطمئن البال، ھادی الفکر، فی وسط مکتبتہ و علی اریکتہ ولکن شیخہ کان اکثر تالیفہ املاء من السجون او خطباً فی وسط عواصف الفتن و بین غارات الخصومۃ ولا یمکن ان یکون خطیب الثورۃ الا کذلک و لا بد ان یکون اثار الثورۃ و ما یکتب فی حینھا الا کذلک و لکنک تراہ حین یاخذ قلمہ و یستجم فکرہ و یجلس الی منضدتہ و یکتب مطمئناً ھادئا یمنح من التالیف نتاجا تخر لہ جبابرۃ العقول سجدا ـــــ و کان کل وقت الشیخ فی نزال و خصام و حرب و طعان و لم یترک لہ خصومہ من الوقت ما یکفی لوضع التالیف الھادیۃ المطمئنۃ الا نزرا یسیرا، اختلسہ اختلاساً۔[1]

محمد ابو زھرہ ابن القیم کی مصنفات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بل کانت کتابتہ فی ھدوء و اطمینان و لذلک جاءت ھادئۃ، و ان کان عمیقۃ الفکرۃ، قویۃ المنحی، سدید المنزع، و کانت حسنۃ

---

(۱) مقدمۃ البیان فی اقسام القرآن ص، ص۔

الترتیب ، متساوقۃ الافکار ، طلیۃ العبارۃ لانہ کتبہ فی اطمینان و کانت کتابتہ مع کل ھذا فیھا نور السلف و کلمۃ السابقین فھو کثیر الا ستشھاد با قوال السلف من الصحابۃ و التابعین۔

آپ کی مصنفات کی امتیازی شان

عام طور پر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ جس مصنف کی تصانیف زیادہ ہوں۔ اس میں تحقیق و تدقیق کا پہلو نہیں ہوتا۔ مگر حافظ ابن القیم کی مصنفات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کمیت کے ساتھ ساتھ ان میں کیفیت کی بھی کمی نہیں۔ اس زمانہ کے علوم متداولہ میں سے اکثر پر ان کی کوئی نہ کوئی تصنیف موجود ہے۔ ایک ایک کتاب کئی کئی جلدوں میں ہے۔ اور جو کچھ لکھا ہے پورے دلائل کے ساتھ لکھا ہے۔ قرآن پاک کی آیات میں تدبر ، احادیث و روایات پر کامل عبور ، دلائل کی منطقی ترتیب، زور بیان اور زبان میں ادبیت کی چاشنی ان کی تصنیفات کی خصوصیت ہے۔

علم حدیث اور علم لغت کے متعلق ایسے ایسے دقائق بیان کرتے ہیں جو مطولات میں نہیں ملتے۔ مختصر عبارت میں طویل مطالب اور اس کے ضمن میں کئی دیگر فوائد جو ایک صاحب ذوق کو فریفتہ کر دیں آپ کی خاص خوبی ہے۔

آپ کے نظریات اور تصورات براہ راست کتاب و سنت کی مئے صافی سے کشید کیئے ہوئے ہیں اور ان میں عربیت کا صحیح ذوق رچا ہوا ہے۔

آپ کی جملہ تصنیفات فی الحقیقت تفقہ فی الدین کا خزانہ ہیں۔ جن کو اس خزانہ کی چابی ہاتھ آ گئی وہ دولت علم سے مالا مال ہو گئے۔ اپنی تصنیفات میں اطلاقات کتاب و سنت ، انوار مشکوۃ نبوت ، افکار و تصورات صحابہ کرام اور ائمہ تابعین کا جہاں کہیں علوم موضوعہ

اور فنون مخترعہ سے تصادم ہوا وہاں پر ہر جگہ کتاب و سنت کی حمایت میں ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کتاب و سنت کے پرچم کو سرنگوں نہ ہونے دیا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا دینی ذوق ، دینی بصیرت اور دین میں ڈوبا اور سمویا ہوا ذہن عطا فرمایا تھا کہ فلسفہ یونان اور عقل و رائے کے نئے انداز و اسلوب ، جدید معانی و معارف اور ادبی و فنی قوائد کتاب و سنت کے مقابلے میں قطعاً اثر انداز نہ ہو سکے ۔ بلکہ آپ نے علوم و فنون کو کتاب و سنت کی تصریحات کے ساتھ ہم آہنگ کیا ۔ اور اپنی تصنیفات میں آپ نے الٰہیات کی طرف رخ کیا تو ابتدا سے لے کر اپنے زمانہ تک کی جملہ بدعات کلامیہ کا رد کیا ۔ معتزلیوں، حشویوں، جہمیوں کی گمراہیوں کو پوری طرح واضح کیا اور اسلام کو سلف کے عقائد اور اصل سادگی کی طرف لوٹانے کی سعی بلیغ فرمائی ۔ اگر آپ نے فقہی علوم کی طرف توجہ کی تو اہل علم طبقہ کو کتاب و سنت کے ایمان افروز سر چشموں سے براہ راست سیراب ہونے کی تلقین کی اور اس جامد اطاعت و پیروی کی مذمت کی کہ صرف اشخاص و رجال پر اعتماد تک محدود ہو ۔

تصانیف کے اسماء اور ان کی تعداد

حافظ ابن القیم کی تصانیف کی ایک طویل فہرست عبدالحی بن العماد الحنبلی المتوفی ۱۰۸۹ھ نے اپنی کتاب شذرات الذہب فی اخبار من ذہب جلد ششم صفحہ ۱۷۰ پر دی ہے جس میں مذکورہ کتابوں کی تعداد ۴۷ ہے اور اس کے بعد وغیر ذلک لکھ دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ اور بھی تصانیف ہیں جو یا تو دستبرد زمانہ کے باعث تباہ ہو گئیں یا قلمی نسخوں کی صورت میں کہیں موجود ہیں ۔ بروکلمن[1]

نے اپنی تاریخ ادبیات عربی تتمہ II میں ابن القیم کی ۵۲ کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اغاثۃ اللھفان من مصائد الشیطان صفحہ ۲۳ پر آپ کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کی ایک نسبتاً مفصل فہرست درج ہے جس کا بیشتر حصہ طبقات الحنابلہ سے ماخوذ ہے۔ ذیل میں اس فہرست میں مذکور کتابوں کے اسماء اور مطبوعہ تصانیف کے مطابع درج ہیں۔

(۱) اجتماع الجیوش الاسلامیہ علی غزو الفرقہ الجہمیہ (ہندوستان امرتسر) میں ۱۳۱۴ھ میں اور مصر میں ۱۳۵۰ھ میں طبع ہوئی۔

(۲) اخبار النساء طبع ہو چکی ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ یہ ابن القیم کی تصنیف نہیں۔

(۳) اعلام الموقعین عن رب العالمین۔ ہندوستان (دہلی میں ۱۳۱۳ھ میں) اور مصر میں ۱۳۲۵ھ میں طبع ہوئی۔ اس کا ایک اور ایڈیشن بھی شائع ہو چکا ہے جس پر تاریخ مذکور نہیں۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ "دین محمدی" کے نام سے دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔

(۴) اغاثۃ اللھفان فی حکم طلاق الغضبان۔ مکتبہ المنار مصر نے ۱۳۲۲ میں اسے زیور طبع سے آراستہ کیا۔

(۵) اغاثۃ اللھفان من مصائد الشیطان۔ مصر میں پہلی مرتبہ ۱۳۲۲ھ میں پھر ۱۳۵۷ھ میں طبع ہوئی۔

(۶) امثال القرآن۔

(۷) بدائع الفوائد۔ مصر میں مکتبہ المنیریہ کے زیر اہتمام طبع ہوئی۔

(۸) بطلان الکیمیاء من اربعین وجہاً۔

(۹) بیان الدلیل علی استغناء المسابقۃ عن التحلیل۔

---

(۱) Geschiche der Arabischen Litterature Supplement II, p. 126—128

(۱۰) التبیان فی اقسام القرآن ۔ مکہ مکرمہ میں ۱۳۲۱ھ میں اور مصر میں مکتبہ التجاریہ کے زیر اہتمام ۱۳۵۲ میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی ۔

(۱۱) التحریر فی مایحل و یحرم من لباس الحریر ۔

(۱۲) التحفہ المکیہ ۔

(۱۳) تحفہ الودود فی احکام المولود ۔ لاہور پاکستان میں ۱۳۳۹ھ میں طبع ہوئی ۔

(۱۴) تفسیر الفاتحہ ۔

(۱۵) تفسیر المعوذتین ۔ بدائع الفائد کے ساتھ چھپی اس کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے ۔

(۱۶) تفضیل مکہ علی المدینہ ۔

(۱۷) تہذیب مختصر سنن ابی داؤد و ایضاح مشکلاتہ ، والکلام علی ما فیہ ۔ مدینہ منورہ میں اس کا ایک مخطوطہ موجود ہے جس کی ایک نقل محمد حامد الفقی رئیس جماعہ انصار السنۃ المحمدیہ مصر کے پاس بھی تھی ۔

(۱۸) جلاء الافہام فی ذکر الصلاہ والسلام علی خیر الانام و بیان احادیثہا المعلولہ ۔ ہندوستان اور مصر (مکتبہ المنیریہ) میں طبع ہو چکی ہے ۔

(۱۹) جواب عابدی الصلبان ان ما ہم علیہ دین الشیطان ۔

(۲۰) الجواب الکافی لمن سأل عن الدواء الشافی ۔ یہ کتاب الداء والدواء کے نام سے بھی موسوم ہے مصر میں دو مرتبہ اور ہندوستان (آرہ) میں ایک مرتبہ چھپ چکی ہے ۔

(۲۱) حادی الارواح الی بلاد الافراح ۔ اعلام الموقعین کے حاشیہ پر

اور علیحدہ چھپ چکی ہے ۔ صاحب کشف الظنون کے بیان کے مطابق ابن القیم کے ایک شاگرد نے اس کتاب کا احتصار '' الداعی الی اشرف المساعی '' کے نام سے کیا تھا ۔

(۲۲) حرمۃ السماع ۔

(۲۳) حکم اعام ھلال رمضان ۔

(۲۴) حکم تارک الصلاۃ ۔ طبع ھو چکی ہے ۔

(۲۵) الرسالہ الجلیہ فی الطریقہ المحمدیۃ ۔ (نظم) ۔

(۲۶) رفع التزیل ۔

(۲۷) رفع الیدین فی الصلاہ ۔

(۲۸) الروح ۔ ہندوستان (حیدر آباد دکن) میں ۱۳۱۸ھ اور ۱۳۲۴ھ میں طبع ھوئی ۔ برھان الدین البقاعی نے اس کا اختصار سرالروح کے نام سے کیا جو مصر میں ۱۳۲۶ھ میں چھپا ۔

(۲۹) روضۃ المحبین و نزھۃ المشتاقین ۔ احمد عبید آفندی نے دمشق سے اسے طبع کیا ۔

(۳۰) راد المسافرین الی منازل السعداء فی ھدی خاتم الانبیاء ۔

(۳۱) زاد المعاد فی ھدی خیر العباد ۔ ہندوستان (کانپور) میں ۱۲۹۸ھ میں اور مصر میں ۱۳۲۴ء اور ۱۳۴۷ھ میں طبع ھوئی ۔

(۳۲) سرح الاسماء الحسنی ۔

(۳۳) شرح اسماء الکتاب العزیز ۔

(۳۴) السنۃ و البدعۃ ۔

(۳۵) شفاء العلیل فی القضاء والقدر و الحکمۃ و التعلیل - مصر میں ۱۳۲۳ھ میں طبع ھوئی ۔

(۳۶) الصبر والسکن ۔

(۳۷) الصراط المستقیم فی احکام اهل الجهیم -

(۳۸) الصواعق المرسلة علی الجهمیه والمعطلة طبع هو چکی هے -

(۳۹) الطاعون -

(۴۰) طیب القلوب - معلوف نے بیان کیا هے که برلین میں اس کتاب کا ایک مخطوطه موجود هے -

(۴۱) الطرق الحکمیه فی السیاسه الشرعیه - مصر میں ۱۳۱۷ھ میں طبع هوئی - مدینه میں اس کا ایک قدیم مخطوطه موجود هے -

(۴۲) طریق الهجرتین و باب السعادتین - مصر میں طبع هو چکی هے - المکتبه الظاهریه دمشق میں مولف کے هاتھ کا لکھا هوا نسخه موجود هے -

(۴۳) عدة الصابرین و ذخیره الشاکرین - مصر میں ۱۳۴۱ اور ۱۳۴۹ھ میں طبع هوئی -

(۴۴) عقد محکم الاحباء بین الکلم الطیب و العمل الصالح المرفوع الی رب السماء -

(۴۵) الفتح القدسی -

(۴۶) الفرق بین الخلة و المحبة و مناظرة الخلیل لقومه -

(۴۷) فضل العلم -

(۴۸) الفروسیه المحمدیة - دمشق کے مکتبه الظاهریه میں اس کتاب کا ایک مخطوطه موجود هے -

(۴۹) الفوائد - مصر میں ۱۳۴۴ میں طبع هوئی -

(۵۰) الفوائد المشوق الی علوم القران و علم البیان -

(۵۱) الکافیه الشافیه فی الفرقه الناجیة - یه کتاب القصیدة النونیه کے نام سے بھی مشهور هے - هندوستان اور مصر میں طبع هو

چکی ہے ۔ علامہ احمد بن عیسی النجدی نے اس کی شرح لکھی تھی جو چھپ چکی ہے ۔

(۵۲) الکافیہ الشافیۃ فی النحو ۔

(۵۳) الکبائر ۔

(۵۴) الکلم الطیب و العمل الصالح ۔

(۵۵) مدارج السالکین ۔ مصر میں مکتبہ المنار کے زیر اہتمام طبع ہو چکی ہے ۔

(۵۶) المسائل الطرابلسیہ ۔

(۵۷) معانی الادوات و الحروف ۔

(۵۸) مفتاح دارا لسعادہ ۔ مصر میں ۱۳۲۳ھ اور ہندوستان میں ۱۳۲۹ھ میں چھپی ۔

(۵۹) المہدی ۔

(۶۰) المہذب ۔

(۶۱) نقد المنقول و المحک الممیز بین المردود و المقبول ۔

(۶۲) نکاح المحرم ۔

(۶۳) نورالمؤمن وحیاتہ ۔

(۶۴) ہدایہ الحیاری من الیہود والنصاری ، مصر میں ۱۳۲۳ھ میں امین الخانجی نے اسے طبع کروایا۔ الفارق بین المخلوق و الخالق کے ساتھ بھی ۱۳۲۲ھ میں میں مصر میں طبع ہوئی ۔

(۶۵) الوابل الصیب من الکلم الطیب، ہندوستان میں اور مصر میں مکتبہ المنار اور المنیریہ کے زیر اہتمام چھپ چکی ہے ۔

(۶۶) الرسالہ التبوکیہ ، ۱۳۴۹ھ میں مکہ میں چھپی ۔

علی

ملک ذوالفقار حسین

تبصرے

اُردو مثنویاں۔ کرخنداری بولی۔ اُردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ریڈر اُردو، دہلی یونیورسٹی گذشتہ چند برس سے اُردو کے لسانی اور تحقیقی مطالعے میں معروف ہیں۔ ان کی یکے بعد دیگرے تین کتابیں آئی ہیں۔ "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں"، "اُردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو" "Karkhandari Dialect of Delhi Urdu" ان کتابوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اردو کے لیے جس معیار کا تحقیقی کام کچھ مدت سے ہو رہا ہے وہ پاکستان کے اصلا کے لیے قابل رشک ہے۔ ایسے ملک میں جہاں اُردو کا مستقبل ایک بڑی حد تک تاریک ہو چکا ہے اُردو زبان و ادب سے دلچسپی لینے والے روز بروز اس کے علمی سرمایے میں سرعت سے اضافہ کر رہے ہیں لیکن پاکستان میں اُردو ادب میں تحقیقی کام کی وہ رفتار باقی نہیں رہی جس کا آغاز حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع اور ان کے رفقا نے کیا تھا۔ جب کہ یہاں زیادہ تر تحقیق کے نام پر تنقید کا 'کاروبار' چل رہا ہے۔ تنقید کی اہمیت مسلم، لیکن اس کا معیار بھی ہمارے ہاں پچھلے چند برس سے کچھ ایسا قابل فخر نہیں رہا۔ علاوہ ازیں اُردو ادب کی تاریخ کے مختلف پہلو ابھی تک تشنۂ تحقیق ہیں اس لیے جو تنقیدی سرمایہ جمع ہو رہا ہے اس میں غلط مواد کی بنیاد پر اکثر تنقیدی نظریات قائم ہوجاتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضرورت ہے کہ تنقید کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جائے اور تحقیق کی طرف پوری توجہ مبذول ہو۔ قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالعلیم

نامی، ڈاکٹر مختار الدین احمد، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور نثار احمد فاروقی نے ہندوستان میں تحقیق کا جو معیار قائم کر رکھا ہے اس پر ہندوستان کا اردو داں طبقہ بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر نارنگ اگرچہ کم عمر ہیں، لیکن اپنے تحقیقی کام کے معیار میں کسی سے پیچھے نہیں۔

★ ★ ★

کتاب : ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں

مصنف : ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ریڈر اردو دھلی یونیورسٹی

ناشر : مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، دھلی

اشاعت : ۱۹۶۲ء

قیمت : چھ روپے

صفحات : ۳۸۴

اس سے قبل ڈاکٹر گیان چند نے اردو کی نثری داستانوں پر تحقیقی کام پیش کیا تھا۔ وہ بھی عمدہ تھا۔ اب ڈاکٹر نارنگ نے منظوم داستانوں پر یہ تحقیقی کتاب شائع کرکے کام کرنے والوں کو ایک نئی سمت سے آشنا کیا ہے۔ موضوع کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں پورانک قصے ہیں۔ اس ذیل میں نل د من اور شکنتلا کے سلسلۂ مثنویات کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے دوسرا باب قدیم لوک کہانیوں کے بارے میں ہے، جس میں طوطی ناموں، کنور منوہر اور مادھو مالت، کامروپ اور کلا کلام، سنگھاسن بتیسی وغیرہ پر مواد فراہم کیا گیا ہے، تیسرے باب میں نیم تاریخی قصوں کو لیا ہے، مثلاً مثنویات ہیر رانجھا، سسی پنوں، پدماوت، اور اس سلسلے کی

بعض دوسری مثنویوں کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں ' چوتھا باب ہند ایرانی قصوں پر مشتمل ہے جس میں پھول بن ' سحرالبیان ' گل کاؤلی وغیرہ منظوم داستانوں کے ماخذ سے بحث کی گئی ہے۔ ہماری منظوم داستانوں پر یوں بھی ابھی تفصیلی کام نہیں ہوا اور اس سرمایے کی اس طرح دستہ بندی تو دور کی بات تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ہند اور یورپ کے کتاب خانوں کی فہرستوں اور دوسرے ماخذ کی مدد سے ہر داستان کے اصل مصادر اس کے عہد بعہد تغیر و تبدل ' مختلف اشاعتوں اور دوسری زبانوں میں تراجم کا حال بڑی تفصیل ' صحت اور سنین کی پابندی کے ساتھ کیا ہے۔ مختلف ذرائع کو انہوں نے جس جانکدستی اور احتیاط کے ساتھ استعمال کیا ہے اس سے ان کی تحقیقی بصیرت اور ناقدانہ شعور کا پتا چلتا ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ چند ضمیموں پر مشتمل ہے جن میں پہلے حصے کی معلومات کا نئے سرے سے جائزہ لے کر بعض تسامحات کی درستی کے علاوہ نئی معلومات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ ضمیمات کی فہرست کے بعد مصادر کی فہرست بھی درج ہے۔ آخر میں اسماء الرجال کا اشاریہ بھی شامل ہے۔ آئندہ ایڈیشن میں اگر ڈاکٹر صاحب اسماء الکتب کا اشاریہ بھی شامل کر دیں اور کتاب کے دوسرے حصے کے مطالب کو اصل متن میں ضم کر دیں تو کتاب کی افادیت بڑھ جائے گی۔ مطالعے کے دوران میں بعض مقامات پر مزید اضافے کی گنجائش بھی نظر آئی جس کی نشاندھی ذیل میں کی جاتی ہے :

(۱) صفحہ ۶۲-۶۳ میں طوطی نامے کے ماخذ میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی صاحب کے مقالے "طوطا کہانی" کا ذکر کیا جائے جو سہ ماہی صحیفہ (لاہور) کے شمارہ ۲ ستمبر ۱۹۵۷ء صفحہ ۸۲ تا صفحہ ۱۰۸ پر شائع ہو چکا ہے۔

(۲) صحفہ ۶۳ پر طوطی نامہ سے ملتی جلتی دوسری مثنویوں کے ذیل میں قصہ چوھا بلی از شرف دین کا ذکر ھونا چاھئیے - شرف دین کا یہ قصہ مطبع حیدری بمبئی ۱۴ رجب ۱۲۸۲ھ کے مطبوعہ مجموعے ''بارہ قصے'' میں شامل ھے - اس کا ایک نسخہ راقم السطور کے کتاب خانے میں ھے، اس میں یہ قصہ صفحہ ۱۱۸ سے ۱۲۴ تک پھیلا ھوا ھے - چوھا لاف زنی کرتا ھے اور بلی کے مقابلے پر آتا ھے' نتیجے کے طور پر اسے شکست ھوتی ھے اور بلی اس کی ساری برادری کو کھا جاتی ھے - کہانی کا نتیجہ اخلاقی ھے -

آغاز کا شعر یہ ھے :

خدا ھیگا خالق خلق کا تمام
کیا جس نے پیدا سبھی خاص و عام

خاتمے کا شعر :

کیا اب قصا یہ شرف دیں تمام
علی خان چھپایا تھا جو نیک نام

(۳) صفحہ ۶۶ پر طوطی نامے سے ملتی جلتی ایک اور منظوم کہانی '' قصہ تنولن و حوان'' کا اضافہ بھی ھونا چاھیے - یہ قصہ بھی مذکورہ بالا مجموعے ' بارہ قصے ' کے حاشیے پر (صفحہ ۶۸ تا ۸۲) درج ھے -

آغاز :

محوست کا قصہ ھوا اب شروع   کسی مسخرے نے کیا جو رجوع
کہا استری کا اُنے چرت ایک   نئیں مانتے بات اُس کی جو نیک

خاتمہ :

تنبولی کا گھر بار کر دے تباہ   خدا اُن کے مکروں سے دیوے پناہ

بندہ ضعیف تیرا ہوں بار الہ میں عاصی ہوں تیرا تو بخشے گناہ

(۴) صفحہ ۱۱۴ فٹ نوٹ ' پنجابی ادب کی تاریخ ' صحیح - پنجابی ادب دی تاریخ -

(۵) صفحہ ۱۳۰ ہرنام سنگھ شان کے حوالے سے سسی پنوں کی پنجابی اشاعتوں کی تعداد پچاس سے زائد بتائی گئی ہے ' یہ تعداد پچاس سے کہیں زیادہ ہے -

(۶) صفحہ ۱۳۷ نواب محبت خان کا سال وفات ۱۲۲۲ھ درج کیا ہے صحیح ۱۲۲۳ھ ' جو قطعۂ تاریخ مصحفی سے ظاہر ہے -

(۷) صفحہ ۱۴۵ پدماوت کی تاریخی حیثیت کی بحث میں کتب مصطفوی کی کتاب '' ملک محمد جائسی '' کا اضافہ ہونا چاہیے - ڈاکٹر نارنگ کے اکثر دلائل اس کتاب میں پہلے سے موجود ہیں -

(۸) صفحہ ۱۶۸ سوہنی مہینوال کی منظوم اُردو اشاعتوں میں ان اجرا کا ذکر بھی ہونا چاہیے - جو فضل حسین تبسم نے رسالہ ادبی دنیا (لاہور) میں شائع کرائے تھے - ان کے علاوہ پنجابی میں اس کی کئی اشاعتیں موجود ہیں جن کا ذکر صفحہ ۳۱۸ پر بھی نہیں کیا گیا -

(۹) صفحہ ۱۸۵ مثنوی چندر بدن مہیار از سیف اللہ کے لیے دیکھیے ' راقم کا مقالہ بعنوان ''مثنوی چندر بدن مہیار'' در برگ گل (کراچی) شمارہ نمبر ۷ ' سالنامہ ۱۹۶۰ صفحہ ۱۱۳ - ۱۳۲ جس میں اس اس مثنوی کے مزید چھ قلمی نسخوں کی نشاندہی کی گئی تھی - ان میں سے ایک راقم کے کتاب خانے میں بھی ہے -

(۱۰) صفحہ ۱۸۷ مثنوی نازنین و پٹھان بھی بارہ قصے میں شائع ہوچکی ہے صفحہ ۶۴ - ۸۱ شاعر نے اپنا تخلص حامد ہی بتایا ہے - آغاز :

ثنا حمد رب کو ہے دائم مدام کیے جس نے پیدا سبھی خاص و عام

خاتمے کے اشعار حسب ذیل ہیں :

شرف ہے مسلماں کا سب پر اتم | اے حامد قصے کو تو کر دے ختم
قصا ناگری کا سنایا اصل | کیا اُس کے اوپر سے میں نے نقل
سنایا ہوں قصا بڑے شوق سے | لطافت مراکت کے پر ذوق سے
لکھا اس کو میں نے سو اجبار میں | مہینے مبارک سو رمضان میں (کذا)
جو تاریخ رمضان کی تھی بیسویں | وہ تھی نیک ساعت سمو پاک دیں
اے حامد بس اب تو تو لکوا نہ کر | پورا کر دو قصا ابھی زود تر
نہ کر اس کے آگے ذرا تو کلام | نبی (کو) تو بھجو درود و سلام
وہ حامد کی کجھ میں سنو زاد و بوم | بس جی تھی انجار میں بس کہ دھوم

(۱۱) صفحہ ۱۹۳ مثنوی شعلۂ عشق کے علاوہ 'دریائے عشق' میں بھی میر نے اسی واقعے کو بیان کیا ہے ۔ دیکھئے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کی کتاب "علمی نقوش" صفحہ ۱۹۳ ببعد، مقالہ بعنوان "دریائے عشق کا ایک ماخذ" ۔ اس کے علاوہ اسی پرسرام کے قصے کو میر کے بھتیجے میر تجلی نے بھی نظم کیا تھا ۔ دیوان تجلی (قلمی) کتاب خانۂ دانش گاہ پنجاب میں بھی یہ مثنوی پائی جاتی ہے :

آغاز :

سنا ہوئے گا اک تجلی جواں | جگر تفتہ، دل رفتہ، آتش زباں

خاتمہ :

قلم بس کر، اب چھوڑ گفتار عشق | زیادہ نہیں خوب اظہار عشق
خدا جانے پھر منہ سے کیا ہو بیاں | کہاں فاش ہووے یہ راز نہاں

(۱۲) صفحہ ۲۰۴ "صبح صادق" بہت عرصہ قبل شائع ہو چکی ہے ؛ ایس ایم اکرام صاحب کے کتاب خانے میں اس کا مطبوعہ

نسخہ موجود ہے، راقم نے ''دربار ملی'' میں صبح صادق کا جو انتخاب دیا ہے وہ اسی مطبوعہ نسخے سے لیا گیا تھا۔

(۱۳) صفحہ ۲٦۵ مثنوی لال و گوہر، ''بارہ قصے'' میں شامل ہے۔ اس میں پہلا قصہ عاجز ہی کا ہے۔

خاتمے کا شعر یوں ہے:

الٰہی عاشقوں کی آبرو رکھ   انہوں کو دو جہاں میں سرخرو رکھ

(۱۴) صفحہ ۳۰٦ اندر جیت منشی کی ''نامۂ عشق'' چند برس ہوئے راقم نے ترتیب دی تھی اور پنجابی ادبی اکیڈمی نے اسے شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ منشی کے رقعات کا مجموعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی لائبریری میں بھی ہے۔ دیکھیے آئیوناف کی فہرست مخطوطات۔

(۱۵) صفحہ ۴۳۳ قصہ چندربدن مہیار پنجابی میں امام بخش کے علاوہ احمد یار نے بھی لکھا ہے دیکھیے A History of Punjabi Literature از ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ صفحہ ۷۰ و صفحہ ۱۰۰
اس کے علاوہ قادر بخش وزیر آبادی نے بھی ۱۹ رجب ۱۲۳۳ھ کو اسے پنجابی نظم میں ڈھالا ہے کلیات قادر بخش (جو خود مصنف کا مکتوبہ ہے) احمد حسین احمد قریشی قلعداری ایم اے ایم او ایل۔ بی ای ڈی کے کتاب خانے میں موجود ہے۔

آغاز:

لکھ لکھ حمد صفات کروڑیں آکھاں خالق تائیں
واحد لا شریک الٰہی ہر خلقت دا سائیں . . .
ہے مکیں ہندی اندر قصا کہیا پنجاب زبانی
کارن سمجھ عزیزاں کیتا، چن چن دُربیانی

خاتمہ :

بخش طمیل اوھمادے ربا قادر بخش فقیری
جس وچ پنجاب ربای کیتا قصہ جوڑ حقیری
وچہ تاریخ آنسھویں رحب قصا جوڑ بمایا
باراں سے تے تیری ھجروں حصا پایا
وقت دوپہراں، دن پنج شنبہ کیتا جوڑ تمام
پھیر کامہ کہیا رباں تھیں ھولے تم کلام . . .
میں تھیں سبھو حو ھوئیا (سو) بخشیں مہر خدا
محو کر کے اوس غلط نوں چنگا چا بنا
ہے میں طمع دعائے دا، ھور آمید نہ کائی
پڑھنے سے والیاں بخشے آپ الاھی (الہی ؟)

مجوعی اعتبار سے یہ کتاب اُردو ادب کے تحقیقی سرمائے میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

★ ★ ★

کتاب :	Karkhandari Dialect of Delhi Urdu
مصنف :	Dr. Gopi Chand Narang ..
طابع :	The Caxton Press Private Ltd. New Delhi
اشاعت :	July 1961 . ..
قیمت :	Rs. 5.00 ... ..
صفحات :	80 .... .

تحقیق و تدقیق کے علاوہ ڈاکٹر نارنگ کا دوسرا محبوب موضوع اُردو زبان کا لسانیاتی مطالعہ ہے۔ صوتیات کے جدید اصولوں اور علم اللسان کی دور حاضر کی تحقیقات کی روشنی میں ڈاکٹر صاحب نے

کرخنداری زبان کو مطالعے کا موضوع بنایا ہے۔ کتاب چھ ابواب پر منقسم ہے۔ تمہید میں ڈاکٹر صاحب نے کرخنداری کی گذشتہ تاریخ کی تلاش و جستجو کی ہے اور بول چال کے پہلو کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھنوی اور دہلوی دبستانوں کے جامد رجحانات کی مخالفت کی ہے، پہلے باب میں (جو حرف آغاز ہے) کرخنداری زبان کی تاریخ اور اس کے متعلق مواد کا مختصر جائزہ لیا ہے، دوسرا باب صوت (Phonology) پر ہے اور اس میں اردو زبان کی صوتی حیثیت سے بحث کرتے ہوئے کرخنداری کے مصوتوں (Vowels) مصمتوں (Consonants) اور جڑواں مصمتوں (Consonantal Clusters) کی وضاحت کی ہے، کرخنداری بولی کے صرفی اور نحوی اصولوں کا تذکرہ کیا ہے' چوتھا باب ذخیرۂ الفاظ (Vocabulary) سے بحث کرتا ہے، پانچویں باب میں قدیم اردو اور کرخنداری کے اشتراک کو موضوع بنایا ہے؛ چھٹے میں کرخنداری زبان کے تین متن درج ہیں۔

اردو بولیوں کا اس طرح کا مطالعہ زبان کے لسانیاتی مطالعے کے لیے مفید ہی نہیں ضروری بھی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے اس ضرورت کا احساس کرتے ہوئے کرخنداری بولی پر یہ رسالہ لکھا ہے۔ ضرورت ہے کہ دوسری بولیوں کا بھی اس طرح کا مطالعہ کیا جائے تا کہ اردو زبان کی ساخت اور اس کے لسانی اور صوتی عناصر کا کماحقہ' پتا چل سکے۔

کتاب علمی انداز میں لکھی گئی ہے لیکن دیباچے میں بعض جگہ لب و لہجے کے علاوہ طریق استدلال بھی کھٹکتا ہے۔ دیوان زادہ کے اقتباس میں ''روزمرۂ عام فہم اور خواص پسند'' کا یہ ترجمہ کہ (Liked by the nobles and understood by the commonn people)

کرنا ان کی زیادتی ہے ' میر اور حاتم وغیرہ جس بول چال کی زبان ک
برتتے تھے وہ خواص کی بول چال کی زبان ہے عوامی زبان نہیں ہے
روزمرۂ عام وہم سے عام لوگوں کی زبان مراد لینا صحیح نہ ہوگا
اس طرح میر تقی میر کے بارے میں بیان کردہ روایت بھی محتاج ثبوت
ہے ۔ کرخنداری کے مطالعے سے البتہ انہوں نے جو تین باتیں معلوم کی
ہیں وہ اردو زبان کے بارے میں دور رس نتائج کی حامل ہیں
فرماتے ہیں :

It (i e the study of Karkhandari Dialect), of course, has proved interesting in many ways, firstly, it has brought out the phonological and grammatical pecularities of the present dialect, secondly, it has revealed that many old forms, that have been but in the literary urdu are still preserved in the Karkhandari dialect; and thirdly, it establishes that inspite of great dislocation in the population-pattern in recent years, urdu still retains a living connection with the dialect of Delhi

کرخنداری بولی کی حدود کا تعین اور اس کے علمی سرمایے کے
بارے میں بھی ڈاکٹر صاحب کی معلومات اہم ہیں ۔ اس بولی کی
دو کتابوں کے نام البتہ رہ گئے ہیں ، ایک تو احمد علی کا افسانہ
'ہماری گلی' دوسرے اشرف صبوحی کی ''دلی کی چند عجیب و غریب
ہستیاں'' کے بعض مکالمے ۔ اس مواد کو بھی ڈاکٹر صاحب اپنے اسباق
میں شامل کر لیں تو مفید ہوگا ۔

ضخامت کے لحاظ سے کتاب کی قیمت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے ۔

★ ★ ★

کتاب : اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو

مصنف : ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

ناشر : آزاد کتاب گھر ' کلاں محل ' دہلی ٦

اشاعت : جولائی ۱۹۶۱ء
قیمت : ایک روپیہ
صفحات : ۴۷

اس کتاب کے بعض لسانی مسائل خصوصاً صوتی مسائل 'کرخنداری بولی' والی کتاب میں مشترک ہیں۔ البتہ ان مسائل کا اطلاق کرخنداری پر نہیں اُردو زبان پر کیا گیا ہے۔ ایک غیر ملکی کو اُردو سیکھنے میں جو دقتیں پیش آتی ہیں ان میں سے اکثر اس غلط طریق کار کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں جس میں ساری توجہ ذخیرۂ الفاظ کی طرف کر دی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے میں یہ طریقہ غلط ہے۔ لسانیات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ زبان کا بنیادی حصہ ذخیرۂ الفاظ نہیں، اس کا صرفی و نحوی ڈھانچہ اور صوتی نظام ہے۔ اُردو زبان کے اس بنیادی رخ کو تفصیل سے پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اُردو کی تعلیم میں سماعی تحریری مشق پر زیادہ زور دینا چاہیے اور شعور سماعت کی تربیت کے ساتھ ساتھ اظہار کی قدرت پر بھی توجہ کرنی چاہیے۔ آخر جب طالب علم زبان کی بنیادی آوازوں پر قادر ہو جائے پھر تلفظ کے ان پہلوؤں کی اصلاح کرنی چاہیے جو محتاج اصلاح رہ گئے ہوں۔ اس طرح زبان سیکھنے میں طالب علم کو آسانی ہو جائے گی۔

یہ کتابچہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے رسالے 'اُردوئے معلّٰی' کے لسانیات نمبر میں بھی شامل ہے۔ مقالے کی افادیت کے پیش نظر اسے الگ سے شائع کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی

حمد

زمین طرحی سر غزل دیوان قدیم - ۱۱۳۱ھ

کیا کہے قاصر زبان توحید و حمد کبریا
جس نے کن کے حرف میں کونین کو پیدا کیا

جو کہ ہے غوّاص اس بحر عمیق عشق کا
سب شناور دیکھ کر کہتے ہیں اس کو مرحبا

کب ہے محتاج شراب ناقص انگور و قند
جن نے میخانے میں وحدت کے پیالا بھر دیا

مزرع دنیا میں جو اپنے تئیں دانا کہے
پیس ڈالے اس کو گردش میں فلک کی آسیا

چھوڑ کر سب خلق حاتم دل لگا خالق کے ساتھ
جس نے تجھ کو صورت انساں کیا اور جی دیا

زمین طرحی در ۱۱۳۱ھ

ر دیکھتا ہوں میں جو پر نظر کوئی کچھ کہو کوئی کچھ کہو
ہشیار ہوں یا بے خبر کوئی کچھ کہو کوئی کچھ کہو

قسمت مقدر بوجھ کر عالم میں آ کر حرص سے
پھر کیا ہے پھرنا در بدر کوئی کچھ کہو کوئی کچھ کہو

جز معصیت کے کچھ نہیں ہے کام مجھ عاصی کے تئیں
ہر روز و ہر شام و سحر کوئی کچھ کہو کوئی کچھ کہو

کچھ نیک و بد کہنے کا اب خطرا نہیں ہے خلق کا
یکساں کیا نفع و ضرر کوئی کچھ کہو کوئی کچھ کہو

ہے چار دن کی زندگی خوش رہ کہ آخر کے تئیں
دنیا سے جانا ہے گذر کوئی کچھ کہو کوئی کچھ کہو
حاتم توقع چھوڑ کر عالم میں تا شاہ و گدا
آ کر لگا حیدر کے در کوئی کچھ کہو کوئی کچھ کہو

نعت

زمین طرحی در ۱۱۳۲ھ

اوّل خدا نے نور تمہارا عیاں کیا
اس نور سے بنا یہ زمین و زماں کیا
تجھ در پر آرزو میں سلیماں مثال مور
کیوں کر نہ ہو کہ تجکو شہِ خسرواں کیا
صاحب دلوں کو حشر تلک ہے وہ سجدہ گہہ
جس سر زمیں میں تم نے قدم سے نشاں کیا
کحل البصر کی جا تری خاک قدم کو بوجھ
انکھوں کو سرمداں نے بنا سرمہ داں کیا
دیکھا فلک سے قد کا ترے مرتبہ بلند
طوبیٰ نے قد تیر کو اپنے کماں کیا
عملوں کے خار ہوش کے تیشہ سے کاٹ ہم
گلشن بنا کے دل کو تمہارا مکاں کیا
حاتم کا دل ہوا تھا سراپا اگر ضعیف
تجھ عشق نے یہ پھر سرِ نو سے جواں کیا

زمین طرحی در ۱۱۳۲ھ

تاباں ہے اس جبیں سے مرے دل میں نور آج
جس نور سے ہر ایک ہوا کوہ طور آج

اس کی نگاہ مست نے دیوانہ کر دیا
دل سے حالؔ ، سر سے رہا ہوش دور آج
اس کی بھواں کی تیغ کی شہرت غلط نہیں
عالم کیا ہے قتل ہمارے حضور آج

زمین طرحی در ۱۱۳۲ھ

کاملوں کا یہہ سخن مدت سے مجکو یاد ہے
یعنی بے معشوق جینا زندگی برباد ہے
بندگی سے سرو قد کی تک قدم باہر نہیں
کیا ہوا (جو)[1] سرو کہنے میں اگر آزاد ہے
بے مدد زلفوں کی اُس کے حسن نے قیدی کیا
صید دل بے دام کرنا صنعت صیاد ہے
رخ کو تیرے دیکھ کر کہتا ہوں میں شمس الضحیٰ
خط تس اوپر سورۂ والشمس کی اسناد ہے
دل یہاں پھرتا ہے حاتم کا نجف کے گرد گرد
(گو)[2] وطن ظاہر میں اس کا شہ جہان آباد ہے

زمین طرحی در ۱۱۳۲ھ

جو عاشق ہیں تمہارے سیر ہیں دنیا سے من اُن کے
نہیں رکھتے گرہ میں دام ، ہے ہمت کا دھن اُن کے
لب شیریں سے تیرے کام لینا کام ہے جن کا
تصدق ہر قدم ہوتی ہے روح کوہکن اُن کے
نہ کر روشن دلوں کی بزم میں تو شمع کو روشن
کہ داغ عشق سے روشن رہیں ہیں انجمن ان کے

---

(۱) مخطوطے میں "گر" - (۲) کرم خوردہ -

کہاں فرصت ہے عشاقوں کو سیر گلستاں کرنا
چبھے ہے خار سا آنکھوں میں کیا گل کیا چمن اُن کے

جو کوئی مرتا ہے عالم میں سیہ چشموں کی حسرت میں
دفن کے وقت لازم ہے سیہ کرنا کفن اُن کے

جو ہیں خاموش لب سو نیک و بد کہنے سے فارغ ہیں
رنگ غنچۂ تصویر ہیں دائم دہن اُن کے

جو ہیں اہل سخن حاتم انہیں مرنے سے کیا دہشت
سمجھا کی طرح جیویں گے با محشر سخن اُن کے

زمین ولی در ۱۱۳۳ھ

جس کے دل میں ترا خیال ہوا	اُس کو جینا یہاں محال ہوا
ہجر میں زندگی سے موت بھلی	کہ کبھیں سب آسے وصال ہوا[1]
گرمیٔ حسن سے ترے خورشید	تجھ طرف دیکھتا زوال ہوا
ہے وہ چرخے مثال سرگرداں	جس کو حاتم تلاش مال ہوا

زمین طرحی در ۱۱۳۳ھ

دیکھ کر چشم یار کی بد مست	صوفی آکر ہوئے ہیں بادہ پرست
دے کے دل اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ	ہم نے سودا کیا ہے دست بدست
عشق کی راہ میں میں مست کی طرح	کچھ نہیں دیکھتا بلند اور پست
اُس شرابی کے ہاتھ سے حاتم	شیشۂ دل کے تئیں ہوئی ہے شکست

زمین طرحی در ۱۱۳۴ھ

ہوا ہے خط سے عارض جاں من سبز	کیا ہے ابر رحمت نے چمن سبز

---

(۱) ہجر میں زندگی سے مرگ بھلی	کہ کبھی سب جہاں وصال ہوا
(نکات الشعرا، میر)
ہجر کی زندگی سے مرگ بھلی	کہ یہ کبھوے جہاں وصال ہوا
(مجموعہ نغز، قاسم)

مگر قمری کا ماتم ہے چمن میں حو در میں سرو کے ہے پیرھن سبز

زمین طرحی در ۱۱۳۴ھ

حا کر ھوا وہ حب سے چمن میں دو چار گل
شرمندہ ھو حلو میں چلے ھیں قطار گل

پہنچی ہے حس دماغ میں تجھ گل بدن کی بو
نزدیک اُس کے کچھ نہ رہا اعتبار گل

گلشن میں ایسی دھوم پڑی تیرے رنگ کی
حالی رھی چمن سے یکایک بہار گل

گلگوں قبا سے بند ھوا ہے حنھوں کا دل
اُن کی نگہ میں حار ہے نقش و نگار گل

حاتم گلوں کا کیوں نہ فلک پر ھو اب دماغ
پہنا ہے اُس نے آج گلے بیچ ھار گل

زمین طرحی در ۱۱۳۴ھ

عاشق اوپر نہ حور و ستم اس قدر کرو
عالم کا ڈر نہیں تو حدا کا تو ڈر کرو

حو کچھ کیا ھو ھم نے سو دیوانہ بوجھ کر
بخشو حدا کے واسطے آ درگذر کرو

دل کے نگیں پہ اسم تمہارے کا نقش ہے
نام اپنے کے سبب تم اسے نامور کرو

دل لے گئے ھو تو بھی جفا چھوڑتے نہیں
ھم دل جلوں کی آہ سحر سے حذر کرو

آساں نہیں ہے شوخ ستم گر کو دیکھنا
جی نذر کر چکو تب اُس اوپر نطر کرو

حاتم کبھی ہے تم کو میاں ایک جا تو رہ
آنکھوں میں آنسو یا مرے دل میں گھر کرو

زمین طرحی در ۱۱۳۴ھ

یار کا مجھ کو اس سبب ڈر ہے شوخ' ظالم ہے (اور) ستم گر ہے[1]
دیکھ سرو چمن ترے قد کو خجل ہے' پا بہ گل ہے' بے پر ہے
حق میں عاشق کے ترے لب کا سخن قند ہے' نیشکر ہے' شکّر ہے
کیونکہ سب سے تجھے چھپا نہ رکھوں جان ہے' دل ہے' دل کا اثر ہے
مارنے کو رقیب کے حاتم شیر ہے' ببر ہے' دھتر ہے

۱۱۳۴ھ

پلک لگنے میں دو کرتے ہیں پیارے
تری آنکھوں کے ہیں تیغے دو دھارے
ترا خط آج لے نوح سیہ پوش
ہوا ہے قتل عاشق پر اتارے
نہاں ہم سے یہ ملنا تمہارا
رقیبوں کے چلے ہیں سر پر آرے

زمین طرحی در ۱۱۳۵ھ

آب حیات جا کے کسی نے پیا تو کیا
گو خضر ہو جہاں میں اکیلا جیا تو کیا
شیریں لباں سنگ دلوں کو اثر نہیں
فرہاد کام کوہ کنی کا لیا تو کیا
جلنا ہمیشہ شمع صفت سخت کام ہے
پروانہ کی طرح سے اگر جی دیا تو کیا
ناسور ہو گیا ہے بہوگا کبھو وہ بند
جرّاح رحم عشق کو آ کر سیا تو کیا

---

(۱) مخطوطے میں "شوخ ہے ظالم ہے ستم گر ہے"

محتاجگی سے مجکو نہیں ایک دم فراغ
حق نے جہاں میں نام کو حاتم کیا تو کیا

زمین طرحی در ۱۱۳۵ھ

عسق نے چٹکی سی لی بھر آ کے مری جاں کے بیچ
آگ سی کچھ لگ گئی ہے سینۂ بریاں کے بیچ
اهل معنی جز نہ بوجھے گا کوئی اس رمز کو
ہے ظہور مظہر حق صورت انساں کے بیچ
زلف و چشم و خال و خط چاروں ہیں دشمن دین کے
حق رکھے ایماں سلامت ایسے کفرستاں کے بیچ
نقد دل کھوتا ہے ہم نے جان کر اس راہ میں
فی الحقیقت عاشقوں کو سود ہے ' نقصاں کے بیچ
گر عدو میری بدی کرتا ہے خاص و عام میں
میں اُسے رسوا کروں گا باندھ کر دیواں کے بیچ
رات دن جاری ہے عالم میں مرا فیض سخن
گو کہ ہوں محتاج پر حاتم ہوں ہندستاں کے بیچ

زمین طرحی در ۱۱۳۵ھ

چھین لیتے ہیں مرے دل کو نگاہوں کے بیچ
حسن رہزن ہے جو پنجاب کی راہوں کے بیچ
دفتر عشق سے اب اس کو سند پہنچی ہے
جن نے دل بند کیا زلف سیاہوں کے بیچ
کئی فرہاد ہیں جویا مرے شیریں لب کے
کئی یوسف ہیں زنخداں کے چاہوں کے بیچ
عسق کی فوج نے آ گھیر لیا ہے ظالم
یک بیک دل کو مرے نیزۂ آہوں کے بیچ

ہاتھ حاتم کا پکڑ پار اوتارو یا شہ
عرق ہے دیکھ سدا بحر گناہوں کے بیچ

زمین طرحی در ۱۱۳۵ھ

یار نکلا ہے آفتاب کی طرح کون سی اب رہی (ہے) حجاب کی طرح
چشم مست سیہ کی یاد مدام سینۂ دل میں ہے شراب کی طرح
صاف دل ہے تو آ کدورت چھوڑ مل ہر اک رنگ میں تو آب کی طرح
پست ہو چل مثال دریا کی حشمہ برپا نہ کر حباب کی طرح
دو پیئے ہے شراب حاتم ساتھ کیوں نہ دشمن جلیں کباب کی طرح

زمین طرحی در ۱۱۳۵ھ

بن نکلا صنم گھر سے قبا سبز ہوا جوں سرو سر سے تا بہ پا سبز
دیکھ پا دیکھ تیری، جوں سے سرخ ہوا ہے وہم سے رنگ حنا سبز
مثال چل سیر کر ابر و ہوا ہے ہوا ہے کوہ و صحرا جابجا سبز
ہو اس سے دو با آمد حاتم درے گا کھیت کو تیرے خدا سبز

زمیں طرحی در ۱۱۳۵ھ

یوں ہے تم سے ہمیں سدا اخلاص گل سے رکھتی ہے جوں صبا اخلاص
دوستی میں عجب نہیں کہ رکھیں آشناؤں سے آشنا اخلاص
کبھو پایا نہ ایک دم آرام جب سے تم ساتھ ہم کیا اخلاص
دل میں دشمن رہا تو منہ پر دوست ہم نے دیکھا یہاں ترا اخلاص
یہی ہوتی ہے دوستی کی شرط؟ وہ چہ خوش واہ وا بھلا اخلاص
ہم نے چھوڑا تمہیں خدا کی قسم دیجیے جا کے اور جا اخلاص
حاتم اُس بے وفا کا نام نہ لے ایسے نا آشنا سے کیا اخلاص

زمین شاہ مبارک آبرو[1] در ۱۱۳۵ھ

اس دکھ میں ہائے یار یگانے کدھر گئے
سب چھوڑ ہم کو غم میں نہ جانے کدھر گئے
جو اُس پری کو شیشۂ دل میں کریں تھے بند
وے علم عاشقی کے سیانے کدھر گئے
توحش جنوں کی دیکھ کے یکبارگی ستی
اس ملک دل سے عقل کے تھانے کدھر گئے
معلوم ہے کسو کو کہ وہ آج شعلہ خو
ہم کو جلا کے آگ لگانے کدھر گئے
ڈھونڈھا بہت پہ ہم نے نہ پایا اُنھوں کا کھوج
دل کو چرا کے ہم سے چھپانے کدھر گئے
حاتم کے دل کو مصرع اوّل نے یوں کہا
اس دکھ میں ہائے یار یگانے کدھر گئے

زمین ولی در ۱۱۳۵ھ

جس کو تیرا خیال ہوتا ہے — اُس کو جینا محال ہوتا ہے
خم ابرو کی یاد سے دل پر — زخم ناخن ہلال ہوتا ہے
فیض قد سے ترے چمن میں سرو — ہر قدم در نہال ہوتا ہے
جب میں روتا ہوں کھول کر دل کو — شہر میں برشکال ہوتا ہے
کون جانے ہے غیر حق تجھ بن — جیسا حاتم کا حال ہوتا ہے

زمین شرف الدین مضمون در ۱۱۳۶ھ

تو ہوا ہے جب سے ہم زانو مرا — دل ہوا ہے تب سے اب یکسو مرا
ہر قدم پر سرو پانی ہو بہے — جو چلے وہ قامت دلجو مرا

---

(۱) شاہ مبارک آبرو۔

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے — وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے
نے نام ہی بتایا نہ گھر کا دیا پتا — پوچھوں میں کس طرح کہ ملانے کدھر گئے

بحر و بر یکساں کیا رو رو کے آج — تو بھی اب تھمتا نہیں آنسو مرا
میں نہیں تو کنج تنہائی میں ہے — بوریا کا نقش ہم پہلو مرا
ہوں تری محراب ابرو کا غلام — کیوں پھرے قبلہ سے جان اب رو مرا
ہائے مجھ وحشی کو تنہا چھوڑ کر — کس طرف کو رم کیا آھو مرا
حاتم بے کس کا مجھ بن کون ہے — کون ہووے جو بہووے دو مرا

زمیں طرحی در ۱۳۶اھ

بن ترے جان نہ تھی جان، مری جان کے بیچ
آن کر پھر کے جلایا تو مجھے آن کے بیچ
ایک دن ہاتھ لگایا تھا ترے دامن کو
اب تلک سر ہے حجاب سے گریباں کے بیچ
آج عاشق کے نئیں کیوں نہ کہے تو دُر دُر
واسطہ یہہ ہے کہ موتی ہے ترے کان کے بیچ
ہوئی رنداں لال ترے ہاتھ سے کھاتے بیڑا
کیا فسوں پڑھ کے کھلادا تھا مجھے پان کے بیچ
کچھ تو مجنوں کو حلاوت ہے وہ ن دیوانو
چھوڑ شہروں کو جو پھرتا ہے بیابان کے بیچ
دیکھ حاتم کو بھلا ہو ہے برا کیوں مانا
کیا خلل اس نے کیا آکے تری شان کے بیچ

زمین طرحی در ۱۱۳۶ھ

ہاتھ لے قوس قزح جب ہم اوپر آتا ہے چرخ
سہم کھا کر آہ کے تیروں سے پھر جاتا ہے چرخ
مردماں سے گر فلک دشمن ہے اس کی ضد کا
چشم کی گردش پر اس کی آپ کیوں کھاتا ہے چرخ

آہ سرد و رنگ زرد و چشم تر ، دل غرق خوں
یہہ بلائیں عاشقوں کے سر اوپر لاتا ہے چرخ
بس نہیں چلتا جو اس دم ان کے اوپر گر پڑے
عاشق و معشوق کو جب ایک جا پاتا ہے چرخ
سرکش و زر دار سے ہے جنگ حاتم اس کے تئیں
خاکسار و عاجز و مفلس سے سرماتا ہے چرخ

زمین طرحی در ۱۱۳۶ھ

لکھوں احوال کا اس شوخ خوش خط کو اگر کاغذ
سیہ بختی سے میری سچ کھاوے سر بسر کاغذ
بہار و موسم گل کی رقم کیں اُس میں ہم خبریں
عجب کیا گر کرے پیدا ہمارا برگ و بر کاغذ
لگن میں شمع رو کے اڑ کے کہتا التماس اپنی
اگر رکھتا وہ اپنے مثل پروانے کے پر کاغذ
نہ پایا ایک پرزا تب لکھا ہم دردِ دل پر
ہوا ہے شہر سے نایاب دیکھو اس قدر کاغذ
ثنا خواں ہے تو ان سیمیں بدوں کا ، اس سبب حاتم
ترے اشعار کا عالم رکھے ہے مثل زر کاغذ

زمین طرحی در ۱۱۳۶ھ

جس طرف کو کہ یار جاتا ہے — دل ہو بے اختیار جاتا ہے
چاہ ، پر دل کی چاہ کو نہ جتا — دلربا اس میں خوار جاتا ہے
گھات چڑھ مس ہرن (سکار؟)[1] منبے — دور یو یہہ شکار جاتا ہے
بے وفا وعدہ کر نہ آیا حیف — میرا حاتم قرار جاتا ہے

(۱) نگار ؟ (کرم خوردہ)

زمین شاہ مبارک آبرو ۱۱۳۷ھ

چاند سے تارے کا ہوتا ہے کبھو جو اتفاق
اس طرح پیارے ترے موہہ پر جھمکتا ہے بلاق
یا کہاں تا ماہ نو کہنا بھواں کو ہے بجا
یہہ تعجب ہے کہ عالم جفت کو کہتا ہے طاق
جوں سکندر کے بھی دل میں حسرت آب حیات
اس طرح تجھ لب کے بوسے کا مجھے ہے اشتیاق
کیا ہوا گر تو نہیں مجھ پاس اور میں تیرے پاس
روز و شب مونس ہے میرے درد کا تیرا فراق
رو برو حاتم کے ہوتے کیوں کہاتے ہیں غلام
گر عدو رکھتے ہیں اس کے ساتھ دل اندر نفاق

زمین مرزا جان جاناں مظہر ۱۱۳۷ھ

اے دل فکر تو فکر پڑے گا بلا کے ہاتھ
انسہ ہو نہ جا کے لگے دل ربا کے ہاتھ
بیگانہ سے گلا کوئی عالم میں کیا کرے
جینا ہوا محال مجھے آشنا کے ہاتھ
پیغام درد دل کا مرے غنچہ لب کے پاس
پہنچا سکے گا کون مگر دوں صبا کے ہاتھ
آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سے
مینا لگا ہے جب سے کہ مجھ بے نوا کے ہاتھ
دامن رضا کا آس کی ازل سے کیا مجھے
چلتا نہیں ہے زور کسی کا قضا کے ہاتھ

حاتم اُمید حق سے نہ رکھیے تو کیا کرے
موقوف ہے ملاپ صنم کا خدا کے ہاتھ

زمین ولی ۱۱۳۷ھ

اس پری رو کا مجھے ہر دم تصور کام ہے
جس تصور سے دل بے صبر کو آرام ہے
اب شراب و ساغر و ساقی کی کچھ حاجت نہیں
چشم کی گردش نری مجکو لبالب جام ہے
شکر للہ بعد مدت کے صنم نے لطف سے
ڈھول کر زلفیں کہا مجکو نہ جا اب شام ہے
دستہ اس کی شوخیٔ مژگاں کی شہرت کیوں نہ ہو
جس کی ہیبت سے مشبک سینۂ بادام ہے
کھب گئی ہے دل میں حاتم کے نری بانکی ادا
جاتے جاتے ٹک بتاتا جا ترا کیا نام ہے

زمین طرحی در ۱۱۳۷ھ

نگہہ لطف دلربا بس ہے
مجھ(سے)مس کو یہ کیمیا بس ہے
ناتوانوں کو وقت پیری کے
ہر قدم آہ کا عصا بس ہے
سفر عاشقی میں عاشق کو
زاد رہ دل کا مدعا بس ہے
قتل کرنے کو ایک عالم کے
تیری تروار سی ادا بس ہے
بلبل دل کو گل سے کام نہیں
جائے گل تیرا نقش پا بس ہے
کچھ نہیں چاہتا میں حاتم ہوں
مجکو ہر آن میں خدا بس ہے

زمین ولی در ۱۱۳۸ھ

جب چمن میں چلا وہ سرو بلند
ہر قدم سرو کو کیا پابند

دیکھ رخسار آتشیں تیرے
لالہ رویاں کا دل ہوا ہے سپند

کر نظر تیری زلف کے حلقے
کوئی زنجیر کوئی کہے ہے کمند

اُس کے چہرے کے آگے ہے بے نور
روشنی محسن ماہ ہے ہر چند

دام اپنے کو اُس نگیں لب نے
سب میں حاتم کا دل کیا ہے پسند

زمین ولی ۱۱۳۸ھ (حسب الفرمائش نواب علی اصغر خاں بہادر)

خوبرویوں میں مجھے رتبۂ آمرائی ہے
فوج عشاق نرے حسن کی مجرائی ہے

دیکھ رخسار ترا گل نے گریباں پھاڑا
اور کلی لب کو ترے دیکھ کے کمہلائی ہے

نہ چھپے دختر رز پردۂ مینا میں سو کیوں
محتسب تیرے ڈراوے سے یہہ شرمائی ہے

اُس کو زنجیر کی حاجت نہیں دیوانوں میں
جو تری زلف گرہ گیر کا سودائی ہے

ہاں دل اب خوش ہو ترے ہجر کے گذرے ایام
یار غمخوار کے ملنے کی گھڑی آئی ہے

ق اے ولی مجھ سے تو آزردہ نہونا کہ مجھے
یہہ غزل کہنے کو نواب نے فرمائی ہے

یعنی فیاض زمانے کا علی اصغر خاں
جس کی ہمت کی اب حاتم نے قسم کھائی ہے

زمین ولی در ۱۱۳۸ھ

اُلفت کی مجکو پیارے تیری نگاہ بس ہے
گر نے پہ نہ ہووے تو گاہ گاہ بس ہے

تیرے غبار خط کے سبزے کا دل ہے پیاسا
درویش کے نشے کو (چُٹکی)[1] گیاہ بس ہے
نکلے سے جس کے حاتم شہروں میں عید ہووے
سارے برس میں مجکو وہ ایک ماہ بس ہے

زمین طرحی در ۱۱۳۹ھ

وقت رخصت ہم کہا اس سرو قد دلبر سے آج
پھل کہاں جینے کا جو تو اٹھ چلا ہے سر سے آج
تیرے آگے لے چکا خسرو لب شیریں سے کام
تو عبث سر پھوڑتا ہے کوہکن پتھر سے آج
دیکھیے جیتا بچے ہے کون اور مرتا ہے کون
دھوم ہے عالم میں وہ نکلے ہے اپنے گھر سے آج
حاتم اس کے قد سے گر دعویٰ کرے گلشن میں سرو
چیر ڈالے فاختہ آرہ نما شہپر سے آج

زمین طرحی در ۱۱۳۹ھ

صنم کی دید کر لب اور دھن سرخ ہوا ہے خون بلبل سے چمن سرخ
شہید لالہ رویاں کو بجا ہے دفن کے وقت گر کیجے کفن سرخ
ہوا مجنوں کے حق میں دشت گلزار کیا ہے عشق کی ٹیسوں نے بن سرخ
گلوں کا رنگ اب زرد ہو گیا ہے چمن میں دیکھ کر تیرا بدن سرخ
اے حاتم یاد کر حال شہیداں شفق سے جب کہ ہوتا ہے گگن سرخ

زمین طرحی در ۱۱۳۹ھ

جلوہ گر فانوس تن میں ہے ہمارا من چراغ
بے بتی اور تیل یہ ہے روز و شب روشن چراغ

---

(۱) مخطوطے میں "چکٹی"۔

آج کی شب لطف ہے سیر چمن اے عندلیب
روغن گل سے ہوا ہے ہر گل گلشن چراغ
ڈر نہیں مجنوں کو پھرنے کا شب صحراں کے بیچ
جو میں اُس کے دیدۂ آہو ہوئے ہیں دن چراغ
تا ابد اس کو نہیں باد مخالف سے خطر
ہے ہمارے ہاتھ در بے پردۂ دامن چراغ
جب سے ہے روشن دلوں کے دل پہ حاتم کی نگہ
تب سے روشن ہے گا اُس کے دل کا بے روغن چراغ

زمین طرحی در ۱۱۳۹ھ

جب سے تیری نظر پڑی ہے جھلک   تب سے لگتی نہیں پلک سے پلک
کل نہیں تجھ بن، اب ہوئے کئی سال   تو نہ آیا اے ماہ آج تلک
گردش چرخ سے نہ ڈر حاتم   آپ گردش میں رات دن ہے فلک

زمین طرحی در ۱۱۳۹ھ

اُس میاں کی کمر کہو نہ کہو   مو سے باریک تر کہو نہ کہو
پار گذرا ہے دل سے تیر نگہ   کوئی اسے کارگر کہو نہ کہو
صندلی رنگ یار بن جینا   درد سر ہے اگر کہو نہ کہو
جو رقیبوں سے مصلحت کی ہے   ہم کو سب ہے خبر کہو نہ کہو
مہ جمالوں کا عشق ہے حاتم   زندگی کا ثمر کہو نہ کہو

زمین مرزا مظہر جان جاناں[1] در ۱۱۴۰ھ

کیا جو فاختہ نے سرو اوپر آشیاں اپنا
مگر سولی اوپر چڑھ کر دیا چاہے ہے جاں اپنا

---

(۱) مظہر جان جاناں
چلے ہم گل کے ہاتھوں سے جلا کر خانماں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

بغل سے چھوڑ مصحف کس روش نکلے وہ گلشن سے
کہ بلبل جانتی ہے باغباں گل کو قُراں اپنا

فلاطوں کی طرح میں خم نشیں ہوں اے کہاں ابرو
کہ تیرے چشم کے گوشے میں پایا ہے مکاں اپنا

قیامت اور عدم کے ہیں وہ منکر، جا کے گلشن میں
دکھا دے سرو کو قد اور غنچے کو دہاں اپنا

وہی ہوتا ہے حاتم سب میں نامی، بعد مرنے کے
جو جیتے جی اُڑا دے آپ سے نام و نشاں اپنا

در ۱۱۴۰ھ

چمن میں کسو(ں) نہ بابد ہے عندلیب اب آشیاں اپنا
کہ جانے ہے گل اپنا، گلشن اپنا، باغباں اپنا

تصدق تجھ اوپر کرتا ہوں، جوں بلبل گلوں اوپر
دم اپنا، ہوش اپنا، جسم اپنا بلکہ جاں اپنا

مرے رونے سے ناصح تو جو ناخوش ہے سو کیا باعث
دل اپنا، دامن اپنا، دیدہ و اشکِ رواں اپنا

گلایا آپ کو حاتم نے سر سے پاؤں تک تجھ بن
رگ اپنا، پوست اپنا، گوشت اپنا، استخواں اپنا

زمین طرحی در ۱۱۴۰ھ

ہے بجا ہووے اگر عاشق سے پیاروں میں دماغ
گل کے تئیں بلبل سے ہوتا ہے بہاروں میں دماغ

جب مزاجیں مل گئیں ہوویں تکلّف بر طرف
تب سے نئیں ہے خوشنما یاروں کو یاروں میں دماغ

بن لگائے عطر کے گھر سے کبھو آتا نہیں
شہر میں مشہور ہے اُس کا ہزاروں میں دماغ
آسما حاتم غریبوں کا ہو اُمراؤں کو چھوڑ
دام کو ذرّہ نہیں ہے ان ہماروں میں دماغ

زمین طرحی در ۱۱۴۰ھ

عشق ہے یا نہنگ ہے یارو دشمن نام و ننگ ہے یارو
صبر بن اور کچھ نہ لو ہمراہ کوچۂ عشق تنگ ہے یارو
زلف کی دلربا کا آج خیال دل کو قید فرنگ ہے یارو
شمع رو پرا ہووے کبھو لکر دور دل ہمارا پتنگ ہے یارو
اُس پری رو سے اور حاتم سے رات دن صلح و جنگ ہے یارو

زمین شاہ مبارک در ۱۱۴۰ھ

دماغ اتنا جو اب کرتے ہیں گل رو یہہ ان کے مغز میں کس کی گئی بو
ہمارے دل پر اے ظالم فسوں کار نگہ تری کرے ہے کار جادو
تری محراب میں ابرو کی یہہ خال کدھر سے آ گیا مسجد میں ہندو
کمر تیری نہیں آتی نظر میں تفاوت سے نہیں کہتا ہوں یک مو
دہن کو دیکھ تھا خاموش حاتم ہوا تجھ لب کی باتیں سن سخن گو

زمین طرحی در ۱۱۴۱ھ

مستوں میں جو شیخ آپھنسا تھا میخانے میں طرفہ ماجرا تھا
مدت سے خبر نہیں کچھ اس کی اک دل بھی ہمارا آشنا تھا
سو طرح ہے عاشقی کے فن میں فرہاد بھی ایک سر چڑھا[1] تھا
کیوں کھینچی تھی تیغ گل کسی پر اک نیم نگہ ہی بیمچا تھا

---

(۱) مخطوطے میں "سرچرا"

زمین طرحی در ۱۱۴۱ھ

زندگی ہے بحر میں تن کے تری مثل حباب
تس میں جاری رات دن ہے ہر نفس جوں موج آب

مزرع دنیا میں دانا ہے تو ڈر کر ہاتھ ڈال
ایک دن دینا ہے تجکو دانے دانے کا حساب

عسق اس کا آن کر یکبارگی سب لے گیا
جان سے آرام، سر سے ہوش، اور چشموں سے خواب

اس طرف سے انکسار و عجز و منّت دمبدم
اُس طرف سے غمزہ و جور و جفا، ناز و عتاب

یار اور حاتم دوئی کو دور کر اک ہو گئے
جب ہوا دل صاف تب جاتا رہا سارا حجاب

زمین طرحی در ۱۱۴۱ھ

عشق میں پاس جاں نہیں ہے درست　　اس سخن میں گماں نہیں ہے درست
کسو مذہب میں اور مشرب میں　　ظلم اے مہرباں نہیں ہے درست
ڈر نہ دشمن کو کڑ کڑانے دے　　بانگ مرغی یہاں نہیں ہے درست
کئی دیوان کہہ چکا حاتم　　اب تلک پر زباں نہیں ہے درست

زمین طرحی در ۱۱۴۱ھ

آج اُس بن ہوں بے قرار عبث　　ہاتھ سے دوں ہوں اختیار عبث
نہیں آنے کا ہے وہ وعدہ خلاف　　اُس کا کھینچے ہے انتظار عبث
دل کہاں ہے کہ ہوئے دیوانہ　　کیوں ادھر آتی ہے بہار عبث
شکوہ اس کا کرے ہے سارا جہاں　　ہم سے آزردہ ہوئے یار عبث
ایسے بے دید سے تو رکھتا ہے　　حاتم امید ہم کنار عبث

زمین طرحی در ۱۱۴۱ھ

دل ترستا ہے یار کی خاطر اُس کے بوس و کنار کی خاطر
تیرے آنے سے یوں خوشی ہے دل جیسے بلبل بہار کی خاطر
ہم سے دستوں کو بس ہے تیری نگاہ صبح اُٹھ کر خمار کی خاطر
بس ہے اس سنگدل کا نقش قدم تیری لوح مزار کی خاطر
عمر گذری کہ ہیں کھلے حاتم چشم دل انتظار کی خاطر

زمین طرحی در ۱۱۴۱ھ

پایا نہ ہم نے آکے کہیں زندگی کا حظ
گویا کہ اس جہاں میں نہیں زندگی کا حظ
سن کر مرے سوال کو اس نے دیا جواب
ہم پاس آ کہ ہے گا یہیں زندگی کا حظ

زمین طرحی در ۱۱۴۱ھ

ہے اپنے مرتبے میں اگر آسماں رفیع
لیکن ہے خاکساروں کے حق میں زمیں وسیع
کیا کچھ کریں گے آپ کو دیوانے اب کے سال
آیا ہے نے طرح سے یہہ پھر موسم ربیع
اخلاص اور تواضع تو عاشق کا کام ہے
ان دلبروں سے رسم مدارات ہے بدیع
اس کا مزاج سب کے دلوں کی کرے ہے سیر
صاحب طبیعتوں کی نہ ہو کیوں طبع مطیع
آہستہ یا بلند کہیں حاتم عرض حال
سب کی دعا سنے ہے کہ ہے گا خدا سمیع

زمین طرحی در ۱۱۴۱ھ

تری شمشیر کی دھن پر چلا ہے سر بکف عاشق
اُمید تیر پر تیرے ہوا دل سے ہدف عاشق
حرابی، خانہ ویرانی و بدنامی و رسوائی
یہہ سب جانے ہے تیرے عشق میں اپنا شرف عاشق
قیامت پر قیامت ہووے گی روز جزا ظالم
اٹھیں گے داد تجھ سے مانگنے صف صف بصف عاشق
تجھے حاتم تصوّر کرکے اے فیاض عالم کے
چلا ہے سب طرف کو چھوڑ اب تیری طرف عاشق

زمین طرحی در ۱۱۴۱ھ

گلشن میں تم کدھر سے پیارے پڑے ہو بھول
ہنسنے کو دیکھ آج تمہارے، جھڑے ہیں پھول
حاتم کے کام سب ہوئے انجام شکر حق
تجھ زلف کی یہہ سب میں ہوئی ہے دعا قبول

زمین طرحی در ۱۱۴۱ھ

کاہر اتنا بھی نہیں لازم ہے ہو کر رام رم
دیکھ میرے حال کو کر ظلم اے خود کام کم
دور میں چشموں کے ترے مست ہے عالم مدام
کیوں نہ ہو اس غم سے سرگردان لے کر جام جم
کیا ہوا گر پیچ کھا کر دل میں رکھتا ہے گرہ
تاب کیا جو زلف کے آگے نکالے دام دم
جو صدا آتی ہے باتوں کی تری کانوں کے بیچ
جانتے ہیں اس سخن تیرے کے تئیں الہام ہم

جوں کہا قاصد نے چل حاتم بلایا ہے تجھے
دل سے سب جاتا رہا سنتے ترا پیغام غم

در ۱۱۴۱ھ

آ کر بسا ہے جب سے وہ بادہ نوش دل میں
مانند مستیٔ مے آتا ہے جوش دل میں
ناصح کی دیکھ صورت یوں پھیرتا ہے آنکھیں
ڈرتا ہے محتسب سے جوں مے فروش دل میں

زمین طرحی در ۱۱۴۱ھ

کھڑا ہوں منتظر در پر تمہارے یک نظر دیکھو
سحر سے شام تک اور شام سے لے تا سحر دیکھو
مسیحا ہے ہمارا لعل لب اے دوستاں مانو
اگر باور نہیں کرتے تو تم یک بار مر دیکھو
مسخر اس پری رو کو کیا ہم شیشۂ دل میں
ہماری عاشقی کے نقش کا یارو اثر دیکھو
سدا کر تلخ باتیں مت کرو پھیکا مرے دل کو
کبھو تو ترش روئی چھوڑ کر اے لب شکر دیکھو
اڑیں ہیں دیکھنے کے شوق میں اے شمع رو تیرے
لگا کر چشم پروانہ صفت مژگاں کے پر دیکھو
مقابل عشق کی شمشیر سے ہوتا ہے یہہ حاصل
کوئی اس خاک کے پتلے کا دل گردا، جگر دیکھو
اگر خواہش ہے تم کو سیر دریا کی مرے صاحب
تو حاتم پاس آؤ جوئبار چشم تر دیکھو

زمین طرحی در ۱۱۴۲

گر ظلم اور ستم ہے اس پر جفا کی خواہش
راضی ہیں ہم بھی اس پر جو ہو خدا کی خواہش

تیرے لبوں سے دل کو بوسے کی آرزو ہے
بیمار کو نہووے کیونکر دوا کی خواہش

عاشق کا خوں بہا کر پامال کیوں کرے ہے
قاتل کے تئیں ہوئی ہے شاید حنا کی خواہش

تیری نگہ کو پیارے ترسے ہیں چشم میرے
کیونکر نہ آسما کو ہو آسما کی خواہش

(اکسیر)[1] تجھ نگہ کا حاتم کو کیمیا ہے
جو مرد ہی نہیں ہے اس کو طلا کی خواہش

زمین طرحی در ۱۱۴۲ھ

یہہ غلط ہے کہ نہیں بولتا وہ یار غلط
ہم سے کہتا ہے وہ ہر بات میں سو بار غلط

عشق کے درس میں ہرگز نہیں ہے بحث کو جا
شیخ اس وقت تری سب ہے یہہ تکرار غلط

اس کے وعدے کی وفا ہم کو عبث ہے یارو
ہے سراپا ایسے بدقول کا اقرار غلط

ق : کوئی سخن کو مرے لاتا ہی نہیں خاطر میں
واسطہ یہہ ہے کہ سب ہیں مرے اشعار غلط

سر دیوان پہ حاتم کے بجا ہے کہ لکھو
نسخۂ معتبر و خوش خط و بسیار غلط

---

(۱) مخطوطے میں "اکثیر"۔

زمین طرحی در ۱۱۴۲ھ

جہاں میں تم کو ہمیشہ رکھے خدا محفوظ
ہے آشنا کی خوشی گر ہو آشنا محفوظ
رقیب تو نے جو بدظن کیا ہے مجھ سے اسے
کروں گا تیرے تئیں میں بھی خوب سا محفوظ
میں کہہ رہا کہ دوست مل بتاں سے، حاصل کیا
ملنے سے ان کے اب، اے دل! تو کچھ ہوا محظوظ؟
عجب لپٹ ہے پسینے کی گلبدن تیرے
کہ گل ہے عطر فروش اور ہوئے صبا محظوظ
کسو طرح کی نہیں احتیاج حاتم کو
وہ تیرے عشق کی دولت سے ہے سدا محظوظ

زمین طرحی در ۱۱۴۲ھ

کون سے دن مہربانی سے دکھاؤ گے جمال
روز و شب تم بن گذرتا ہے مجھے اے ماہ سال
خال تری چشم میں، آہو کے جوں ناف میں مشک
اس طرح کا تل نظر آیا ہے ہم کو خال خال
وصف میں زلف رسا کی شان میں قاصر ہوں یار
گر بدن اوپر زباں ہووے ہمارے بال بال
گر اشارا ہووے ابرو کا ترے اے ماہ من
تا قیامت پھر نہ نکلے آسماں اوپر ہلال
چھوڑ[1] کر حاتم کو مفلس اٹھ گئے دولت کے یار
تب تو چرخے کی طرح کھاتے تھے چکّر جب تھا مال

(۱) دیکھ

زمین طرحی در ۱۱۴۲ھ

لبریز حب سے عشق کے ساغر پیے ہیں ہم
کرنے نہ تھے جو کام وہی سب کیے ہیں ہم

غواص ہو کے عسق کے دریا میں سربکف
مقصد کے دُر کے لینے کے تئیں مر جیے ہیں ہم

فانوس دل میں دیکھ لے روشن ہیں جوں چراغ
جو داغ دل پہ عشق میں تیرے لیے ہیں ہم

ہر یک سخن ہوا ہے ہمارا مثال قند
شیریں لباں کے حب سے کہ بوسے لیے ہیں ہم

شمشیر عسق کے جو تھے حاتم کے دل میں زخم
سوزن پلک کی تار نگہ سے سیے ہیں ہم

زمین میر شاکر ناجی ۱۱۴۲ھ

ہمیں یاد آتی ہیں کی باتیں اس گل رو کی رہ رہ کے
نہیں ہیں باغ میں مشتاق ہم بلبل کی چہہ چہہ کے

کرے گا قتل کس کو دیکھئیے وہ تیغ زن یارو
چلا آتا ہے اپنے ہاتھ میں قبضے کو کہہ کہہ کے

نشا ایسا ہوا اس کی نگہ کا جو نہیں تھمتے
ہمارے اشک جاتے ہیں چلے چشموں سے بہہ بہہ کے

ہم اس کا مسکرانا یاد کر رو رو کے ہنستے ہیں
نہیں مشتاق اب بازار کے خندوں کے قہہ قہہ کے

سخن میں فخر اپنا بن کیے رہتا نہیں ناجی
اسے سمجھائے حاتم کس طرح اشعار کہہ کہہ کے

زمین طرحی در ۱۱۴۳ھ

دل مرا مل کے بتاں ساتھ مسلماں نہوا
بت پرستی سے کبھو گبر پشیماں نہوا

کیا بڑا عیب ہے اس جامۂ عریانی میں
چاک کرنے کو کبھو اس میں گریباں نہوا

ذبح کرنے کو مرے عید کے دن نکلا تھا
ہائے کیا زور تھا، افسوس میں قرباں نہوا

آتش عشق سے دی اس کو ہزاروں آنچیں
تو بھی ایسا ہے یہہ دل سرد کہ بریاں نہوا

جی تو قرباں کیا اس ترک کماں ابرو پر
کیا کروں دل کو جو اس تیر کا پیکاں نہوا

درد ہجراں کو ترے وصل نے درماں بخشا
للہ الحمد کہ محتاج طبیباں نہوا

نزع کے وقت وہ حاتم نہوا بالیں پر
مرتے مرتے بھی میں شرمندۂ احساں نہوا

زمین طرحی ۱۱۴۳ھ

ترا دل یار اگر مائل کرے ہے تو جاں اب تجکو صاحب دل کرے ہے
تجلی کو نہیں تکرار ہرگز یہاں تکرار اب جاہل کرے ہے
رعایت بوجھ تو معشوقوں کا جور کہ تجکو عشق میں کامل کرے ہے
تو دنیا کی طلب میں دین مت کھو کوئی یہہ کام بھی عاقل کرے ہے
بڑی دشمن تری غفلت ہے ہر دم کہ تجکو موت سے غافل کرے ہے
کوئی دن کو چلے اور قاصد عمر یہہ رات اور دن میں دو منزل کرے ہے
کسی کو کام میں تیرے نہیں درک عبث حاتم کو تو شامل کرے ہے

زمین طرحی در ۱۱۴۳ھ

وھی ھے مرد اس عالم میں حس کے بیچ ھمّت ھے
کہ ھمت سے جہاں میں نام کو حاتم کے عزت ھے
گدا ھوں پر طمع رکھتا نہیں میں بادشاھوں سے
کہ دنیا دار (ھیں ؟) درویس کو دولت قناعت ھے
بلا وے قول پر وہ تو اسی دم جاں سے حاضر ھوں
وفاے وعدہ کرنا صادقوں کو عین راحت ھے
وہ تجھ میں چھپ رہا تو ڈھونڈھتا ھے جا بجا اس کو
غلط سمجھا ھے تو تنکے کے اوجھل دیکھ پربت ھے
دو عالم چھوڑ کر مانگے ھے تجھ سے تجکو اے پیارے
گدا ھونا تری درگاہ کا حاتم کو حرمت ھے

زمین طرحی در ۱۱۴۴ھ

ھم سے چھپا تو غیر سے جا روبرو ھوا
یاروں کا رو ھوا نہ رقیبوں کا رو ھوا
تیرا جمال خواب میں آیا تھا رات کو
کہیے کسو سے کیا جو ھوا جان سو ھوا
چشموں کی راہ دل مرا پانی ھو بہہ چلا
اس سروقد کے زیر قدم آب جو ھوا
وہ شوخ بانکپن میں جو دیکھا تو ایک ھے
تیغہ نگہ کا جس کو لگایا سو دو ھوا
اس رات زلف کو تری آشفتہ دیکھ کر
حاتم کا دل اسیر میاں مو بمو ھوا

زمین طرحی در ۱۱۴۴ھ

کوئی دیتا نہیں ہے داد بیداد — کوئی سنتا نہیں فریاد، فریاد

کہیں ہیں کیا بلا دام بلا ہے — تری زلفوں کو اے صیاد، صیاد

نہ رکھ امید آسائش جہاں میں — کہ ہے دنیا کی بے بنیاد، بنیاد

تجھے معشوقیت کے فن میں محبوب — کہیں ہیں عشق کے استاد، استاد

گئی غفلت میں ساری عمر حاتم — کہ جس سے خاک وہ برباد، برباد

زمین طرحی در ۱۱۴۴ھ[1]

طرفہ معجون ہے ہمارا یار — غیر سے ہمکنار ہم سے کنار

ہم کہیں باغ چل، تو ہاں نہ کہے — غیر کے ساتھ زور سیر و شکار

ہم کو مجلس میں دیکھ چپ ہو جائے — غیر سے ٹوک کر کرے گفتار

ہم کو دیکھے کہیں تو آنکھیں چرائے — غیر کو دیکھ آپ سے ہوئے دوچار

غیر سے صاف سینہ ہو کے ملے — ہم سے دل میں رکھے ہمیشہ غبار

غیر جور و جفا و بے مہری — ہم سے اس کا نہیں ہے اور شعار

غیر کی بات سن کے خوش ہووے — ہم سے ہر بات میں کرے تکرار

منت و عجز و انکسار و پیار — کرتے کرتے ہوئے بہت لاچار

وہ کسی طرح آشنا ہی نہیں — امتحاں ہم کیا ہے چندیں بار

ذرا بھی کان دھر کبھو نہ سنے — درد دل ہم کریں اگر اظہار

جان اور مال دے چکیں اس کو — دل سے چاہے اگر ہمیں غمخوار

جو رہے ہم سے زور بیگانہ — صحبت ایسے سے کس طرح ہو برآر

کر الٰہی تو مہرباں اس کو — جس کے پیچھے ہوئے ہیں زار و نزار

عرض اب شکوہ کب تلک کیجے — چپ ہی رہنا ہے حاتم اب درکار

---

(۱) کاتب نے اس غزل کا سنہ پہلے غالباً ۱۱۵۴ لکھا ہے، پھر ۵ کے ہندسے کو ۴ میں تبدیل کر کے ۱۱۴۴ بنایا ہے۔

زمین طرحی ۱۱۴۴ھ

عشق کی یارو نہیں آسان سرط اس میں دینا ہے گا اول جان شرط
آہ سرد و رنگ زرد و سر نکف چشم گریان و دل بریان شرط
دیکھ تو ہم کس طرح کھوتے ہیں جی ہم سے کچھ بدتے ہو تم اے جان شرط
خوبصورت دو بہت ہوں گے ولے حسن میں ہے گی ادا و آن شرط
حاتم اس کے ہونٹھ اصلی لال ہیں اس کے تئیں کھانا نہیں ہے پان شرط

زمین طرحی در ۱۱۴۴ھ

کسو کو آپ سے گر آشنا کرے معشوق
تو پہلے اس کو سبھوں سے جدا کرے معشوق
قسم ہے یار مجھے اس گھڑی کوئی نہ جیے
جو برقع موبہ سے اٹھا کر ادا کرے معشوق
حرم کو چھوڑ کے اس دم طواف دل کا کروں
جس آن آکے مرے دل میں جا کرے معسوق
تو اپنے یار کا حاتم کرے ہے شکوہ عبث
برے نصیب برے ہوں تو کیا کرے معسوق

زمین شاہ مبارک آبرو در ۱۱۴۴ھ

یکایک ہو گیا ایسا جدا دل نہ تھا گویا کبھو یہہ آشنا دل
کبھو دیکھے سے یہہ ہوتا نہیں سیر ہوا ہے اس قدر میرا گدا دل
گیا دل ہاتھ سے پانا ہے مشکل مگر دے، گم ہوا پھر گر خدا دل
تب ہوئے روبرو محبوب کی شکل جب ہو آئینہ سا تیرا صفا دل
خودی کو چھوڑ آ حاتم خدا دیکھ کہ ترا رہنما ہے شاہ بادل

زمین طرحی در ۱۱۴۴ھ

دیکھ بساد رب کی، آدم ہے جان لے گا اگر تو محرم ہے
سب صفت اس کی دیکھ لے اس میں کچھ تو بندا خدا سے کیا کم ہے
ہر نفس یوں کہیں ہیں صاحب دم کہ جہاں بیچ عمر دو دم ہے
پاس ہے اور نظر نہیں آتا میرے وحشی میں اس قدر رم ہے
تیرے بندے ہیں سب، ولے سب میں بندۂ کمترین حاتم ہے

زمین طرحی در ۱۱۴۴ھ

دل کی اس بات پر گواہی ہے ہر طرف مظہر الٰہی ہے
جن نے بوجھا ہے اس سخن کو یقیں اس کو عرفاں کی بادشاہی ہے
اس کو روشن ہو کس طرح یہ حرف جس کے دل کے اوپر سیاہی ہے
جو کہ آیا رباط دنیا میں سو مسافر مثال راہی ہے
اے قدر داں کمال حاتم دیکھ عاشق و شاعر و سپاہی ہے

زمین سراج الدین علی خاں آرزو ۱۱۴۴ھ

گر کب کی اس قدر اے مست تجکو کیا ستابی ہے
ہمارا بھی دل صد لخت دوکاں کبابی ہے
نہیں جز قرص مہر و ماہ کچھ گردوں کے مطبخ میں
سو وہ بھی ایک گردا[1] سوختہ اور ایک آبی ہے
چھڑا مشاطہ زلف یار کو شانے کے پنجے سے
کہ اس کی کشمکش سے دل کو میرے پیچ و تابی ہے
بدن پر کچھ مرے ظاہر نہیں اور دل میں سوزش ہے
خدا جانے یہہ کس نے راکھ اندر آگ دابی ہے
شکست آتی ہے اس میں موج مے سے دیکھیو ساقی
بچانا ٹھیس سے شیشہ مرے دل کا حبابی ہے

---

(۱) نان (مجموعہ نغز)۔

رھے ھے کام ھم کو روز و شب قرآن و مسجد سے
کہ ابرو اس کی ھے محراب اور چہرہ کتابی ھے
کسو کے ابلق ایام چڑھنے کا نہیں راضی
ازل سے حاتم اس توسن میں عیب بد رکابی ھے

زمین طرحی در ۱۱۴۵ھ

حسرت تھی مجھے یار نہ دیکھا تھا سو دیکھا
مدت سے وہ دیدار نہ دیکھا تھا سو دیکھا
چشموں سے برستے ھیں مرے اشک کے موتی
یہ ابر گہر بار نہ دیکھا تھا سو دیکھا
آنکھوں کو نظر کر کے تیری سارے جہاں میں
ھم آپ سا بیمار نہ دیکھا تھا سو دیکھا
عصیاں کے سوا کام نہیں اس کو کسی سے
حاتم سا گنہگار نہ دیکھا تھا سو دیکھا

زمین طرحی ۱۱۴۵ھ

مو منھ سے ٹک دور کر نقاب کے تئیں لے غلامی میں آفتاب کے تئیں
تو نے اپنے دکھا کے رخسارے غرق شبنم کیا گلاب کے تئیں
شوق میں جوں کہ دیدۂ تصویر یوں ترستی ھیں چشم خواب کے تئیں
دل سوزاں سے آج حاتم کے مت مقابل کرو کباب کے تئیں

زمین طرحی در ۱۱۴۵ھ

کروں قربان جی کو اس گھڑی اس وقت اس پل کے
کہ جس دم ناز سے وہ یار آوے گھر مرے چل کے
جہاں کے خوبصورت ، دیکھ اس مورت کو مجلس میں
ھوے خاموش حیرت سے گویا پتلے تھے سب کل کے

ہمیں کیونکر نہ آوے خواب راحت بستر غم پر
کف پا کا تصور اس کے گل تکیے ہیں مخمل کے
تصدق ہوں میں اپنے رات دن اوقات کے اوپر
اس آہ متصل کے اور اس اشک مسلسل کے
دیکھو حاتم صنم ہر آن پر قربان جاتا ہے[1]
تری سج کے، اکڑ کے، چال کے، اور زلف کے بل کے

زمین شرف الدین مضمون ۱۱۴۶ھ

نہ اتنا چاہیے اے پر شکم خواب — کہ تیرے حق میں ہے ظالم ستم خواب
خیال ماہ رو میں تا دم صبح — نہ آتا رات مجکو ایک دم خواب
کہو تو کس طرح آوے وہاں نیند — جہاں خورشید رو ہو آکے ہمخواب
پلک لگتے نہیں، کیا اڑ گیا ہے — نصیبوں کا ترے اے چشم نم خواب
ہمیں بہتر ہے سونا جاگنے سے — بھلاتا ہے ہمارا درد و غم خواب
کہے تھا رات کو حاتم سے مضمون — مجھے مخمل اوپر آتا ہے کم خواب

زمین طرحی در ۱۱۴۶ھ

دل کو مارا چشم نے ابرو کی تلواروں سے آج
کیوں اڑے تھا جا کے یہ ہشیار میخواروں سے آج
کوئی بتلاتا نہیں عالم میں اُس کے گھر کی راہ
مارتا پھرتا ہوں اپنے سر کو دیواروں سے آج
دل میں کچھ سوچ پر ہیں کچھ پہ دیکھ کر وضع دو رنگ
پھر گیا حاتم کا دل اس دور کے یاروں سے آج

(۱) "تری ہر آن پر حاتم سخن! قربان جاتا ہے" (چمنستان شعرا، شفیق)

زمین طرحی در ۱۱۴۶ھ

نہ پھول اب اس قدر بلبل گلوں کی آشنائی پر
کہ سب اہل چمن ہنستے ہیں تری احمقائی پر
صنم نے یاد کر نامہ لکھا اور ہم رہے غافل
بجا ہے معذرت لکھیے جو قرطاس خطائی پر
شکست دل کو میرے کام کیا تریاق سے ظالم
خیال حال تیرا چرب ہے گا مومیائی پر
سراپا چسم حیرت ہو گیا آئینہ حسرت سے
نطر کرتے تیرے آینۂ رو کی صفائی پر
تری قدرت کا مظہر دیکھ کر ہر آن میں حاتم
ہوا ہے جان سے قربان آ تری خدائی پر

زمین طرحی در ۱۱۴۶ھ

آشنائی کر کے تجھ بد خو سے پچھتائی ہے طبع
بے مروت بے وفا سن سن کے گِن کھائی ہے طبع
غیر کی صحبت سوا تجکو نہ دیکھا ' اور جا
ہرزہ گردی میں تری اس درجہ ہرجائی ہے طبع
غصہ ہی کرتے ہو تم ہر یک سے ہر یک بات میں
اے مرے صاحب تمہاری کس طرف آئی ہے طبع
ایک مدت سے سخن کہنے میں ہم خاموش تھے
پھر تری صحبت ہماری شعر پر لائی ہے طبع
دوستی اُس شوخ سے اب کس طرح حاتم نبھے
تندھی اس کا مزاج اور میری سودائی ہے طبع

واردات ۱۱۴۶ھ

ہے یاد دشمنوں میں اگا ہم نے گھات کو
کیا کیا مرے لیے تھے جہاں چھپ کے رات کو
وہ رمز دل فریب تری اب تلک ہے یاد
بیڑا بنا کے پھینکنا بیڑی کے پات کو
اس وقت دل مرا ترے پہنچے کے بیچ تھا
جس وقت تو نے ہات لگایا تھا ہات کو
حاتم کو کیا کہوں کہ حضر بھی گیا ہے بھول
ترے لبوں کی چاہ میں آبحیات کو

۱۱۴۶ھ

کہیں وہ صورت خوباں ہوا ہے ۔۔۔ کہیں وہ عاشق حیراں ہوا ہے
کہیں گل ہے، کہیں بلبل، کہیں باغ ۔۔۔ کہیں درد (اور) کہیں درماں ہوا ہے
کہیں مست و کہیں ہشیار ہے وہ ۔۔۔ کہیں دانا کہیں نادان ہوا ہے
کہیں خاک و کہیں باد و کہیں آب ۔۔۔ کہیں وہ آتش سوزاں ہوا ہے
کہیں لفظ و کہیں معنی کہیں حرف ۔۔۔ کہیں پوتھی کہیں قرآں ہوا ہے
کہیں نور و کہیں ایمن کہیں طور ۔۔۔ کہیں موسیٰ کہیں عمران ہوا ہے
کہیں مسجد کہیں بتخانہ ہے وہ ۔۔۔ کہیں کفر و کہیں ایماں ہوا ہے
کہیں خلق و کہیں خلّاق عالم ۔۔۔ کہیں ظاہر، کہیں پنہاں ہوا ہے
کہیں حاتم، کہیں جاں بخش حاتم ۔۔۔ کہیں حاتم کا جا مہماں ہوا ہے

زمین طرحی در ۱۱۴۶ھ

تری بھواں کی تیغ جب آئی نظر مجھے
کرنا ہوا ضرور میاں ترک سر مجھے

زینت ہے عاشقوں کو لب خشک و چشم تر
حاصل ہوئی ہے سلطنت بحر و بر مجھے
باریک بیں ہوں مجھ سے کہو اس میاں کی بات
رھتا ہے سکہ دل میں خیال کمر مجھے
بیخود ہوں اس قدر کہ نہیں دل کو شوق مے
اس مست کی نگہ کا ہوا ہے اثر مجھے
میں کوہ و دشت ایک قدم میں کیا ہے طے
مجنوں و کوہ کن کی نہیں کچھ خبر مجھے
جب سیمبر کے غم سے ہوا رنگ ہوں طلا
تب سب نے حا عزیز کیا مثل زر مجھے
حاتم ہوا ہوں آل نبی کی پناہ میں
دنیا و دیں کے غم سے نہیں کچھ خطر مجھے

زمین طرحی در ۱۱۴۷ھ

جس کو ہے گلعذار کی حسرت — کب ہے اُس کو بہار کی حسرت
آ گئی مرگ وہ نہ آیا حیف! — رہ گئی دل میں یار کی حسرت
ہے گی دشت جنوں میں مدت سے — میرے پاؤں کو خار کی حسرت
ہے چمن بیچ دل میں لالا کے — اس دل داغدار کی حسرت
تجھ سے رکھتا ہے جان من حاتم — جی میں بوس و کنار کی حسرت

زمین طرحی در ۱۱۴۷ھ

چاھتا ہوں دوں تری خدمت میں آ کر التماس
اپنے صاحب کو میاں دیتا ہے چا کر التماس

حو زبانی اس سے کہتا ہوں تو وہ سنتا نہیں
اب مجھے لازم ہوا دیجے لکھا کر التماس

شمع کو کب ہے دماغ اُس پر کرے جو مہر داغ
عرض گو سو سو کرے پروانہ لا کر التماس

وہ تغافل پیشہ میرے کام کو پھینکے ہے دور
طاق نسیاں پر رکھے ہے گا پڑھا کر التماس

مطلب پنہاں ہمارا دوستاں ظاہر نہو
دشمنوں کے رو برو دیجا چھپا کر التماس

معنی و الفاظ رنگیں سے ہمارا مدعا
ہے کوئی ایسا کہ لکھ دیوے بنا کر التماس

شکر کر حاتم کہ وہ مانگے ہے تیرے ہاتھ سے
مہرباں ہو کر توجہ سے بلا کر التماس

زمین طرحی در ۱۱۴۷ھ

ہوبا سبھوں کو اس کے ہے تابع رضا کا فرض
بندے سے گو ادا نہیں ہوتا خدا کا فرض

پروا نہیں ہے اُس کے تئیں گو ہمیں تو ہے
لکھنا کتابتوں میں سلام و دعا کا فرض

دل کا نہیں رہی بڑھاپے میں غیر آہ
پیری میں ہے ضعف کو رکھنا عصا کا فرض

میں تم کو چھوڑنے کا نہیں زندگی تلک
ملنا ہے آشنا کے تئیں آشنا کا فرض

حاتم تمام عمر تو رونے سے مونہہ نہ پھیر
ماتم ہے دوستوں کو شہہِ کربلا کا فرض

زمین طرحی در ۱۱۴۷ھ

عشق کے ہے گھائلوں کو غم سے فیض
ان کے زخموں کو نہیں مرہم سے فیض

عاشقی کے فن میں ہیں استاد ہم
لے گئے فرہاد و مجنوں ہم سے فیض

مست ہونے کو تری بس ہے نگاہ
ہم نہیں (چاہیں) ہیں جام جم سے فیض

ابر کو پہنچا ہے جا افلاک پر
اب ہمارے دیدۂ پر نم سے فیض

مر گیا تو کیا ہے مردے سے امید
جیتے جی ہر ایک کے ہے دم سے فیض

کوئی نہیں آتا کسو کے کام اب
اٹھ گیا ہے اس قدر عالم سے فیض

فیض کے کوئی نام سے واقف نہ تھا
ہے جہاں میں نامور حاتم سے فیض

زمین طرحی در ۱۱۴۷ھ

اے پری دل کو ترے عشق میں حیرانی ہے
یک نظر اس کو تری قید سلیمانی ہے

ہائے بے درد سے میں دل کو لگایا تھا کیوں
اب تلک جس کی مرے دل میں پشیمانی ہے

میں نے جس روز سے دیکھے ہیں ترے بال کھلے
مو بمو مجکو اسی دن سے پریشانی ہے

حب سے آزاد ھوا ھوں نہیں ھوں بند قبا

کہ خدا ساز مرا جامۂ عریانی ھے

تجھہ دنیا کے کبھو حسن پہ حاتم مت بھول

نفس کو پھیر کہ یہہ خطرۂ شیطانی ھے

زمین شیخ شرف الدین مضمون ۱۱۴۷ھ

تو اپنا مت لگا دے سرو سے جاجا من القمری

ابھی تو طوق ھے پر اب کٹے گی گردن القمری

مجھے اور تجکو آوے عشق میں کیونکر بن القمری

کہ میں ھوں عاشقی میں مرد اور تو ھے زن القمری

مجھے ھے رشک طالع سے کہ بے مُل گل کو کیا دیکھوں

تجھے ھے عید سیر گلشن اور مجکو زن القمری

گلے میں ھے سمور اور سر میں جاما فاختائی ھے

دکھائی کس کو ھے گلشن میں اپنا جوبن القمری

ھمارے تو وھی ھے کہنہ خرقہ اب تلک سو بھی

ھزاروں جا گریباں چاک ھے تا دامن القمری

تجھے اور اس کو راہ عشق میں دونا تفاوت ھے

کہ تو ھے باغ میں' حاتم پھرے ھے بن بن القمری

زمین طرحی در ۱۱۴۷ھ

درکار کب ھے عشق میں نام و نگیں مجھے

بس ھے یہہ نقش نام ترا دل نشیں مجھے

ساماں گریہ بس ھے یہی زندگی تلک

ھر آن گوشۂ بغل و آستیں مجھے

کس طرح سے گذار کروں راہ عشق میں
کانٹے ہے اب ہر ایک قدم پر زمیں مجھے
دیکھوں ہوں تجکو دور سے بیٹھا ہزار کوس
عینک نہ چاہیے نہ یہاں دوربیں مجھے
جو صبر میں کیا سو کسی سے نہ ہو سکا
ایوّب ہے کہاں جو کہے آفریں مجھے
آتا ہے یاد جب تری دشنام کا مزا
ہوتا ہے زہر کام میں جوں انگبیں مجھے
بہتا پھروں ہوں جس کے تصور میں رات دن
دریا کی موج ہے تری چیں جبیں مجھے
جنت کا کب دماغ ہے زاہد کہ کوئے یار
موجود ہے بہشت کی جاگہہ نہیں مجھے
یا رب ہوا ہوں خلق کی نظروں میں نا قبول
ترے بغیر در کے نہیں جا کہیں مجھے
تو ہی مری پناہ، تجھی سے مرا نباہ
بن تیرے اب نگاہ کسی پر نہیں مجھے
قدموں لگا ہوں میر محمد امیں کے میں
حاتم نہیں جہاں میں کمی اور غمیں مجھے

زمین طرحی در ۱۱۴۸ھ

یار سوتے آ جگاتا ہے مجھے ہو جور صبح
آسماں اوپر سے جوں بارش کرے ہے نور صبح
رات کو جاری رہیں اور دن کو ٹک ہوتے ہیں بند
چشم کے ناسور کو ہے مرہم کافور صبح

ہم نے پایا ہے خیال زلف کی شب میں وصال
حسر تک ہونے نہ دوں گا اپنی تا مقدور صبح
کیونکہ اس خورشید کو دیکھے جو ہو تاریک دل
رات دن کا فرق ہے ظلمات سے پر دور صبح
زلف کی شوخی میں مونہہ اُس کے پہ حاتم کیا کہوں
حوش نہیں لایا زباں پر رات کا مذکور صبح

زمین طرحی در ۱۱۴۸ھ

کرے ہے پاؤں کی جا پہلے اپنا سر غواص
نکال لاوے ہے تب بحر سے گہر غواص
گذر کے جان سے سر رشتہ دے کے دوست کے ہاتھ
چلا ہے قعر میں دریا کے بے خطر غواص
بوقت غوطہ آسے چسم بند مت جانو
رکھے ہے کام پر اپنے یہاں نظر غواص
یہہ راہ سر سے چل، اور مت بکے، خموش ہو جا
یہاں نکال نہ دم، مونہہ کو بند کر غواص
لے معرفت کے تو دریا کے دُر کو اے حاتم
خدا کرے تجھے اس بحر کا اگر غواص

زمین طرحی در ۱۱۴۸ھ

ہوا ہے بحر معانی کا دل مرا غواص
دُر سخن کو وہ لے ہم سے جس میں ہو اخلاص
ہے ابر آج چلو باغ میں شراب پئیں
وہاں چنار ہے دستک زن اور ہوا رقاص

کیا ہو قتل تو عاشق کو کچھ نہ لادل میں
بھلا کیا ہو کیا قید زندگی سے خلاص

ہے تیرے حسن کی اب شان بزم میں اور ہی
تو جیسے شاہ ہے اور خوب رو ترے ہیں خواص

تمام ہند میں دیواں کو ترے حاتم
رکھے ہے جاں سے اپنی عزیز عام اور خاص

زمین طرحی در ۱۱۴۸ھ

اس بے وفا نے چھوڑ کے یاروں سے ارتباط
پیدا کیا ہے جا کے ہزاروں سے ارتباط

نخچیر دل کا کیونکہ بچے بن ہرن سے آج
اس نے کیا ہے سحر شکاروں سے ارتباط

ناصح تو اس کے ملنے سے مانع نہ ہو مجھے
کوئی بھی چھوڑتا ہے پیاروں سے ارتباط

دیکھی کسو نے اب مرے دل کی فسونگری
کیونکر کیا ہے زلف کے ماروں سے ارتباط

ڈرتا نہیں ہے خال و خط و چشم و زلف سے
حاتم کو ہے قدیم سے چاروں سے ارتباط

زمین طرحی ۱۱۴۸ھ

میں ذات کا اُس کی آشنا ہوں ہر ایک صفات پر فدا ہوں
افسوس کہ آپ کو میں اب تک معلوم نہیں کیا کہ کیا ہوں
ہے عین زوال میں ترقی مجکو کہ گل دوپہریا ہوں
حیرت ہے مجھے بھی کہ (میں) اُس بن کس طرح سے اب تلک جیا ہوں
کرتا میں نہیں خوشامد خلق حاتم ہوں ازل سے بے ریا ہوں

زمین طرحی در ۱۱۴۸ھ

غنچہ سے کیا ہے نسبت ایسا لب و دہاں ہے
جس کی صفت میں گارو ہر برگ گل زباں ہے

کچھ ان دنوں میں ہم سے ترا ہی دل پھرا ہے
ورنہ وہی زمیں ہے اور وہ ہی آسماں ہے

حاجت چراغ کی ہے کب انجمن میں دل کی
مانند شمع روشن ہر ایک استخواں ہے

ڈر سے مخالفوں کے دل میں تری محبت
مخفی رکھوں ہوں جیسے غنچے میں بو نہاں ہے

دل کی مرے حقیقت کیا پوچھتے ہو یارو
یا حسرت یہاں ہے یا یاد رفتگاں ہے

مختار کیوں نہ ہووے وہ اپنے ہمسروں میں[1]
حاتم کا قدر داں اب نوّاب امیر خاں ہے

زمین طرحی در ۱۱۴۸ھ

اب کے چمن میں گل کا بے نام و بے نشاں ہے
فریاد بلبلاں ہے یا شہرۂ خزاں ہے

ہم سیر کر جو دیکھا روئے زمیں کے اوپر
آسودگی کہاں ہے جب تک یہ آسماں ہے

ہم کیا کہیں زباں سے آپ ہی تو سن رہے گا
شکوہ ترے ستم کا ظالم جہاں تہاں ہے

مدت ہوئی کہ مر کر میں خاک ہوگیا ہوں
جینے کا بد گماں کو اب تک مرے گماں ہے

---

(۱) حاشیے میں: ع وہ سر بلند ہوئے کیونکر نہ ہمسروں میں

ہولی کے اب بہانے چھڑکا ہے رنگ کس نے
نام خدا تجھ اوپر اس آن عجب سماں ہے
مکرے سے فائدہ کیا رندوں سے کب چھپی ہے
کیا حاجت بیاں ہے جو کچھ ہے سب عیاں ہے
رنگ گلال مونہہ پر ایسا بہار دے ہے
جوں آفتاب تاباں زیر شفق نہاں ہے
کیسر میں اس طرح سے آلودہ ہے سراپا
سنتے تھے ہم سو دیکھا تو شاخ زعفراں ہے
آپ ھی میں دیکھ حاتم وحدت کے بیچ کثرت
تو ایک و انک جا ہے اور دل کہاں کہاں ہے

زمین طرحی در ۱۱۴۸ھ

یہہ کالی زلف ترے مونہہ اوپر ایسے لٹکتی ہے
کہ دل میں پیچ کھا کھا ناگن اپنا سر پٹکتی ہے
کبھو تو رو تو اس کوجا ک اوپر جاکے اے لیلیٰ
کہ بن پانی جنگل میں روح مجنوں کی بھٹکتی ہے
جنوں نے اس قدر ہلکا کیا ہر یک کی نظروں میں
کہ میرے ھاتھ سے اپنا خرد دامن جھٹکتی ہے
مزا جینے کا کچھ ہم کو نہیں بن اس کے اے حاتم
ہماری سانس جی میں پھانس سی ہر دم کھٹکتی ہے

زمین طرحی ۱۱۴۸ھ

تو اس مزے سے چمن میں کرے ہے مے نوشی
کہ دل میں تازہ ہوئی حسرت ہم آغوشی

زبان شمع سے روشن ہوا مجھے یہہ حرف
کہ سر کٹے تو نہ کھیٹے بھلی ہے خاموشی
خدا کرے کہ یہہ دونو کے بیچ مبارک ہو
مجھے تو یاد تری اور تجھے فراموشی
کسو کے دانت کا مونہہ پر ترے ہوا ہے نشاں
کہ آئینہ سے جو کرتا ہے آج رخ پوشی
مخالفوں کو کرو دور آج مجلس سے
کہ حاتم اس سے ہے اس وقت مجکو سرگوشی

زمین طرحی در ۱۱۴۸ھ

وہ رکھے ہے رات دن جوں جان مجھے   جس اوپر دیتا ہے جان آساں مجھے
اور بھی ہوں جوں کمان حلقہ بگوش   اپنے اوپر گر کرے قرباں مجھے
اس گل رنگیں کے آگے چشم میں   خار سے لگتے ہیں سب خوباں مجھے
جو رکھے اس کے سلامت ہند میں   حسن سے خوش لگتا ہے ہندستاں مجھے
ہوں تو حاتم، لیکن ہر دم لطف سے   مول لیتا ہے گا واخر جان مجھے

زمین طرحی در ۱۱۴۹ھ

دیکھ کر اس کا دھن اور سن کے وہ شیریں نکات
کان میں بلبل کے خوش لگتی ہیں غنچے کی بات
وصف آنکھوں کا لکھا ہم نے (تو ؟) گل بادام پر
کرکے نرگس کو قلم اور چشم آہو کی دوات
خوب سا اس کا پیوں لوھو اگر پاؤں کبھو
خوں ہوا ہے دل مرا ظالم تری مہندی کے ہات
جی اٹھوں پھر کر اگر تو ایک بوسہ دے مجھے
چوسنا لب کا ترے ہے مجکو جوں آب حیات

باغ دنیا میں نہیں بیکار حاتم ایک خس
ذکر کرتا ہے خدا کی یاد میں ہر پات پات

زمین طرحی در ۱۱۴۹ھ

پھولا ہے ترے حسن کا اے گلعذار باغ
کرتا ہے تجھ اوپر زر گل کو نثار باغ
گلدستۂ بہار ہے تو سر سے پاؤں تک
ہر عضو پر کروں ترے قرباں ہزار باغ
یکساں تری بہار رہے ہے تمام سال
کرتا ہے گر بہار ہو فصلِ بہار باغ
گر جائے باغ میں تو گلوں کی طرف نہ دیکھ
یہہ دیکھ ہو رہا ہے دل داغدار باغ
تیرے دھان وغبغب و رخسار ولب کو دیکھ
حاتم کا دل کرے ہے میاں سیر چار باغ

زمین طرحی در ۱۱۴۹ھ

بندہ اگر جہاں میں بجائے خدا نہیں
لیکن نظر کرو تو خدا سے جدا نہیں
نقطے کا فرق ہے گا خدا اور جدا میں دیکھ
صورت میں گر چھپا ہے بمعنی چھپا نہیں
ہر شے کے بیچ آپ نہاں ہو عیاں ہوا
دیکھا تو ہم نے اس سا کوئی خود نما نہیں
حیران عقل کل کی ہے اُس کی صفت کو دیکھ
سب جا میں جلوہ گر ہے وہ اور ایک جا نہیں

لذت چکھا کے دل کے تئیں ھجر و وصل کی
حاتم سے مل رہا ہے اور اب تک ملا نہیں

زمین طرحی در ۱۱۴۹ھ

بجا ہے گر کروں صدقے تری آنکھوں اوپر آنکھیں
کہ مجکو اب دلک ایسی نہیں آئیں نظر آنکھیں
ھمیشہ بحر و بر کی سیر کرتا ھوں میں گھر بیٹھے
فغاں سے خشک ھیں لب اور رونے سے ھیں تر آنکھیں
رہے نئیں ھوش ان میں بات کہیے کا ترے آگے
دکھا دے جا کے میخانے میں مستوں کو اگر آنکھیں
دغا داری نہیں اُس کے اگر دل میں تو اے یارو
چراتا کیوں ہے ہم سے مخلصوں سے دیکھ کر آنکھیں
نکل کر تن سے جاں اب لب اوپر پہنچا ہے اے حاتم
یہی ہے دل میں اُس کو دیکھ لوں اس وقت بھر آنکھیں

زمین طرحی در ۱۱۴۹ھ

لب و دندان کے تیرے صدقے
مسی اور پان کے ترے صدقے
جامہ زیبوں کو کروں عالم کے
دور داماں کے ترے صدقے
خوش اداؤں کو بجا ہے تجھ پر
ھوں اگر آن کے ترے صدقے
نرگس ھوتی ہے گلستاں میں بچشم
چشم فتان کے ترے صدقے
دل مرا جس کا ھوا ہے پیکاں
تیر مژگان کے ترے صدقے
حاتم عاشق ہے تری ھستی پر
بستہ مسکان کے ترے صدقے

زمین طرحی در ۱۱۴۹ھ

لب مرجان کے ترے صدقے
در دندان کے ترے صدقے

وعدہ کر ہم سے، نہ آیا، جھوٹے ساختے پیمان کے ترے صدقے
دل و دیں لے کے قسم کھا جانا ایسے ایمان کے ترے صدقے
ہاتھ میں جام مے و شیشہ کھلے جان اس آن کے ترے صدقے
تو نے حاتم کو کیا اپنا غلام ایسے احسان کے ترے صدقے

زمین طرحی در ۱۱۵۰ھ

میری بغل میں رات وہ مست شراب تھا
حسرت کی آگ میں دل دشمن کباب تھا
وقت سحر چمن میں وہ گل بے نقاب تھا
ہر ذرہ اس کی تاب سے جوں آفتاب تھا
ہر حال اپنے حال کے تئیں بوجھ مغتنم
آئندہ ہے خیال جو گذرا سو خواب تھا
نامے کو میرے دیکھ کے خاموش ہو رہا
قاصد کے تئیں جواب ندینا جواب تھا
واصل ہوا جو بحر میں خود بحر ہوگیا
وہم حباب پردۂ چشم حباب تھا
مجلس میں رات گریۂ مستاں تھا تجھ بغیر
ساغر بھرا شراب کا چشم پر آب تھا
رخصت تو آئینے کو نہ تھی اس کے رو برو
حاتم تو کس طرح سے وہاں باریاب تھا

زمین طرحی در ۱۱۵۰ھ

مست کو کب ہوے گھر جانے کا ہوش
ہے اُسے دن رات میخانے کا ہوش

اس طرح شیشے اڑاتے ہو کہ آج
دیکھ کر جاتا ہے پیمانے کا ہوش
شمع مجلس ہو کے وہ بیٹھا ہے مست
کیوں نہ اڑ جاوے گا پروانے کا ہوش
آج میرے گھر میں متوالے کے تئیں
کس طرح یہ آ گیا آنے کا ہوش
میکدے کے در پہ حاتم گر پڑا
ہے کسو کے تئیں اٹھا لانے کا ہوش!

زمین طرحی در ۱۱۵۰ھ

تیری آنکھوں کا دیکھ میخانہ ہو گیا سب جہان مستانہ
شمع رو پاس، مہر داغ کے تئیں التماسی تھا رات پروانہ
شوخ کے کثرت تصور سے شیشۂ دل ہوا پری خانہ
مو بمو زلف کے خیالوں میں میری مژگاں بنی ہیں جوں شانہ
حیف حاتم کو تو نجانا جان آشنا ہو، ہوا ہے بیگانہ

زمین طرحی در ۱۱۵۱ھ

کس نے شب دارو پلا کر تجھے مخمور کیا
کہ تری چشم گلابی نے مجھے چور کیا
صندلی رنگ نے آ تیغ نگہ سے اس دم
درد سر تھا سو مرے سر سے بھلا دور کیا
عشق پردے میں تھا اس چشم کا ہو خانہ خراب
حسن نے رو رو کے اب حاتم مجھے مشہور کیا

زمین طرحی در ۱۱۵۱

نکلے اگر جہاں میں سحرگاہ آفتاب
چھپ جائے دیکھ کر تجھے اے ماہ آفتاب

آ کر تری گلی میں قدم بوس کے لیے
پھر آسماں کی بھول گیا راہ آفتاب
آتا ہے صبح اُٹھ کے زیارت کے واسطے
گھر کو تمھارے جان کے درگاہ آفتاب
حاتم سحر سے شام تک حاضر رہے ہے دیکھ
ہے اُس کے چاکروں میں ہوا خواہ آفتاب

زمین طرحی در ۱۱۵۱ھ

مارا ہے مجکو یار نے دکھلا کے رنگ سرخ
تعویذ میری گور کا لازم ہے سنگ سرخ
جھڑپاوتا ہے سب کو نگاھوں میں آج لال
چاھے ہے دیکھنے کو بہانے سے چنگ سرخ
پنڈا دکھا کے اس دل پر خوں کو ڈور کر
کس پیچ سے صنم نے اُڑایا پتنگ سرخ
کیونکر نہ قتل عام ہو حاتم جہاں میں
نو روز اس برس کا پڑا ہے برنگ سرخ

زمین حسب الفرمائش عنایت اللہ خاں راسخ در ۱۱۵۱ھ

ہم نجانے تھے کہ ہے وعدۂ خوباں برباد
انتظاری میں گیا مفت مرا جاں برباد
حیف اس دل نے کیا عشق پری رویاں کا
حس ہوا میں گیا ہے تخت سلیماں برباد
چھوڑ تسبیح ہوا دل مرا زنار پرست
زلف کافر نے کیا خانۂ ایماں برباد

چاہ میں اس لب جاں بخش کی اسکندر نے
ہاتھ سے اپنے دیا چشمۂ حیواں برباد
عشق کے آج بیاباں کا وہی مجنوں ہے
جو بگھولے کی طرح دے سر و ساماں برباد
ہر قدم عمر چلی جاتی ہے ایسی حاتم
جیسے جاتی ہے اڑی ریگ بیاباں بر باد

زمین طرحی در ۱۱۵۱ھ

اس زمانے میں ہمارا دل نہو کیونکر اداس
دیکھ کر احوال عالم اڑتے جاتے ہیں حواس
بس رہا ہے بو سے تیری جان بن ایسا دماغ
بے دماغ ہم کو رکھے ہے باغ میں پھولوں کی باس
جس طرف جاوے تو اے سرو رواں سائے کی طرح
ہر قدم میں بھی ہوں ترے ساتھ ساتھ اور پاس پاس
تشنگی سے چاہ کی تیری نہیں سیراب دل
ہے مثل مشہور مستسقی کی نئیں بجھتی ہے پیاس
حق سے ملنا گیروے کپڑوں اوپر موقوف نئیں
دل کے تئیں رنگو(۱) میری یہہ ہے اور سب ہے لباس
کُنہہ ذات حق کو کیا پاوے کوئی حاتم کبھو
سب کے عاجز ہیں یہاں وہم و گماں، فہم و قیاس

زمین طرحی در ۱۱۵۱ھ

کس کنے لے جائیں تیرے ظلم کی فریاد ہم
تجھ ہی سے تیرے ستم کی چاہتے ہیں داد ہم

بحر و بر میں ہے ہماری شہرت دیوانگی
عاشقی کے کام میں مجنوں کے ہیں اُستاد ہم
سو کھ کر کانٹا ہوے پنجرے میں تب چھوڑے ہےتو
اب کہاں جاویں یہہ لے کر مشت پر صیاد ہم
سب سے پہلے سب گنہگاروں میں جی دینے کو آج
سر سے حاضر ہیں تری خدمت میں اے جلاد ہم
دو سہ آیا اُس طرف جس جا ہوے ہم فرش راہ
مفت خاک اپنی کو ہاتھوں سے دیا برباد ہم
ہے دیکھو گردن میں طوق بندگی قمری کی طرح
کس طرح ہوں قید سے اُس سرو کی آزاد ہم
ہند کے ہندو بچوں سے دل لگا کر اور شہر
کیونکہ جاویں چھوڑ حاتم شہ جہاں آباد ہم

زمین طرحی در ۱۱۵۱ھ

کون دل ہے کہ ترے درد میں بیمار نہیں
کون جی ہے کہ ترے غم میں گرفتار نہیں
کون (وہ دیر)[۱] کہ تجھ بت کی نہیں ہے پوجا
کون مسجد ہے کہ تجھ درس کی تکرار نہیں
کون خوش رو ہے کہ تجھ رو کا نہیں ہے طالب
کون طالب ہے کہ تجھ سے کا طلب گار نہیں
کون صوفی ہے کہ تجھ مے سے نہیں ہے مدھوش
کون کیفی ہے کہ تجھ کیف سے (سرشار)[۲] نہیں

---

(۱) مخطوطے میں ''دھرا ہے''۔
(۲) مخطوطے میں ''ھشیار''۔

کون کہتا ہے کہ حاتم کو نہیں تجھ سے پیار
کون کہتا ہے کہ حاتم سے تجھے پیار نہیں

در ۱۱۵۱ھ

اکثر کر حسن گھڑی، یہہ نوجوان تل تل کے چلتے ہیں
قدم کی خاک اُن کے عاشق اپنے موہہ سے ملتے ہیں
عجب صحبت ہے ان سے کس طرح صحبت برار آوے
کبھو نظروں میں چھلتے ہیں کبھو آنکھیں بدلتے ہیں
عرق اس کو نہ کہیے جو بری زلفوں سے ٹپکے ہے
یہہ کالے ناگ ہیں اور موہہ سے اپنے زہر آگلتے ہیں

فرمائشی در ۱۱۵۱ھ (مصرع اول انورالدولہ بہادر)

چڑھی ہیں غم کی فوجیں کون ہے جو روبرو آوے
نہیں کوئی اور عالم میں مگر آوے تو تو آوے
بتاں دو جمع ہیں گے ہر جدا حافظ ہے مجلس کا
غضب سے کر چڑھانا آستیں وہ تند خو آوے
ابھی کی ہے گی توبہ ہم نے اور بدمست وہ (؟) ساقی
قیامت ہو جو پیتا جام اور لیتا سبو آوے
برے بالوں کو چاہوں ہوں کھلے دیکھوں کہ دل میرا
ابھی دُر نجف ہووے جو اس میں ایک مو آوے
جہاں کے باغ میں کرتا ہے سیر اس واسطے حاتم
کہ شاید مہر و اُلفت کی کسو بھی گل سے بو آوے

زمین طرحی ۱۱۵۱ھ

نہ سیہ زلف تری جب سے مرے دل میں بسی
تب سے ناگن کی طرح جان مرے من کو ڈسی

ابر جوں موسم برسات میں رؤں نہ سو کیوں
برق اب یاد دلاتی ہے مجھے تیری ھنسی
ایک باری تو کیا قتل اک عالم ظالم
پھر یہہ لے ھاتھ میں سمشیر کمر کیوں تو کسی
زال دنیا کے اوپر نفس مرا ھووے چاق
سخت سرکش ہے یہہ کیونکر نکرے بوالہوسی
آیا جراح کہ زخموں کو ھمارے ٹانکے
کہا حاتم نے یہہ حسرت تھی مجھے ان کو نہ سی

زمین طرحی در ۱۱۵۱ھ

جوں تری پتلی مری چشم میں آ پھرتی ہے
اسی دم روح تری گرد (؟) میں جا پھرتی ہے
کاھلی ھو کے نہ جا اب تو چمن میں بلبل
کہ گلستاں تو ہے بے آب ، ھوا پھرتی ہے
اٹھ چلا جوں وہ کہا میں نے میاں ٹک (بو؟) پھر آ
بولا عصے سے کہ اب میری بلا پھرتی ہے
دختر رز کو دیکھو مجمع رنداں میں مدام
پردۂ شرم اڑا ، گھر کو جلا پھرتی ہے
اس سبب پھولے سماتے نہیں گل جامے میں
کہ کھلے بند چمن بیچ صبا پھرتی ہے
مری باتوں سے اب آزردہ نہ ہونا ساقی
اس گھڑی عقل مری مجھ سے جدا پھرتی ہے
حاتم اس ماہ کی حسرت میں ھر اک محفل میں
شمع بھی تن کو گھلا سر کو کٹا پھرتی ہے

زمین طرحی در ۱۱۵۱ھ

ہے راہ عاشقی باریک اور تاریک اور سکڑی
نہیں کچھ کام آنے کی یہاں زاھد تری لکڑی
تری آنکھوں کی اب تعریف لکھنے کو چمن اندر
نظر کر دیکھ اے خوش چشم نرگس نے قلم پکڑی
زنانوں سے نہ مل گر مرد ہے تو چھوڑ یہہ صحبت
وگرنہ یاد رکھ ہووے گی آخر ایک دن پھکڑی

زمین طرحی در ۱۱۵۲ھ

تیری صورت پر نہ تنہا میں ھی مفتوں ھوگیا
جن نے دیکھا تجکو اے لیلیٰ سو مجنوں ھوگیا
ہاں و مستی کا ترے اے جان مجلس میں تھا ذکر
اس قدر مبحث ھوا آپس میں شبخوں ھوگیا
کچھ نہ پایا ہم نے کیا حکمت ہے خمخانے کے بیچ
جو کوئی جا کر وھاں (بیٹھا)[1] فلاطوں ھوگیا
ہے عبث حاتم یہ سب مضمون و معنی کا تلاش
منہہ سے جو نکلا سخن گو کے سو موزوں ھوگیا

زمیں محتشم علی خان حشمت در ۱۱۵۲ھ

سب طرف ہے شور کچھ طوفاں سا لاتی ہے بہار
چپ جاؤ آج دیوانوں کہ آتی ہے بہار
بلبل نالاں کے ہوش کرنے کو اپنا رو دکھا
غنچۂ دلگیر کو آ کر ھنساتی ہے بہار

---

(۱) متن میں 'پہنچا' اور حاشیے میں "بیٹھا"۔

گہ شگوفے کی طرح کھل کھل کے ہوئے بے حجاب
گاہ چھپ چھپ پردۂ گل میں لجاتی ہے بہار
یا زمانہ پھر گیا یا باؤ کچھ اُلٹی بہی
تب ہوا خواہوں سے اپنے مونہہ پھلاتی ہے بہار
دم غنیمت جان ٹک چل اور گلوں کا دید کر
سیر گلشن کو تجھے حاتم بلاتی ہے بہار

در ۱۱۵۲ھ

یار آ مجھ پاس بولا دیکھ لے آئی بہار
میں کہا اُس کو بغل میں لے کے میں پائی بہار
بلبل و گل کی حنا بندی ہے آرائش کرو
یہ شگوفہ آج تازہ باغ میں لائی بہار
داغ لالہ دیکھ اُس کو آگ سی سرسوں لگی
اور گلوں کو مونہہ پھلائے دیکھ جھنجلائی بہار
باغ میں اہل چمن کا میر ساماں بوجھ کر
سر اوپر حاتم کے بارو حوں گھٹا چھائی بہار

زمین طرحی در ۱۱۵۲ھ

مستی میں بے کسوں کے تئیں ہوئے کب لحاظ
جاتا رہے ہے ان کی طبیعت سے سب لحاظ
گستاخیاں رقیب نہیں چھوڑتا مگر
سر میں لگے گی دھول اُسے ہوگا تب لحاظ
نازک طبیعتوں سے نہ ہو بے ملاحظہ
اتنا بھی کیا نہیں ہے تجھے بے ادب لحاظ

ہے طفل، گو کہ قدر مری بوجھتا نہیں
جانے گا قدر تب کہ اسے ہو گا جب لحاظ
دامن کو اس کے ہاتھ لگایا تھا بھول کر
حاتم کے دل میں سوچ کے آیا ہے اب لحاظ

زمین طرحی در ۱۱۵۲ھ

اہل جہاں کی گو ہے نظر میں جہاں وسیع
پر ہو سکے ہے دل کے برابر کہاں وسیع
آئی ہے فصل گل کی مچاویں گے ہم تو دھوم
صحن چمن کو ٹک تو کر اے باغباں وسیع
بلبل کے مشت پر کو بہت جا ہے کنج باغ
صیاد سے مجھے تو کرے آشیاں وسیع
عالم ہے کامیاب ترے دست فیض سے
ایسا کیا ہے حق نے ترا آستاں وسیع
حاتم کو اپنے لطف و کرم سے نواز دے
ہم سے اپنے دل کو کر اے مہرباں وسیع

زمین طرحی در ۱۱۵۲ھ

تو صبح دم نہ نہا بے حجاب دریا میں
پڑے گا شور کہ ہے آفتاب دریا میں
چلو شراب پئیں بیٹھ کر کنارے آج
کہ ہوئے رشک سے ماہی کباب دریا میں
تمہارے مونہہ کی صفائی و آبداری دیکھ
بہا ہے شرم سے موتی ہو آب دریا میں

میں اس طرح سے ہوں مہماں سرائے دنیا میں
کہ جس طرح ہے کوئی دم حباب دریا میں

جہاں کے بحر میں ہر موج لوجھ سیل فنا
بنا نہ گھر کو تو خانہ خراب دریا میں

کبھو جو عالم مستی میں کی بھی تم نے نگاہ
بجائے آب بہے ہے شراب دریا میں

میں آب چشم میں ہوں غرق مجکو نیند کہاں
کہیں کسو کو بھی آتا ہے خواب دریا میں

اگر ہے علم تجھے تو عمل کے درپے ہو
وگرنہ شیخ ڈبا دے کتاب دریا میں

صنم کی زلف کی لہروں کے رشک سے حاتم
نہیں یہ موج، یہ ہے پیچ و تاب دریا میں

در ۱۱۵۲ھ

ہوئی تقصیر اب معاف کرو بغض و کینہ سے سینہ صاف کرو
ہاں جی! جانا بڑے سپاہی ہو اب تو شمشیر کو غلاف کرو
موبہ لگانا بدوں کا خوب نہیں ایسی صحبت سے انحراف کرو
دل کے آزار کا نہ دو فتویٰ مذہبوں میں مت اختلاف کرو
چلو بیٹھے رہو بندھی مٹھی سینہ حاتم کا مت شگاف کرو

در ۱۱۵۲ھ

اپنے عاشق کو جی سے پیار کرو ظلم کو مت تم اختیار کرو
حسن آئینہ فاش کرتا ہے ایسے دشمن کو سنگسار کرو
عمر جاتی ہے انتظاری میں ٹک ادھر بھی کبھو گذار کرو

زمین طرحی در ۱۱۵۲ھ

میں پہائش کیا مجنوں صفت یکسر بیاباں کو
نہ پہنچا دامن صحرا مرے چاک گریباں کو
عش مخشے ہے عم کے روزہ داروں سے تو اے زاھد
کہ تیری صبح پہنچے گی نہیں سام غریباں کو
تو آنے سے انہوں کے باغباں ڈریو کہ یہہ لڑکے
بعل مارے لیے جاتے ہیں مکتب میں گلستاں کو
علام عشق سے دیر و حرم کی راہ مت پوچھو
حو ہو دیوانہ کیا جانے طریق کفر و ایماں کو
برس میں وہ کبھو برسے ہے یہہ برسوں سے برسے ہے
مقابل مت کرو باراں سے میری چشم گریاں کو
چمن میں داستان عسق میری سن کے اے حاتم
کیا استاد آخر بلبلوں نے مجھ غزلخواں کو

زمین انعام اللہ خاں یقین در ۱۱۵۲ھ

کوئی بھی ہے جو مجھ درد دل ناشاد کو پہنچے
خدا کے واسطے یک دم مری فریاد کو پہنچے
یہاں مرنے کے تئیں اول قدم ہم سر سے حاضر ہیں
ہماری سب سے اب پہلے دعا جلاد کو پہنچے
بڑھاپے میں کیا شاگرد ہم کو عشق طفلاں نے
یہہ مکتب میں جو لڑکوں کے اب استاد کو پہنچے
مرا یک مشت پر یارو دونہیں برباد جاتا ہے
ارے کیا ہو جو ہاتھوں ہاتھ جا صیاد کو پہنچے

پکڑتے مو قلم رعشہ ہو اس کے دل میں دہشت سے
تری تصویر کی شہرت اگر بہزاد کو پہنچے
تعجب عسق سے شیریں لباں کیا ہے یقیں جانو
اگر ہمت سے حاتم سرچڑھا[1] فرہاد کو پہنچے

زمین طرحی در ۱۱۵۳ھ

شق کا جہاں میں گھر ندیکھا ایسا کوئی در بدر ندیکھا
سا کہ اُڑے ہے طائر دل ایسا کوئی تیز پر ندیکھا
وبان جہاں ہوں حس سے تسخیر ایسا کوئی ہم ہنر ندیکھا
ٹے دل کو بنا دکھاوے ایسا کوئی کاریگر ندیکھا
ں تیغ نگہ سے ہو مقابل ایسا کوئی بے جگر ندیکھا
اری ہیں ہمیشہ چسمۂ چشم ایسا کوئی ابر تر ندیکھا
و آب ہے آبرو میں حاتم ایسا کوئی ہم گہر ندیکھا

زمین طرحی در ۱۱۵۳ھ

س طرف کو میں گیا روتا ہوا تا فلک رُوے زمیں دریا ہوا
ال کے نقطے سے چہرے پر ترے یک قلم اب حسن خط دونا ہوا
ات کو تو تھا وہ میرے ہمکنار آنکھ کے کھلتے الٰہی کیا ہوا
س قدر ہم نے پیا خوں جگر دل مرا خوں غنچۂ لالا ہوا
اتم اس کی دیکھ کر زنجیر زلف پھر نئے سر سے مجھے سودا ہوا

زمین طرحی در ۱۱۵۳ھ

ہماری آہ میں اتنی نہوی تاثیر یا قسمت
جو کرتا اُس پری رو کے تئیں تسخیر یا قسمت
لگاتے ہاتھ اُس کی زلف نے دل کو کیا قیدی
نصیبوں سے مرے وہ ہو گئی زنجیر یا قسمت

---

(۱) مخطوطے میں "سرچرا"۔

کمر باندھی ہے عاروں کے جا جا کر لگانے سے
ہمارے قتل پر قاتل نے بے تقصیر یا قسمت

وہ آھو چشم ہم سے رام ہو رم کر گیا آخر
چڑھا تھا دانؤ پر جاتا رہا نخچیر یا قسمت

ھوا تھا حواب میں وہ دوست جاگے پر ھوا دشمن
ہمارے حواب کی اُلٹی ھوئی تعبیر یا قسمت

نہیں کچھ پیش رفت ھوتا ھمارا عسق سے حاتم
ازل کے روز سے کی تھی یونہیں تقدیر یا قسمت

زمین طرحی در ۱۱۵۳ھ

ھوئی یک عمر رکھتے دل میں اُس کی آس یا قسمت
کسو دن بھی نہ آیا وہ ہمارے پاس یا قسمت

بھنور ھو کر پھرا میں دیکھتا ھر ایک گلشن میں
کسو گل میں نہ پائی گلبدن کی باس یا قسمت

ھم اُن بندوں میں ھیں حو بات کہتے سر کو دے ڈالیں
تس اوپر بھی رکھے گر دل میں تو وسواس یا قسمت

حدا نے سب طرح کی دی ہے نعمت سکر ہے لیکن
مجھے حاتم مری ھمت سے ہے افلاس یا قسمت

زمین طرحی در ۱۱۵۳ھ

پہلے قرباں سر کہے تو کروں
سب تجھ اوپر نظر کہے تو کروں

یہ رہے پابوس کا مرے دل میں
آرزو ہے اگر کہے تو کروں

دل تو تیر نگہ نے چھان دیا
اب نشانا جگر کہے تو کروں

تجھ دھن کی صفت میں میری زباں
لال ہے مختصر کہے تو کروں

تیرے آنے کی آج حاتم کو
اے مری جاں حبر کہے تو کروں

زمین طرحی در ۱۱۵۳ھ

تیرے اے سرو خراماں روبرو گر آئے سرو
دیکھ کر چلنے کی خوبی، خاک میں گڑ جائے سرو

قدر آزادوں کی تو نے باغباں جانی نہ حیف
ہے بجا گر آہ اس گلشن میں اب ہو جائے سرو(؟)

کس طرح آوے جلو تری میں وہ معذور ہے
پاؤں چلنے کو کہاں سے دوسرا اب پائے سرو

تیرے قامت کے تصور سے میں دیکھوں ہوں اسے
تو جو ہو در میں تو کس کام کو ہو پروائے سرو

یک دم آسائش نہ کی اور اڑ گیا رنگ بہار
حیف گل، افسوس بلبل، ہائے قمری، وائے سرو

سیر گلشن کو وہ سرکش آوے اے حاتم کبھو
دور سے مجرے کے تئیں جھک جائے سرتا پائے سرو

زمین طرحی در ۱۱۵۳ھ

قدر جانے ہے سخن گو کی جو کوئی انساں ہے
نطق کا فہم نہیں جس کے تئیں حیواں ہے

خوب اور زشت کی تعریف نہ پوچھو مجھ سے
مظہر حق ہے یہاں عقل مری حیراں ہے

جس کو اس وقت میں کچھ سدّ رمق پہنچی ہے
بحر و بر کا وہ سکندر منش و سلطاں ہے

زور احساں سے کرے زیر زبردستوں کو
شیوۂ مردمی و کار جواں مرداں ہے

دین و دنیا سے گذر سب سے ہوے ہیں آزاد
حاتم اب معتقد ہمت درویشاں ہے

زمین طرحی در ۱۱۵۳ھ

ایک پر ایک گھٹا دل سے سرس آتی ہے
ہر برس جا کے ترے گھر میں برس آتی ہے
آج بیضے سے نکلتی ہے جو بلبل صیاد
سو ترے دام میں مشتاق قفس آتی ہے
نمک حسن کا سنتا ہوں ترے جوں جوں شور
توں توں ملنے کی مرے دل میں ہوس آتی ہے
بوالہوس گو کریں تیرے لب شیریں پہ ہجوم
تلخ مت ہو کہ مٹھائی سے مکس آتی ہے
کون گذرا ہے چمن بیچ معطر ہو کر
کہ ہر اک خار سے خوشبوئے خس آتی ہے
موسم گل کا مگر قافلہ جاتا ہے کہ آج
سارے غنچوں سے جو آواز جرس آتی ہے
کچھ خبر تجکو بھی ہوتی ہے جو دل حاتم کا
ناگنی زلف رسا کی تری ڈس آتی ہے

زمین طرحی در ۱۱۵۳ھ

کہوں جا کس سے اب اپنے دل ناداں کی نادانی
کہ مجھ سے دوست سے دارو ہوا ہے دشمن جانی
نگاہیں جوڑ اور آنکھیں چرا ٹک چل کے پھر دیکھا
مرے چہرے اوپر کی شاہ خوباں نے نظر ثانی

مصور اس میاں کی چاہے تھا تصویر کو کھینچے
کمر کے وھم میں بھر سوقلم لکھنے سے چیں مانی
اگرچہ یہہ زمیں کہنہ تھی اے دوستاں لیکن
ھے دل میں اس غزل میں تازہ کہیے مطلعٔ ثانی
ھوا ھوں اس قدر کاھیدہ تیرے ھجر میں حاتی
کہ میں نے اپنی صورت دیکھ کر آپ ھی نہ پہچانی
خدا کو جس سے پہچیں ھیں وہ اور ھی راہ ھے زاھد
پٹکتے سر تری گو گھس گئی سجدوں سے پیشانی
خدائی ھے خودی سے دار آ ھستی سے توبہ کر
بقا باللہ چاھے ھے کہ ھو، تو شیخ، ھو فانی
نہ جاوے صحبت کامل سے جس کے کفر ھو دل میں
سلیماں سے کبھو ٹوٹا نہ زنار سلیمانی
کہا حاتم نے تیرے دیکھ مونہہ پر حال ھندی کو
''چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی''

زمین عبدالحی تاباں ۱۱۵۳ھ

اس طرح گذرا چمن میں آج وہ گل، چشم سے
دیکھتے جس کے مری جاتی رھی گل چشم سے
آج (کیا ؟)[1] ھمدرد اس بیکس کے ھیں گلشن میں پھول
ھاتھ دھو بیٹھی ھے ھو رو رو کے بلبل چشم سے
تاک کر آنے تجھے مجلس میں سر مست خمار
پانی پانی ھو گئی حل جل ترے مُل چشم سے
سب طرح پورا ھے معشوق کے تاؤ بھاؤ میں
ھم نے تولا ھے تجھے من میں بتا تل چشم سے

---

(۱) مخطوطے میں ''کس''۔

دیکھ کر تجھ زلف و خط کی موج اے گلزار حسن
گر گیا ہر ایک کے ریحان و سنبل چشم سے
عبر سے آنکھیں لڑانا اس کا بے حکمت نہیں
اس کے تئیں خر جان کر دیتا ہے وہ حل چشم سے
دشمنوں کے رو برو پیارے مرے حق میں کبھو
دیکھنے سے خوش ہا در ہے تغافل چشم سے
اس طرح ہم نے نہیں دیکھی کہیں سلک گہر
جس طرح آنسو نکلتے ہیں تسلسل چشم سے
چشم و کاکل کی صفت ظاھر (میں)[1] حاتم کیا کہے
چشم ہیں کاکل سے بہرے خوب و کاکل چشم سے

زمین طرحی در ۱۱۵۴ھ

شہر میں پھرتا ہے وہ مےخوار مست کیوں نہ ہو ہر کوچہ و بازار مست
ہو گئے اُس کا قد (و) رخسار دیکھ سرو، قمری، بلبل و گلزار، مست
جس کے گھر جاتا ہے وہ دارو پیئے ہوئے اُس گھر کے در و دیوار مست
میکشو حاتم کو متوالا کہو ایسا ہم دیکھا نہیں ہشیار مست

زمین طرحی در ۱۱۵۴ھ

ہے ایسی طرح سے محلس میں شمع اور فانوس
کہ زیب دیتی ہے حجلے میں جس طرح سے عروس
کھلا ہے ایسا مرا لالہ زار داغوں سے
کہ رقص کرتا ہے گلشن میں دیکھ کر طاؤس
جنوں کے فیض سے مانند بید مجنوں کے
نمو کے بیچ کروں ہوں ترقیٔ معکوس
اے سرو قد تو پہن جامہ فاختائی رنگ
کہ ترے بر میں سراپا سجے ہے یہہ ملبوس

---

(۱) مخطوطے میں "طاھری"۔

جیتے کھیت مسلمانن نے اور بھاری دل دئے بھجائے[1]
لڑو بھروسے تم واھی کے دے ھے جیب وھی کرتار
مدد تمہاری وہ ھی کر ھی بڑا وھی لگے ھے پار
اتنی کہہ تب حکم کوچ کا دیا سوگدی پت فرمائے
سجگئی فوج مسلماںکی ترتی لئے ھتھیار سجائے
سجگئے عربی جوان سجیلے جنکی سوبھا[2] برنی جائے
پھن جمیلیں[3] تلوارنکی سج دھج انکی لئی بنائے
ھاتھ میں نیزہ کمر کٹاری دائیں بازو پڑی کمان
پیٹھ پڑے ترکس تیرنکے بائیں ڈھال براجے آن
گھوڑے سجائے زئین اسے تن[4] پر پہاند بھئے اسوار
ناچن لاگے گھوڑے عربی ھنین لاگے ٹاپیں مار
سگل[5] گاوے نیچے دھرتی اوپر جھوم رھا آسمان
جھلمل اوجیارے مکھران سے نگر مدینہ کا میدان
رخصت بھئے بسگدھی پت سے اور رخصت کےکرے سلام
دعادئی سبکو گدھی پت سدھ[6] ھوئیں سب تمھرے کام
اونچا کر تب ھاتھ میں جھنڈا عمر عاص نے دیا پکار
چلے میرے جھنڈے کے پیچھے لشکر میرا نو ھزار
باندھ پرے سب دل غازی نے دئی گھوڑنکو ایڑ لگائے

---

(۱) بھگا دئے۔
(۲) جو بیان نہیں ھو سکتی ۔
(۳) تلواروں کے پر تلے ۔
(۴) جس پر کود کر سوار ھوئے۔
(۵) خوشی کے گیت ۔
(۶) تمہارے کام درست ھوں ۔

گھمرت چلا محمدی جھنڈا نعرہ ہوت گول میں جائے
چلتھی فوج مسلمان کی فلسطین کو[1] ممیں ٹھان
دوسرے دن اور دوسرا لشکر کرا سو گدی پت تیار
بھرتی[2] بھئے سو وا لسکر میں لوگ مہاجر اور انصار
دیا سجائے وہ لشکر غازی حضرت عاص کو[3] ملائے
لیکر خاص محمدی جھنڈا ھاتھ میں اونکے دیا گہائے
سپہ سالار ھو تم فوجن کے مسلمو تمھیں کہوں سمجھائے
سیکھ[4] نکھائی کل جو میں نے سنی ھے سو تم ھوائے بہائے
سدھ[5] رکھیو اوہیں داتکی اے ھیں وہ ھی کام تمھار
سیکھ دئی ھے جسی میںے کردو واھی کے اونہار
کوچ کرو اب لے فوج اپنی سام ملک پر کرو چڑھائی
نگر جابیہ در رومن سے تم دنو لڑائی ٹھان
اتنے سے حضرت عاص نے دیا فوج کا کوچ کرائے
ڈگر[6] نکڑ لی سام ملک کی نگر جابیہ سنمیں لائے
واھی دن اک فوج لڑیا گدھی پت اور دئی سجائے
جس میں سب اصحاب نبی کے چھٹ[7] اصحابن دسرانائے
سگری عمر رھے لڑنے میں نت اوٹھ آٹھیں جنگ کا دھیان
لڑے اگار رسول اللہ کے جتنے بھئے بہت میدان

---

(۱) فلسطین کے ارادے سے -
(۲) بھرتی ہوئے اس لسکر میں -
(۳) عاص کو سردار بنایا -
(۴) نصیحت بیان کی -
(۵) خیال رکھیو -
(۶) راہ -
(۷) سوائے اصحاب کے کوئی دوسرا نہ تھا -

بڑے بہادر بڑے لڑیا گنتی اونکی ڈیڑھ ہزار
مکھ[1] لاکھن سے پھیریں ناھیں انمیں کٹھن کریں تلوار
حضرت خالد ان کے دولھا جو انکی سنگی تلوار
آوے کبھو میا میں ناھیں کوئن حتن[2] کریں کمار
تمہیں بنایا افسر اون پر ھاتھ میں اونکے دیا نشان
جیسا لسکر تیسا افسر دئیں اولٹ پل میں میدان
حکم دئیں حضرت خالد کو حضرت گدھی دت بلائے
کرو چڑھائی تم فارس پر دیو لسکر کا کوچ کرائے
حملہ جائے کرو فارس پر نت اوٹھ کھیچی رکھو تلوار
تمھرے ھاتھ ملک فارس کا دی کرائی فتح کر تار
کوچ کرا تب حضرت خالد اور لے لشکر چلے اگھائے[3]
دھرتی کانپ گئی فارس لو[4] ، ھگئے روم چین تھرائے
گھمرت[5] چلا محمدی جھنڈا رھی فتح تس پر لہرائے
لا الہ الا اللہ کا نعرہ ھوت گول میں جائے
حضرت خالد ان کے دولھا گئے فارس کو سمیں ٹھان
ھمانکی[6] باتیں اب ھیاں راکھو دوسرے اور کی سنیو بات
شام[7] ملک دنج ساری رھت مدینہ آوت جات

---

(۱) لاکھوں سے منہ نہ پھیریں -
(۲) کوئی ترکیب -
(۳) آگے -
(۴) تک -
(۵) گھومتا -
(۶) یہاں کی -
(۷) بیوپاری آتے جاتے رہتے ھیں -

تاج اور کپڑے شام ملک کے نگر مدینہ بیچیں لائے
تیل اور چھوارے جو کچھ لاویں سوؤ[1] اونکا ھاں نکائے
دل غازی جوگدی پت نے سام ملک پر دئے چڑھائے
دیکھے سو اون بیوپارن نے اپنی آنکھن سے چتلائے
ناٹوں سنا اور فلسطین کا سمیں گئے[2] سنا کا کھائے
روم سام کے بادساہ کو گپتی[3] خبر دئی بھجوائے
لگی کچھری بادشاہ کی بھاری لاگ رہا دربار
بیٹھے امرائے اور مصاحب باڑ سدھی[4] دربانن کیار
لمکت[5] آوے اک ھرکارہ بھوکا راج کچھری آئے
سیس نوائے سو بادشاہ کو دونو ھاتھ جوڑ رھجائے
غافل بیٹھے ھو تم کیسے ھمرے ساہ چلسا رائے
فوجیں چڑھ آئیں عربکی فلسطین پر لڑھیں آئے
خبر سی جب جھ ھرقل نے سمیں گیا سنا کا کھائے
ترت وزیر اپنے بلوائے اور بلوائے لئے امرائے
جاھی دنکو رھا میں ٹھیک سدن[6] تمکو رھا ڈرات
جاھی نبی کے اصحابنکا رھا میں تم کو حال سنات
مالک اک دن وے ھوئے جے لے ھیں مال اور ملک تمہار
راج پاٹ کے مالک ھوئے ھیں تمکو دے ھیں مار[7] نکار

---

(۱) سوان کو یہاں بیچ دیں ۔
(۲) ڈر لیے ۔
(۳) پوسیدہ ۔
(۴) دربار میں صف بصف بیٹھے ۔
(۵) دوڑا آیا ۔
(۶) رات دن ۔
(۷) مار کر نکال دیں ۔

وہ ھی دن سو اب آئے پھونچا فوجیں پھونچیں آئے
سانچی بات کہی تھی میں نے سو تمنے نا مانی ھائے
ملا تمھیں جھ پھل تاھی کا جو[1] دھو اب عرن سے جائے
مایا[2] دھرم پران تمھارے سا لڑے سو بچ ھیں نائے
کر ھو ڈھیل حو تم لڑے میں اسھیں[3] عربی تمھیں دبائے
مال ملک سب وے لے لیہیں اور تمکو دیہیں[4] نکرائے
باتیں سن جھ بادساہ کی رووں لاگ سکل سردار
ھٹکے[5] ھرقل سردارنکو رووو کاھے ڈار ھیں مار
روئے کام نہ بن ھے کوئی حگمیں ہوئے ھے ھنسی تمھار
چھوڑو اس رووا راھٹ کو اور لڑبیکو ھوؤ تیار
بڑا وزیر کہن دب لاگا سیو شاہ چلیپا رائے
لایا خبر جھ کون ھیان وا ھمرے سنمکھ کہے سنائے
بھیج کے ترتی دربانی کو ھرقل وائے لیا بلوائے
آوے دوڑب تب ھرکارہ حاصر ھوا کچھری آئے
پوچھے ھرقل ھرکارہ سے ھرکارے احوال سناؤ
دیس عرب سے توئے چلے بھئے[6] بیتے کیتے دنا بتاؤ
دے جواب کہے ھرکارہ سن لیو روم شاہ کے رائے
دیس عرب سے موئے چلے بھئی سو بیتے[7] پچیس دن آئے

---

(۱) لڑو ۔
(۲) دولت، دین، جاں ۔
(۳) عرب تمھیں دبا لیں گے ۔
(۴) تمھیں نکال دیں ۔
(۵) منع کیا کیوں روتے ھو ۔
(۶) عرب سے چلے کتنے دن گزرے ۔
(۷) مجھے پچیس دن چلے ھوئے ھوگیے ۔

حاکم کون مسلمانن کا تسکا دے اب نانوں بتائے
بولا حاکم ابوبکر ہے سانحا[1] حکمت بکھا نا وائے
بوجین بھیجیں جہ واھی نے تمھرے مالک پر دئیں چڑھائے
بگر جامہ فلسطین پر سو کوئی دمیں بھونجت آئے
دیکھا ہے تورین آنکھ سے اپنی کبھوں وائے سو کر بستار[2]
بولا ھاں میں نے دیکھا ہے پھرت مدینہ کے بازار
پھرے رھت سدا دوئی کپڑے چلت پھرت اور ھاٹ برار[3]
شملہ مول لیا اک محھسے اور لیا کندھے پر ڈار
جیسے اور مسلمان عربی تیسا ھی وہ بڑت دکھائے
بتاؤ کرت ہے ریر ببر[4] کا بدلا ترقی دیت دوائے
کیسی صورت سووا کی ہے تسکا کہہ ھرکارے حال
بولا رنگ ہے گیہوان وا کا اور پترے[5] پترے ھیں گال
سن جہ باتیں بولے ھرقل اپنے وزیرن کہے سنائے
ساجا ہے جہ قسم دھرم کی اور میں سانچ کہوں سمجھائے
گی اور ناوں اور صورت وا کی جو ھرکارہ کرے بکھان
لکھا کتابن میں ہے سوئے تم میری بات پر کرو پرمان[6]
لکھا ہے آخری پیغمبر کا جگ میں ھوئے وہ پہلا یار
بیٹھے پھر آنکی گدھی پر بیٹھے نبی کا دوجا[7] یار

---

(۱) صدیق کہلاتا ہے۔
(۲) تفصیل۔
(۳) بازار میں پھرتا ہے۔
(۴) کمزور اور طاقتور۔
(۵) پتلے۔
(۶) یقین کرو۔
(۷) دوسرا یار مراد حضرت عمرؓ جو جہار سخت لڑاکو۔

ڈیل کا لمبا من کا اگرا فوج چڑھیا کٹھن ہو ھار
دیس دیس میں پورب پچھم چمک جائے اُسکی تلوار
تخت اُلٹ جائیں ملک ملک کے ستے حکمیں ھاھا کار
اُسکے ھاتھ سے دس نکاسی[1] اور سری گت ھوئے ھار
بائیں سکے خہ ھرقل کی تب ھرکارہ اٹھا پکار
دیکھا ھے میں نے وا ھو کو بھرت ھزار مدینہ کیار
ساتھ رھت نت گدھی پت کے ایک گھڑیکو مجھڑت[2] نائے
چلے جہاں کو اٹھ گدھی پت ساتھ تہانکو وہ ھو جائے
بولا ھرقل قسم دھرم کی ساچ بھئی اب سگری بات
حونی[3] بات کا سوئے اندیسہ سوئے آگار اب آوت جات
سمجھایا[4] بہتیرا سبے ان لوگن کو سیکھ سنائے
سانچی بات میری ناجانی کبھی سری نا مانی ھائے
بھگت[5] پڑت اب کوئی دنا میں راج پات میں میرے آئے
اپنا[6] ڈوبے خہ گھرے میں اور موھو کو رھے ڈوبائے
اتنی کہکے تب ھرقل نے سیو یارو بات ھار
اوسر ایک بلوانا اپنا[7] ناؤں روُ بس بڑا سردار
بڑی چلینا رس حڑاؤ ھاتھ میں وا کے دئی اگھائے
ساتھ لیئو تم ایک لاکھ دل پھوبچو فلسطین پر جائے

(۱) دیس نکالا -
(۲) کبھی جدا نہیں ھوتا -
(۳) جس بات کا اندیشہ تھا -
(۴) بہت سمجھایا ' نصیحت کی -
(۵) خرابی ھوگی -
(۶) خود ڈوبے اور مجھے بھی ڈبویا -
(۷) جس کا نام روبیس تھا -

روکو رستہ میں عربن کو آگا انکا دیو گھرائے
آگے دیو بڑھن[1] ناہک بھر پہوچیں فلسطین کو جائے
ہے وہ نگر انوپ اور نامی جانے جسکو جگ سنسار
سوبھاؤ[2] اسے شام ملک کے حکمیں واسے نام ہمار
لے لے ہیں جو عربی واکو ہمری بات کہا رہ جائے
جیسے بنے تیسے عربن سے لڑ بھڑ اس کو لیو بچائے
ساجا اٹھ تب رودس افسر باندھ لئے تن پر ہتھیار
ایک لاکھ دل رومی ساجا ہوئے گئے گھوڑین اسوار
کوچ کا ڈنکا تب بجوادا چل دہیں فوجیں اور سردار
انک ایک پہ گیارہ بار، دیکھیں[3] کہا کرے کرتار
نو ہزار مسلمانن پر رومی چلے ہیں اک لاکھ جوان
ہیاں کی باتیں اب ہیاں چھوڑوں بھر پاچھے[4] کا کروں بکھان
فوج مدینہ سے جو دھائی فلسطین کو من میں ٹھان
عمر عاص سردار بہادر چلے جو دل کا کوچ کرائے
چل کر سو ایلہ کے رستہ پہوچے فلسطیں پر جائے
باگیں روکیں تب اور اترے گھوڑن زین دئے اترائے
پھینٹیں کھول دئیں جوانن نے ڈیرہ سولئے لگائے
عمر عاص افسر نے تسہین من میں اپنے سوچ بچار
بلوائے اپنے تمو میں لوگ مہاجر اور انصار
لاگ کرن سب مل آپس میں صلاح لڑائی کی منلائے

(۱) درا نہ بڑھے دو ۔
(۲) رونق ۔
(۳) کیا کرے ۔
(۴) پیچھے کا بیاں کروں ۔

تو لے عدی عامر کا بیٹا لسکر میں پہونچے آئے
سمو[1] ھی تب بلوائے عدی کو پوچھیں عمر عاص سردار
تمھیں خبر کچھ ہے رومن کی سو تو حال کرو ستار[2]
بولیں عدی کچھ نا پوچھو موسے[3] کچھو کہی نا جائے
چینٹی[4] اور ٹیری دل جیسے آوت فوج چلیپا رائے
بولیں عمر عاص اتنی سن اور عدی سے کہیں سنائے
بات[5] کہی جہ تم نے ایسی جو لشکر کو دیو ڈرائے
ڈرت نہیں سو کافر دل سے کریں ھم لاکھوں میں تلوار
ھمیں بھروسا رب اپنے کا بڑا وھی لگیے ہے پار
تمھری جانچ میں ہے کتنا دل سو تو ھم کو کہو سنائے
بولیں عدی جو میں جانت ھوں سو اب کہوں سنو[6] چتلائے
ایک پہاڑ کے اور چڑھ کے دیکھا میں نے اونھیں چتائے[7]
جھنڈے چلیپا اور برچھیں سے جنگل بھرا پڑت دکھرائے[8]
ایک لاکھ سے ھیں وے بڑھتی میری جانچ میں اے سردار
لاگے کہن مسلمانن سے سن لو بھیو بات ھمار
نوکر چاکر تم ناھیں ھو دھرم کے بھیا لگو ھمار

---

(١) سامنے -
(٢) تفصیل -
(٣) مجھ سے کہا نہیں جاتا -
(٤) ٹڈی دل عیسائی آ رہے ھیں -
(٥) ایسی بات کہہ دی جس سے فوج ڈر جائے -
(٦) غور سے -
(٧) خیال سے -
(٨) دکھائی -

ایک سے ھیں اس کام میں ھم تم چھوٹے بڑے کا ہیں بچار[1]
را کھ بھروسا رب اپنے دل بیری سے لڑو گھائے
ڈرو لڑائی دیں کے کارن کر ھے تمھری مدد خدائے
مارا[2] جے ھی جو تم میں سے درجہ ملے شہادت کیار
اور جو کوئی جیت رہ جیہے تسے سکھی راکھے کرتار
ہے کاھو[3] اب صلاح تمھاری جس دن آسے ٹھاہیں رار
لاگے کہن تب دیبک آمرائے سن لیو تم سردار ھار
عرصہ[4] پر ھوئیجاؤ نگر سے لشکر پاچھے لیو ھٹائے
چلو پڑے میدان میں لسکر تہاں پرے ھم وئیں جائے
آوس تہیں جو رومی کافر اور میدان میں ہوبجے آئے
حملہ کریں سب ھم دھوکے میں اور رب چاھے دئیں بھجائے[5]
لاگ کہن[6] سب سہل قریسی جہ تو ھمرے من بابھائے
دیا لچا جو آپکو جانے سو وہ ایسی بات بتائے
کا ھم ڈرت ھیں دل کافر سے آگے بڑھ کا لڑا مچائے
پاچھے ھٹا دیں جو لسکر کو حملہ کریں دھوکے میں جائے
لاگ کہن اور لال عمر کے حضرت عبداللہ اوہ بار
لڑنا سکے جو آگے بڑھکے سوھٹے[7] کا کرے بچار
میں تو لڑائی سے بالوٹوں نا روکوں اپنی تلوار

(۱) ورق بہیں -
(۲) جو مرے شہادت پائے -
(۳) کیا -
(۴) بستی سے ھٹ جا -
(۵) بھگا دیں -
(۶) کہنے لگے -
(۷) ھٹنے کا -

کروں لڑائی آگے بڑھ کے لوٹ قدم نا دھروں بچھار[1]
آگے بڑھ کے لڑے جو چاہے جو چاہے پاچھے ہٹجائے
پاچھے[2] ہٹے سو سنکا بھوو میں سنگی ساتھی ہوں نائے
اتنی سن کے سب اُٹھ بولے جہ ہی مت ہمرے من بھائے
پاچھے ہٹکے ہم نا لڑ ہیں آگے بڑھکے لڑیں اگھائے
بھلی بتائی لال عمر کے تمھری[3] مت ہم لینی مان
وا[4] ہی کھن تب عمر عاص نے سنو تم سنیو بھائے
جھنڈا لے اک ہاتھ میں اپنے عبد اللہ کو دیا گھائے
طائف والے جوان لڑیا جو گنتی میں ایک ہزار
دئے سو حضرت عبداللہ کو ان کو لے تم چلو اگار[5]
بڑھکے لیو خبر رومن کی کت آوت اور کتنک دور
چل بھئے ترت تب عبد اللہ ٹاپن[6] اوڑی سرگ کو دھور
چلیں بٹا پٹ عربی گھوڑے دیت الدھیر یا دلمیں آئے
دن اور رات اک چلے برابر رکے کبھوں رستہ میں نائے
بھور ہوت کہیں دسرے دنکو پھوٹی کرن جب سورج کمار
دیکھ پڑے عربی جوانن کو اُٹھت دور سے گرد عبار
بولیں تب حضرت عبد اللہ اور جوانن سے کہیں سنائے
جان پڑت ہے موئے او یارو ہے جہ نکٹ چلیپا رائے

---

(۱) پیچھے قدم نہ رکھوں -
(۲) میں پیچھے ہٹنے والے کا ساتھی نہیں -
(۳) تمھاری بات مان لی -
(۴) اسی وقت -
(۵) آگے لے چلو -
(۶) ٹاپوں سے دھول اڑی -

باگیں روک لیو گھوڑن کی ہاتھ میں لیو تلوار اور ڈھال
آوے نیرے[1] گرد آٹھے بھئے اور کھلجائے حقیقت حال
ٹھار[2] بھئے تب وا ہاگہ گھوڑن باگیں دئیں تھائے
آوے گرد آٹھت اور گھمرت اور نیرے سو پہونچے آئے
چمکیں لاگ چلیا برچھی مانورہ رہ برس[3] انگار
ڈھکے بھئے لوہے میں، سگرے آویں چلیں رومی کفار
آگے آگے افسر آنکا پاچھے دس ہزار سوار
بکٹ[4] چلا تھا جہ رومن کا جبر جو لڑھ کے لئیں اگار
دیکھا انھیں جب عبداللہ نے حکم دیا برتی منلائے
دیر کرونا اب لڑبے میں بارو حملہ کرو اگھائے
ساتھ تمھارے رب ہے تمھرا تمھری مدد دئے کروائے
تلوارن کی چھائیں نیچے جنت بنی دئی بتلائے
اتنی بات سب افسر کی سمرے[5] برتی عربی جوان
لاگ ھمکارے[6] بھرن حج کے رہ گا کانپ کانپ میدان
اٹھے پکار اللہ اکبر اور کر حملہ بھڑے اگار
چلے کڑک کر رومی دل پر مانو شیرن پائے سکار
پہلے عکرمہ مکہ والے اپنے گھوڑے کو ڈپٹائے
گرے تڑپ کے بیری دلمیں حسبے[7] سگھ کرے اگائے

---

(۱) قریب۔
(۲) ٹھہر گئے۔
(۳) جلیں انگارے۔
(۴) ھراول دستہ۔
(۵) سنبھلے۔
(۶) نعرے۔
(۷) شیر حملہ کرے۔

کے پاچھے سہل قریشی اپنے گھوڑے ایڑ لگائے
ے[1] ڈپٹ کے بری دل میں سگرے گول گئے سمیائے
پاچھے ضحاک بہادر سو روس میں دھمکے آئے
سے چرین[2] کے جھورن میں باز شکاری گرے اگھائے
چھے پھر حضرت عبد اللہ حضرت عمر حطاب کے لال
نکے بجلی سے آئے ٹوٹے رہیں[3] مت گیا بھونچال
گ ھی آنکے سب آئے دھمکے مرد مہاجر اور انصار
بوں فوجیں مل اک ھوگئیں اندھا دھند چلی تلوار
د آڑانی آسمان کو ان میں رھی اندھیریا چھائے
ب[4] گئے رومن کے دل میں عربی پڑے نہ کوئی دکھائے
ٹا میں جیسے چمکے بجلی تیسے چمک رھی تلوار
چھے جیسے چمکیں تارے خنجر جیسے بریں[5] انگار
حل بیت رھی دھرتی پر ان میں مت رھا ہے گھمسان
ری شیرن کے حملن[6] سے تھر تھر کانپ رھا میدان
رث اور ضحاک بہادر پھیلیں جدھر کو لے تلوار
، بچھاویں پرے اُدھر کے گریں اسوارن پر سوار
ھجی آڑ رھیں ھاڑماس[7] کی اور چل رھی رکتکی پھوار

دشمن کے لشکر پر جا پڑے ۔
جیسے چڑیوں میں باز ۔
یدان جنگ میں زلزلہ آ گیا ۔
عربی رومیوں میں گھس گئے ۔
نگاریں جلیں ۔
حملوں ۔
بوٹیاں اور ھڈیاں اڑ رھی تھیں ۔

برچھے بیعے کھٹ کھٹ باجیں کھچ کھچ بول رہی تلوار
گھوڑے بوڑا[1] رہے لوھو میں لوھو بوڑ رہی اسوار
دھرتی بوڑ رہی لوھو میں لوھو بوڑ رہی تلوار
لاشیں بچھ گئیں لاش پر اور موڑن کا ہے کھریان
تڑی[2] پڑی سب کاور دل ہے رکد نکد سگرا میدان
چوٹیں چھوٹ رہیں[3] عاربکی روس چھوٹ رہے اوسان
لال عمر کے میر عبد اللہ تنکا حال کہانا جائے
گریں تڑپ کے جس گول کے اوپر سادو محلی گرے اگھائے
برچھا تان پڑیں جوہی دس[4] دئیں لاش پر لاش گرائے
اور کھچیں تلوار جدھر کو دئیں رکت کی بھر بہائے
مارت چلے گئے لشکر کو اور اسر پر پہوچے جائے
لمبے ڈیل کا اور قد آور پرا گول میں آبھیں دکھائے
چھائی اداسی رہی سو مکھ پر اور سب بدن رہا کملائے
پڑ رہی ہردے[5] میں گھبراہٹ اور اوسان ٹھکانے نائے
دوڑ کبھو جاس کو آوے دوڑ کبھو وادس کو جائے
جیسے اونٹ پھرے گھبرانا ٹھہرے ایک جگہ پر نائے
آنی لو کے کبھو اگلی صف میں لو کے کبھو پچھلی میں جائے
جیسے چوھا ڈھوندڑے[6] بل کو اور بل کا ھو ٹھار نپائے

---

(۱) ڈوب گئے -
(۲) منتشر -
(۳) عاریوں کے وار -
(۴) طرف -
(۵) دل -
(۶) ڈھونڈے ، ٹھار نشان -

کبھو آگے اور کبھو پاچھے کو دھیے بائیں کبھو ہوئیجائے
چکر کھات پھرے[1] لسکر میں گھمچکر سا پڑے دکھائے
پرکھ گئے حضرت عبداللہ ہے جہ رومن کا سردار
بیٹھ گیا اور اسکے حی میں چھایا خوف لڑائی کیار[2]
پہوچے ترتی سمو[3] ہے وا کے اپنے گھوڑیکو تڑپائے
لے ہشیار سمھر[4] او کافر کال ترا اب پہوچا آئے
گھوڑا چونکا تب کافر کا چونک کے سہرہ سے ہٹ جائے
سوچے کھڑا دب لال عمر کا منمیں سوچ سوچ رہ جائے
حملہ کروں حو میں اب آسپر تو دھج جیسے نہ آئیے ہاتھ
ایسے[5] قابو میں دھوکے سے دھوکا کروں اب اسکے ساتھ
دھوکا دیا تب وا کافر کو دی گھوڑیکی باگ پھرائے
چلے بھاج اسکے سمو ہے سے حو پاچھا کر نیرے آئے
بھاجت دیکھا جب کافر نے منمیں بہت خوشی ہونجائے
گھوڑا ڈارا ترتی پاچھے منمیں حھوٹی آس آئے
مار کے داؤ پہ جب اسے پہوچا عرصہ رہا قدم دوئے چار
گھوم پڑا تب لال عمر کا مستا[6] ہاتھی کے انہار
کرکے جھپٹ[7] سنگھا کی بابی تڑپ کے بجلی کے انہار

---

(۱) کھاتا پھرے -
(۲) کا -
(۳) سامنے -
(۴) سنبھل تیرا وقت آ گیا -
(۵) آئے -
(٦) مست ہاتھی کی طرح -
(۷) شیر کی طرح بجلی کی مانند -

کڑا کڑا کا واکے اوپر ماری کھینچ ترت تلوار
پڑی کھڑاک سے وا کافر پر پاہوں پڑے پتھر پر آن
بول وھوا اٹھے فرشتے شاباش بول اٹھا اسمان
نکسں[1] پران گئے کافر کے اور گر بھونہہ میں ملکا آئے
جیسے آنسوا گرے آنکھ سے اور مل دھرتی میں رھجائے
جھکے تب امیر لال عمر کے جسے سکھا مار شکار
کھول لئیے ھتھیار بدن سے اور دابا[2] سب لیا اتار
مارا جان جو افسر دیکھا لسکر گیا سما کا کھائے
اور دابا عربی جوانن نے حملہ کرکے بڑے اگھائے
ماریں تلواریں اور برچھی دئے لاش پر لاش گرائے
ھلچل پڑ گئی تب رومن میں سکے نہیں پھر قدم جمائے
غازی شیرن کے حملن سے کافر چھوڑ بھجے[3] میدان
پاؤں[4] اوکڑ گئے رنکھتیں سے اور رو منمیں پڑی بھجار
بھری پڑ گئی ھے سب دل میں بھاجیں ڈار ڈار ھتھیار
کھالے کھالے کوئی بھاجے اودھر اودھر کوئی جائے
جائے چلا کوئی سدھا بھاجب سدھ[5] پاچھے کی راکھے نائے
بڑی مرد مسلمانن کی چلی جائے آنیر تلوار
لیجو لجو ھمیں بچیو[6] سو رومن میں پکار

---

(۱) جان نکل گئی -
(۲) مار -
(۳) بھاگے -
(۴) پاؤں اکھڑ گئے -
(۵) پیچھے کا ھوس نہیں -
(٦) بچاؤ -

میں بانکوں کا حسن انداز میں ذکر کیا ھے اور سپاھی پیشگی کو خاص خصوصیت سے ان کے ساتھ منسوب کیا ھے۔ انشا کی تعریف میں اس کا ذکر نہیں غالباً یہ خصوصیت لکھنؤ کے بانکوں کی انفرادیت ھوگی یا بعد میں دھلی اور لکھنؤ کے بانکوں میں آ گئی ھوگی۔[1] شہدہ اس شخص کو کہتے ھیں جو سر و پا کی برھنگی کے سبب دوش و سر پر دوسروں کا بار کھینچے اور اے، او، او بے بھا۔ ایسے تیسے، سالے، اور اس قسم کے ذلیل خطابوں سے ان کو ننگ و عار نہ ھو۔ ھر فرقے کے خادم ھوں اور اپنی مزدوری کے سوا کسی چیز سے سروکار نہ رکھتے ھوں اگر کسی مکان میں لاکھ روپیہ پڑا ھو یا جواھرات کے ڈھیر لگے ھوں ان پر کوئی محافظ نہ ھو تو شہدا (باوجود برھنگی سر و پا کے) کسی چیز کو ھاتھ نہیں لگائے گا۔ ان کا انبوہ دھلی میں زیادہ تر جامع دارالخلافہ کے متصل خصوصاً چاوڑی میں نظر آتا تھا۔ بلکہ کامل شہدہ سمجھا ھی وہ جاتا تھا جو مسجد مذکور کے پاس کا ھو۔ اسے عام طور پر مسجد کا شہدہ کہتے تھے۔ اُردو زبان میں شہدوں کے لیے عجیب نام اور غریب لہجے ھیں۔ کرگچ، جا، بدھوا، روشن چراگ، ماوا، دھموا، جھموا، راحی خال، نہال بیگ، میر آسوری، جوجی کلاں، شیخ راجھے، ابولہالی، دھول محمد، کپور خاں وغیرہ[2] شہدوں اور بانکوں کی زبان اگرچہ دلی کے شرفا کے مقابلے میں فصیح نہیں لیکن رنڈیوں اور کسبیوں میں سے بعض کی زبان کو فصیح ضرور مانا جاتا رھا ھے۔ انشا نے دریائے لطافت میں ایک جگہ لکھا ھے کہ صرف شاہ جہاں آباد میں پیدا ھونا فصیح ھونے کی کوئی شرط نہیں ھے۔ ھندوستان کے پادشاہ اُن کے چند امیر و مصاحب، بیگم و خاص قسم کی

---

(۱) دریائے لطافت۔ ص ۷۲ (۲) دریائے لطافت۔ ص ۹۵

چند عورتوں اور بعض کسبیوں کی زبان ضرور فصیح ہے[1]۔ بعض کسبیوں اور رنڈیوں کی امیروں، رئیسوں، شاہزادوں اور پادشاہوں سے جو میل ملاپ رہتی تھی اس کی بنا پر ان میں بھی تہذیب و شائستگی اور زبان و محاورہ کی فصاحت آ گئی تھی۔ اگر وہ حسن ظاہری کے ساتھ تہذیب کی شائستگی اور زبان کی لطافت سے اپنے آپ کو مزین نہ کرتیں تو اونچی محفلوں میں ان کا گذر ناممکن تھا اور امرا و رؤسا کو اپنانا مشکل۔ انشا نے دریائے لطافت میں ان کسبی مردوں اور عورتوں کے جن کو انہوں نے ''زنان و مردان کسبی اردو'' کہا ہے یہ نام لیے ہیں۔ آودا رن کسبی، تنو، بسنا اور تاج علی سار ندہ، حمیا، جسی، حاجی، چاندنی، دامڑی اور دا در علی سارنگی نواز، راحت، زاہد علی پسر راحت، سندری، سکرو، صاحب بخش، حافظ علی، طاہر علی ساز ندہ، ظہورن، عرب، عرسی، فرحندہ، قطبو، کریمن، گنا، لاڈو، مہتاب، نورن، وزیرن، ہنگو اور پارو، کسبیوں میں امیروں، شہزادوں اور پادشاہوں کی بھی ان سے ملاقاتیں رہتی تھیں۔ نور بائی محمد شاہ کی خاص ڈاتی تھی۔ نواب روشن الدولہ سے بھی تعلق رکھتی تھی۔ شاہ عالم ثانی کے متعلق پتہ چلتا ہے کہ ان کا دربار ہولی کے موقع پر اندر کا اکھاڑا ہوتا تھا۔ انشا نے اس موقع کی تصویر کھینچتے ہوئے دریائے لطافت میں ایک بڑا خوبصورت فقرہ لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہولی کے موقع پر دیکھنا چاہئیے کہ[2]

''راجہ اندر در پریاں خوشتر می نماید یا ولی نعمت در مجمع حور نژاداں''

ہندوستان کی خرابی کے سلسلے میں بعض مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے

---

(۱) دریائے لطافت، ص ۶۲۔ (۲) دریائے لطافت، ص ۶۳۔

جو باتیں لکھی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہاں کے امراء اور شرفاء نے اپنی دولت اسی طرح کسبیوں کے گھر ڈال دی ۔ دہلی کے امیروں کو یہ خاص طور پر عیب لگایا جاتا رہا ہے ۔ جس سے ان کی کسبیوں سے مسل ملاقات کا پتہ ملتا ہے ۔ چنانچہ انشا ایک جگہ لکھتے ہیں کہ[1]

"امیران دہلی را عیب کنند و بگویند کہ امرائے ہندوستان در نیم سیر پلاؤ بست روپیہ صرف می نمایند و تنہا در خلوت با بیگم یا خانم یا لولی زہر مار می کنند و یک دو لقمہ کہ از دولت ایشان بیرون آید حق سارنگی نوازے یا قرم ساوے می شود برائے ہمیں ہندوستان خراب شد ۔
ایسے کھلاؤنے سے تو گو کھلاؤنا بہتر"

محمد اسحاق خان موتمن الدولہ اور اس کے تینوں بیٹے نجم الدولہ، افتخار الدولہ نواب مرزا علی خان اور نواب سالار جنگ دہلی کے فصحا میں شمار ہوتے تھے ۔ ان کی صحبت میں دہلی کے لطیفہ گو خوش کلام اور پری پیکر ہمیشہ رہتے تھے ۔[2] ظاہر ہے کہ یہ اہل نشاط ان کی فصاحت سے استفادہ کرتے ہوں گے اور پھر اس فصاحت کے دریا سے دوسری مجلسوں کو سیراب کرتے ہوں گے ۔

امراء کے علاوہ شاعروں سے بھی اس زمانے کے اہل نشاط کا مسل جول کافی بڑھا ہوا نظر آتا ہے ۔ خواجہ میر درد نقشبندیہ خاندان کے ایک مشہور بزرگ اور بارھویں صدی ہجری کے اولیائے عظام میں سے تھے ۔ ہر مہینے کی دوسری تاریخ کو وہ اپنے والد خواجہ

---

(۱) دریائے لطافت، ص ۶۵-۶۶ ۔
(۲) دریائے لطافت، ص ۷۲-۷۳ ۔

ناصر عندلیب کے مزار پر محفل غنا ترتیب دیتے تھے۔ اس روز شہر کا ہر چھوٹا بڑا آدمی وہاں پہنچتا تھا۔ اور مغنیان چابکدست اور بین نوازان نے کاسہ مست وہاں قانون نوازی اور نغمہ پرداری کی داد دیتے آتے تھے اور سہ پہر تک مجلس جاتے تھے[1]۔ یہاں تک بھی کہا گیا ہے کہ جب عروس البلاد کے راگیوں میں کبھی اس بات کا جھگڑا پیدا ہوتا کہ کوئی راگ آڈو یا کھاڈو ہے تو وہ حضرت خواجہ میر درد کے پاس فیصلے کے لیے آتے تھے اور بڑے بڑے مغنی ان کے آگے سر جھکاتے تھے[2] مرزا رفیع سودا کے متعلق بھی اس قسم کی بات کہی گئی ہے سید انشا لکھتے ہیں کہ[3]

چوں کمالے یوناں در علم موسیقی نیز کہ اصلے است
از اصول اربعہ علم ریاضی مشق رانکمال رسانیدہ بودند

خواجہ حسن محسنی کی محسنی رنڈی سے ملاقات کا حال کہیں الگ لکھا گیا ہے۔ مکرم الدولہ بہادر بیگ خان عالمے خلف نیاز بیگ خان جو ذوالفقار الدولہ کے زمانے کے اکابر روسا میں سے تھے۔ باپ کے مرنے بعد اس حد تک اسراف کرنے لگے کہ جن ایام میں غلام قادر روھیلے نے شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکالی تھیں ان سے کچھ عرصہ قبل وہ اپنے گھر میں مشاعرہ کراتے تھے۔ سارے شاعروں کو کھانا کھلاتے تھے اور مشاعرے کی محفل کے بعد رنڈیوں کا ناچ کراتے تھے۔ شاہ وارث الدین نالاں جو زمرد رقم مشہور تھے مہینے میں ایک بار شیریں شمائل ماہ رویوں اور فتنہ خصائل پری پیکروں کا رقص کراتے تھے۔ جس میں شہر کے سارے ہوسناک جمع ہوتے تھے۔ اردو کے شاعر

---

(۱) تذکرہ ھندی گویاں۔ ص ۹۲
(۲) میخانہ درد از سید ناصر نذیر فراق۔
(۳) دریائے لطافت۔ ص ۳۷

تھے اور درویشانہ ریختہ کہتے تھے - اور دو خطوں کی اصلاح کی مشق میں سب مشغول رہتے تھے - نواب درگاہ قلی خان نے مرقع دھلی میں اس زمانے کی دھلی کی حسین اور رومان پرور فضا اور اس میں ارباب نشاط کے مشاغل کا کافی خوبصورتی سے تفصیلی ذکر کیا ھے - شہر کے چوک، اور گلیاں گویا خلد کی تصویریں تھیں - میر نے سچ کہا ھے

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

اس حسین ماحول اور اس میں رسنے بسنے والے حسینوں نے اردو شاعری کے مضامین و اسالیب پر گہرے اثرات ڈالے ھیں - اور ریختہ کے پھیلاؤ میں گراں قدر خدمت سر انجام دی ھے - آزاد نے قلندر بخش جرأت کے ذکر میں جو یہ کہا ھے[1] "مناسب طبع دیکھ کر غزل کو اختیار کیا اور امرا اور ارباب نشاط کی صحبت نے اسے اور بھی چمکایا تو غلط نہیں کہا - جرأت میاں جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے خود موسیقی کا شوق رکھتے تھے اور اھل نشاط سے بڑی محبت رکھتے تھے - ستار بجانے میں بھی کامل تھے - ۱۲۱۵ میں لکھنؤ پہنچے تھے - اس سے پہلے دھلی میں تھے اور لکھنؤ آ کر بھی دھلوی شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے متوسل ھوئے تھے - جوانی میں اندھے ھوگئے تھے - مصحفی[2] اور قاسم[3] نے ان کی بینائی زائل ھونے کا ذکر تو کیا ھے لیکن سبب نہیں بتایالیکن آزاد نے عبرت احوال کے حوالے سے لکھا ھے کہ "پہلے وہ اصلی اندھے نہ تھے بعض ضرورتوں سے کہ شوخی عمر کا مقتضا ھے خود

---

(۱) آب حیات ص ۲۴۰
(۲) تذکرہ ھندی گویاں ص ۶۳
(۳) مجموعہ نغز جلد دوم ص ۱۰۰

اندھے ہوے رفتہ رفتہ اندھے ہی ہوگئے اور پھر لکھا ہے کہ ''ایک بیگم صاحبہ نے گھر میں ان کے چٹکلے اور نقلیں سنیں بہت خوش ہوئیں اور نواب صاحب سے کہا کہ ہم بھی باتیں سنیں گے گھر میں لا کر کھانا کھلاؤ پردے یا چلمیں چھٹ گئیں اندر وہ بیٹھی باہر یہ بیٹھے چند روز کے بعد خاص خاص بیبیوں کا برائے نام پردہ رہا - باقی گھر والے سامنے پھرنے لگے رفتہ رفتہ یگانگی کی یہ نوبت ہوئی کہ آپ بھی باتیں کرنے لگیں گھر میں کوئی دادا بابا ' کوئی ماموں چچا کہتا شیخ صاحب کی آنکھیں دکھنے آئیں چند روز ضعف بصر کا بہانہ کرکے ظاہر کیا کہ آنکھیں معذور ہوگئیں مطلب یہ تھا کہ اہل حسن کے دیدار سے آنکھیں سکھ پائیں چنانچہ بے تکلف گھروں میں جانے لگے اب پردہ کی ضرورت - یہ بھی قاعدہ ہے کہ میاں بیوی حسن سہاں کی بہت خاطر کرتے ہیں نوکر اس سے جلنے لگتے ہیں ایک دن دوپہر کو سو کر اٹھے شیخ صاحب نے لونڈی سے کہا کہ بڑے آفتابے میں پانی بھر لا لونڈی نہ بولی انہوں نے پھر پکارا اس نے کہا بیوی حاضرور میں لے گئی ہیں ان کے منہ سے نکل گیا کہ عیانی دیوانی ہوئی ہے سامنے تو رکھا ہے دیتی کیوں نہیں بیوی دوسرے دالان میں تھیں لونڈی گئی اور کہا کہ ووئی بیوی یہ موا کہتا ہے کہ وہ بندہ اندھا ہے یہ تو خاصہ سجکھا ہے ابھی میرے ساتھ یہ واردات گزری اس وقت یہ راز کھلا مگر اس میں شبہ نہیں کہ آخر آنکھوں کو رو بیٹھے''

اس واقعہ کے لکھنے سے غرض اس کی صحت و عدم صحت ' یا حسن و قبح کی بحث نہیں بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ جرأت پر عورتوں کی صحبت نے زبان کی صحت اور صفائی کے لحاظ سے ضرور اثر ڈالا ہے - ان کی عربی سے ناواقفیت اور علوم تحصیل میں ناتمامی کا ذکر تو

تذکرہ آب حیات میں ملتا ھی ھے[1] اور میر تقی میر کا یہ فقرہ بھی ان کے متعلق مشہور ھے ''کہ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ھو اپی چوما چوٹی کہہ لیا کرو''[2] اس کے باوجود زبان کی تراش اور روزمرہ کی صفائی جو ان کی شاعری میں ملتی ھے اس پر عورت کا اثر صاف ھے۔ کیونکہ دھلی کی عورتیں مردوں کے سوا ھندوستان کی جملہ عورتوں سے افصح شمار ھوتی تھیں۔ ان کی ایک اپنی مخصوص زبان اور طرز بیان تھا جو لفظ ان میں رائج ھو جاتا تھا اردو بن جاتا تھا خواہ وہ عربی، فارسی، سریانی، ترکی، پنجابی، پوربی، مارواڑی یا دکنی میں کیوں نہ ھو سعادت یار خاں رنگیں طہماسپ خاں کے بیٹے جو آشنا پرستی کے شیوہ میں کمال اور زیادہ تر پردہ نشیں عورتوں سے سروکار رکھتے تھے، عورتوں کی مصطلحات کے بارے میں ایک کتاب لکھی ھے۔ اور ان کی گفتگو میں ایک دیوان بھی کہا ھے جو دیوان ریختی کے نام سے موسوم ھے سید انشا اللہ خاں انشا نے بھی دریائے لطافت میں دردانہ پنجم کے تحت ایک پورے باب میں شاھجہان آباد کی خوش اختلاط اور رنگین کلام پردہ نشین عورتوں اور ان کی پیش خدمتوں کی گفتگو اور مصطلحات کی تفصیل دی ھے[3]۔ اور اپنے کلام کو بھی ان سے زینت بخش ھے۔ عورت کی زبان اور اس کے بیان کا اثر جس رنگ میں رنگیں، انشا اور جان صاحب پر تھا جرأت پر اگرچہ اس طرز میں نہیں لیکن پھر بھی ان کے کلام کے نکھار میں ماہ رویوں کا عکس ضرور موجود ھے۔ نواب مصطفے خاں شیفتہ اس سبب سے غالباً کہتے ھیں[4]

---

(۱) آب حیات - ص ۲۳۹
(۲) آب حیات - ص ۲۳۹
(۳) تفصیل از دریائے لطافت ص ۹۸
(۴) گلشن بیخار از نواب مصطفے خان شیفتہ - ص ۴۷

''پدیرائی خاطر و گوارائی طبع بو باش و الواط حرف می زدہ'' قادر بخش صابر کی رائے بھی دیکھئے فرماتے ہیں کہ[1]

''مضامین بوس و کنار کے ہمیشہ اس کے منہ چڑھے ہوئے اور مدام اس کی فکر سے ہم کنار تھے''

رنگین، انشا اور جرأت کی زبان و بیان میں یہ رنگ دہلوی ماحول کا ہو یا لکھنوی، فضا کی بات اصل میں ایک ہی ہے۔ فضلائے و شرفائے دہلی کے لکھنؤ ہجرت کرنے کے بعد ایک عرصہ تک لکھنؤ صرف نام کا لکھنؤ رہا ہے۔ اصل میں یہ ایک دوسرا شاہ جہاں آباد بن گیا تھا۔ اس کی اپنی منفرد حیثیت بالکل واضح نہ تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ لکھنؤ میں اپنا کچھ تھا نہیں۔ اس شہر کی اپنی تہذیبی روایات بھی تھیں لیکن ان روایات میں بھی جان اسی وقت پڑی ہے جب اہل دہلی وہاں پہنچے ہیں اس زمانے میں تہذیب، اور زبان کا جو نمایاں ڈھانچہ ہمیں لکھنؤ میں ابھرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اس کی اصل بنیادیں وہ تھیں جنہیں اہل دہلی عروس البلاد دہلی سے اکھاڑ کر اپنے ساتھ لائے تھے اس بیان کی صداقت کے لیے میں یہاں انشا اللہ خان کی دریائے لطافت سے ایک طویل اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں وہ لکھنؤ کی تہذیبی، تمدنی، ثقافتی، ادبی، اور لسانی فضا کا ذکر کرتے ہوئے ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ[2]

'' فضل زبان و پوشاک و حرکات محبوبان لکھنؤ بر کلام و لباس و اداہائے معشوقان دہلی واضح و مبرہن است۔ زیرا کہ اہل لکھنؤ حوس و پوشش و زبان و دیگر چیزہا از پدر و مادر

---

(۱) گلستان سخن از قادر بخش صابر۔ ص ۹۴۴

(۲) دریائے لطافت۔ ص ۶۷

خود یاد گرفته اند پس درین چیزها مثل آنها باشند و هرچه خود از قسل دراکت صدا و حسن تکلم و حرکات دلنشیں و قطع پوشاک ایجاد نموده اند زیاده از معلومات بزرگان[1] ایشان است - مختصر این اینها فصیح و بلیغ و لطیف تر از اهل شاه جهان آباد دانند لیکن سه قوی دلیل در فصل دهلی موجود است - یکے آنکه صاحبان لکهنؤ گویند که سلیقه ما زیاده از شاه جهان آبادیان است این به گویند که سلیقه ما زیاده از باشندگان بنگاله است و فصیح تر از اهل کلکته ایم - پس حسبے در شاه جهان آباد است که فصحا شهر دیگر ترجیع کلام و وضع خود در زبان و وضع آن شهر می جویند - دیگر اینکه ساکنان لکهنؤ را که اسلاف شان نیز درینجا گذشته اند صاحب سلیقه هائے لکهنؤ پوربی نامند از اینجا دریافت توان کرد که باوصف تولد در لکهنؤ خود را دهلوی پندارند و سکنه قدیم را پوربی - دیگر اینکه اگر کسے پرسد که شما بذات خود در لکهنؤ بوجود آمده اید یا وطن شما همین است چشم آلوده درو نگاه کنند و گویند که خدا نه کند که ما متوطن اینجا باشیم شما کدام چیز ما را از اینجا دریافتند که وطن ما را می پرسید آیا لباس ما را لباس اهل پورب می دانید یا طرز تکلم خلاف شاه جهان آباد دیده اید اگر کدام لفظ خارج از آردو شنیده باشند بے تکلف بگوئید که بار دیگر بر زبان نیاریم - درین صورت اگر طرف ثانی بگوید که فلاں لفظ شما از محاوره آردو بیرون است گویند که این لفظ را فلاں میر صاحب که خانه ایشان در شاه جهان آباد نزدیک درخت بڑ شاه بولا بود اکثر بر زبان داشتند نه این که فلاں مغل که در تیره یا منصور نگر می بود

استعمال می کرد ۔ ازیں حالات به یقین پیوسته که در هر شهر فصحائے آنجا تائید کلام خود از فصحائے دهلی جویند و درجمع لکھنؤ بر دهلی در زبان و سلیقه هاں ترجیح است که محله تراهه بیرم خان را در کثره نیل که هر دو در شاه جهان آباد است می توان گفت که در شاه جهان آباد زبان دانندگان بنگله سید میرور به از ساکنان کوچه گهاس رام است یا فلاں فصیح دهلی که مثل خودے نداشت حالا در لکھنؤ می باشد و خانه او فصاحت خانه ایست که در تمام شاه جهان آباد چنیں خانه نیست ۔ خانه فصاحت خانه از آدم فصیح می شود نه ایں که خانه را بذات خود ربطے با فصاحت است ۔‘‘

اس اقتباس کے اعتبار سے لکھنؤ کی فضائے رومانی میں شاہ رویان شاہ جہاں آباد کے عکس جمال کا نظر آنا کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ موتی نام کی ایک طوائف دهلی کی رهنے والی تھی ۔ ارباب نشاط میں اپنے فن کے اعتبار سے صاحب مذاق اور ذی اعتبار شمار هوتی تھی ۔ مرزا ابراهیم بیگ مقتول اردو کے ایک شاعر اور دهلی کے مرزایوں میں سے تھے ۔ مصحفی کے شاگرد اور دوست تھے ۔ موتی ان کی دوستی کا همیشه دم بھرتی رهی ۔ آخر گردش روزگار نے اسے بھی اور لوگوں کے ساتھ لکھنؤ پہنچا دیا ۔ مصحفی لکھتے هیں کہ میں بھی کبھی کبھی اس کی ملاقات کو جاتا تھا ۔ بہت خوبی سے پیش آتی تھی ۔[1]

یہ کسی طوائف کے دهلی سے لکھنؤ پہنچنے اور وهاں کی رومانی اور شعری فضا کو متاثر کرنے کی ایک مثال هے ۔ اس کے علاوہ اور ارباب نشاط کا انتقال لکھنؤ بھی ثابت هے ۔ ان سب نے مل کر دهلوی رومان کی رو کو لکھنؤ میں جاری کر دیا ۔ مصحفی کے تذکرہ هندی

---

(۱) تذکرہ هندی گویاں، صفحه ۲۸۱ ۔

گویاں اور سید انشا اللہ خان کی دریائے لطافت سے دھلی کی کسبیوں کی نظم و نثر کے جو چند نمونے ملے ہیں ان کا یہاں درج کیا جانا شاید لطف سے خالی نہ ہوگا اور زنان دھلی خصوصاً زنان کسبی دھلی کے روزمرہ اور محاورہ سے واقفیت پیدا ہوگی -

بیان براتی بیگم رن کسبی دھلی

اری سرمونڈی باندی تو اتنا جھوٹ کیوں بولتی ہے - اللہ کرے تیری بوٹی بوٹی اوپر والیاں لے جائیں - اڑ جائے تو خلافندی میں بے کمب ستیاناس گئی تیرے میاں کی جورو کا گلا کیا کھنے والی کو علی جی کی مار ہووے ڈرے تیرے دیدے سے سٹھے بٹھائے کیا آسغلا اٹھایا ہے بھس میں چنگاری ڈال جالو دور کھڑی -[1]

بیان موتی خانم رن کسبی دھلی

اے صاحب آپ کیوں باندی بدوڑوں کے منہ لگتی ہیں ایسی باتوں سے ہوتا کیا ہے - زباجی ہم تو آگے ہی یہ بات جانتے تھے کہ اس زمانے میں غریب پر رحم کرنا اچھا نہیں پر کیا کریں اندر والا کم بخت نہیں مانتا کیا چاہیے ایسے کرتوتوں سے کیا حتی ہوتا ہے اس چڈو کا کیا دوس ہے کردہ خویش آید پیش -[1]

بیان بی نورن کسبی دھلی :

اجی آؤ میر صاحب تم تو عید کے چاند ہوگئے دلی میں آتے تھے دو دوپہر رات تک بیٹھتے تھے اور ریختے پڑھتے تھے لکھنؤ میں تمھیں کیا ہو گیا کہ کبھیں تمھارا اثر آثار معلوم نہ ہوا ایسا نہ کیجو کبھیں آنکھوں میں بھی نہ چلو تمھیں علی کی قسم آنکھوں میں

---

(۱) دریائے لطافت ' صفحہ ۴۸ -
(۱) دریائے لطافت ' ص ۴۹ -

مقرر چلیو[1] -

غزل موتی طوائف دھلی

کلالی رو درو ہے اور ہم ہیں   شب اب حام و سبو ہے اور ہم ہیں

سدا گر ہو ے چاک حیب ناصح   تو پھر تار رفو ہے اور ہم ہیں

بلا سے گو نہ ہووے دل کو واشد   ھجوم یاس تو ہے اور ہم ہیں

شب مہتاب میں تا صبح ساقی   خیال ماہ رو ہے اور ہم ہیں

بہ دیا حی میں لہر آئی کہ موتی   کنار آب حو ہے اور ہم ہیں

ان مختلف نوع کے شاعرانہ مشاغل ' اور ھنگاموں کے علاوہ جن کی تفصیل اب تک دی جا چکی ہے ' مراختوں کا باقاعدہ رواج بھی ہو چکا تھا - مراختہ کی اختراع مشاعرہ کے وزن پر ہوئی ہے جس زمانے میں اردو شاعری کو ریختہ کا نام دیا جاتا تھا مشاعرہ کو مراختہ کہتے تھے - چنانچہ قیام الدین قائم نے شیخ فرحت اللہ فرحت کا ذکر کرتے ہوئے تذکرہ مخزن نکات میں لکھا ہے کہ[2] "گاہ گاہ در مجلس مراختہ کہ اختراع این در وزن مشاعرہ است بہ نظر می آید" - میر نے نکات الشعرا میں مجالس ریختہ بھی کہا ہے[3] - اور یک رو تخلص کے ایک شاعر کے حال میں بیان کیا ہے کہ "مردے بود شاگرد میاں ابرو در احوالش اطلاع نہ دارم دوسہ مرتبہ در مجلس ریختہ دیدہ ام"-

مراختوں یا مجالس ریختہ سے پہلے دھلی میں فارسی مشاعروں کا رواج تھا - اور ریختہ کی ترویج کے ابتدائی دور میں بھی ان کا وجود ملتا ہے' مولف تذکرہ حسینی[4] نے نواب ظفر خان احسن امیر عہد شاھجہان کے

---

(۱) دریائے لطافت ' ص ۴۹ -
(۲) مخزن نکات ' ص ۶۳ -
(۳) نکات الشعرا ' ص ۷۹ -
(۴) تذکرہ حسینی مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی ص ۱۶۹ الف -

مشاعروں کا ذکر کیا ہے جن میں مرزا صائب ، ابو طالب کلیم ، اور محمد ابراہیم فارغ جیسے شاعر شریک ہوتے تھے بندرا بن خوشگو نے سفینہ خوشگو میں ملا شیدا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ[1]

''رفته رفته درمباحثات و مشاعرات از امثال نوع امتیاز اندوخت''

مرزا محمد افضل سر خوش نے کلمات الشعرا میں قطب الدین مائل اور دانشمند خان کے فارسی مشاعروں کا ذکر کیا ہے[2]۔ خان آرزو کے تذکرہ مجمع النفائس ، حاکم لاہوری کے تذکرہ مردم دیدہ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کے تذکرہ گل رعنا ، غلام ہمدانی مصحفی کے تذکرہ ریاض الفصحا اور تذکرہ عقد ثریا وغیرہ سے بھی فارسی کے مشاعروں کا کچھ نہ کچھ حال معلوم ہو جاتا ہے عرس مرزا عبدالقادر بیدل ، میر افضل ثابت ، اور مرزا عبدالخالق وارستہ کے مشاعرے تو محمد شاہی عہد تک اپنی آب و تاب رکھتے تھے ۔

مرزا عبدالقادر بیدل کے عرس کے موقع پر منعقد ہونے والے مشاعرے میں شہر دہلی کے سب نازک خیال جمع ہوتے تھے ۔ اور مشاعرے کرتے تھے ۔ اس کی طرز عوامی سی ہوگی ۔ کیونکہ موقع کی مناسبت سے اس میں پھیلاو ایک قدرتی امر ہے ۔ لیکن عام طور پر فارسی مشاعروں کا عوامی رواج نہ ہونے کے برابر رہا ہے کیونکہ فارسی کبھی بھی عوام کی زبان نہیں تھی ۔ مشاعرے مختلف گھروں میں منعقد ہوتے تھے اور شریک مشاعرہ بھی زیادہ تر خواص میں سے ہوتے تھے ۔ جب مراختوں کا رواج ہوا تو اس کی نوعیت بھی پہلے پہل گھریلو مشاعروں کی سی رہی ہے ۔ لکھنو میں جا کر اس میں زیادہ وسعت پیدا ہوئی ہے ۔

---

(۱) سفینہ خوش گو مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی ، ۱۷۷ ب ۔
(۲) کلمات الشعرا ، ص ۱۰۲ ۔

دھلی میں اس کا دائرہ عمل زیادہ وسیع نہیں ہو سکا ہے ۔ غالب کے چند خطوط سے تو پتہ چلتا ہے کہ بہت بعد تک اس میں عمومیت پیدا نہیں ہو سکی تھی ۔ ایک خط میں قاضی عبدالجمیل کو لکھتے ہیں[1]

" مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا ۔ قلعہ میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں"۔

سید کرامت علی بہاری کو بھی انہوں نے ایک خط میں یہی لکھا ہے[1]۔

" جان عالم مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا قلعہ میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل کر لیتے ہیں ۔ میں بھی کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا "۔

یہ مکتوب غدر سے پہلے کے ہیں ، اس کا مطلب یہ ہوا کہ افراتفری کے زمانے سے پہلے بھی دھلی میں مشاعروں کے عوامی طرز کی کمی تھی ۔ رواج ریختہ کی ابتدائی منزلوں میں بھی یہی حال تھا ۔ تذکروں سے جن مشاعروں کا پتہ ملتا ہے وہ زیادہ تر گھریلو ماحول ، نجی محافل اور خانہ بند مجالس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک مرزا عبدالقادر بیدل کے سالانہ عرس کے موقع پر ہونے والے مشاعرہ میں کشادہ فضا ضرور ہے ۔ جو ابتدا میں فارسی اور بعد میں ریختہ کے لیے بھی پلیٹ فارم مہیا کرتا رہا ہے ۔

سید عبدالولی عزلت سورتی جب دھلی آئے تھے تو مرزا عبدالقادر بیدل کے سالانہ عرس کے موقع پر مشاعرے میں بھی شریک ہوئے تھے ۔ آزاد بلگرامی نے سرو آزاد میں ان کے دھلی آنے کی تاریخ ۲۰ جمادی الاول

---

(۱) مکاتیب غالب ، ص ۱۷۳ ۔

(۱) مکتوب ۷ اکتوبر ۱۸۵۳ ۔

۱۱۶۴ھ بتائی ہے[1] عرس کی تاریخ ۳ صفر ۱۱۶۵ھ تھی۔ عزلت اتنی دیر دھلی میں رہے تا آنکہ شریک عرس ہوئے۔ اس کا یہ مطلب ھوا کہ مرزا بیدل کی وفات کے بعد کم از کم ۳۲ سال تک تو یہ مشاعرہ ضرور چلتا رہا۔ اور یہ وہ زمانہ ھے جب ریختہ کا چرچا دلی کے گلی کوچوں میں ھو چکا تھا۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ ریختہ گو شاعر اس میں شریک نہ ہوتے ہوں۔ مرزا رفیع سودا کی ابتدائی غزلوں میں بیدل کے عرس کی طرف اشارے موجود ہیں۔ اور ھجو مولوی ندرت کاشمیری سے بھی صاف ظاھر ھے کہ سودا اور دوسرے ریختہ گو شاعر اس مشاعرے میں شریک ھونے لگ گئے تھے۔ خود بیدل کے متعلق میر نے نکات الشعرا میں لکھا ھے کہ[2]

"دو شعر ریختہ بنام اوشنیدہ می شود۔ شاید بتقریبے گفتہ باشد"

شعر یہ ہیں :

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ھے ھم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ھے ھم میں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
اندر سے یار بولا بیدل کہاں ھے ھم میں

عرس مرزا بیدل کے مشاعرے کے بعد سراج الدین علی خان آرزو کے مشاعرے کا پتہ چلتا ھے۔ معلوم ھوتا ھے کہ اس زمانے میں سب سے زیادہ اھم اور مشہور محفل مراختہ خان آرزو ھی کی تھی۔ جس طرح بندرا بن داس خوش گو نے عرس مرزا بیدل کے مشاعرے کے متعلق لکھا ھے[3] کہ شہر کے جملہ نازک خیال وھاں جمع ھوتے ہیں اس طرح

---

(۱) سرو آزاد، ص ۲۳۶۔
(۲) نکات الشعرا، ص ۲
(۳) سفینہ خوش گو۔

تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ریختہ آموز شاعر خان آرزو کے سایہ تربیت میں جمع ہوتے تھے - ان میں میر سودا ، درد جیسے باکمال فن کار بھی تھے اور دوسرے معروف و غیر معروف شاعر بھی[1] -

اس کے بعد ایک مشاعرہ خواجہ میر درد کے مکان پر شروع ہوا جو ہر مہینے کی پندرھویں تاریخ کو ہوتا تھا - خیال ہے کہ خان آرزو کے ہاں مشاعرہ بند ہونے پر یہ میر درد کے ہاں شروع ہوا ہے ان کے ہاں بھی یہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا - وہاں سے میر تقی میر کے ہاں منتقل ہو گیا - اس کی شہادت خود میر نے نکات الشعرا میں دی ہے لکھتے ہیں کہ[2]

"مجلس ریختہ کہ بخانہ بندہ بتاریخ پانز دھم ہر ماہ مقرر است واللہ بذات ہمیں بزرگ (یعنی خواجہ میر درد) است - زیرا کہ پیش ازیں ایں مجلس بخانہ اش مقرر بود از گردش روز گار بے مدار برھم خورد ار سکہ بایں احقر اخلاص دلی داشت گفت کہ مجمع را شما اگر بخانہ خود معین بکنید بہتر است نظر بر اخلاص آں مشفق عمل کردہ آمد خدنش ابدالاباد سلامت دارد"

اس اقتباس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خواجہ میر درد کے ہاں سے مجلس ریختہ کا میر تقی میر کے ہاں انتقال "گردش روز گار بے مدار" کے سبب تھا اور خود خواجہ میر درد کی خواہش پر عمل کرتے ہوئے میر تقی میر نے اس مجلس کو اپنے ہاں مقرر کیا تھا - معلوم ہوتا ہے کہ نجی حالات اور ماحول کی ناسازگاری کی بنا پر ایک شاعر زیادہ دیر تک مجلس ریختہ کو اپنے ہاں نہیں چلا سکتا تھا - مصحفی نے بھی ایک جگہ اس امر کی تصدیق کی ہے اور لکھا ہے کہ تجربے میں آیا ہے

(۱) دیکھیے تذکرہ نکات الشعرا ، تذکرہ مخزن نکات ، تذکرہ ریختہ گویاں ، تذکرہ ہندی گویاں وغیرہ - (۲) نکات الشعرا ، ص ۱۰ -